Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ناهید

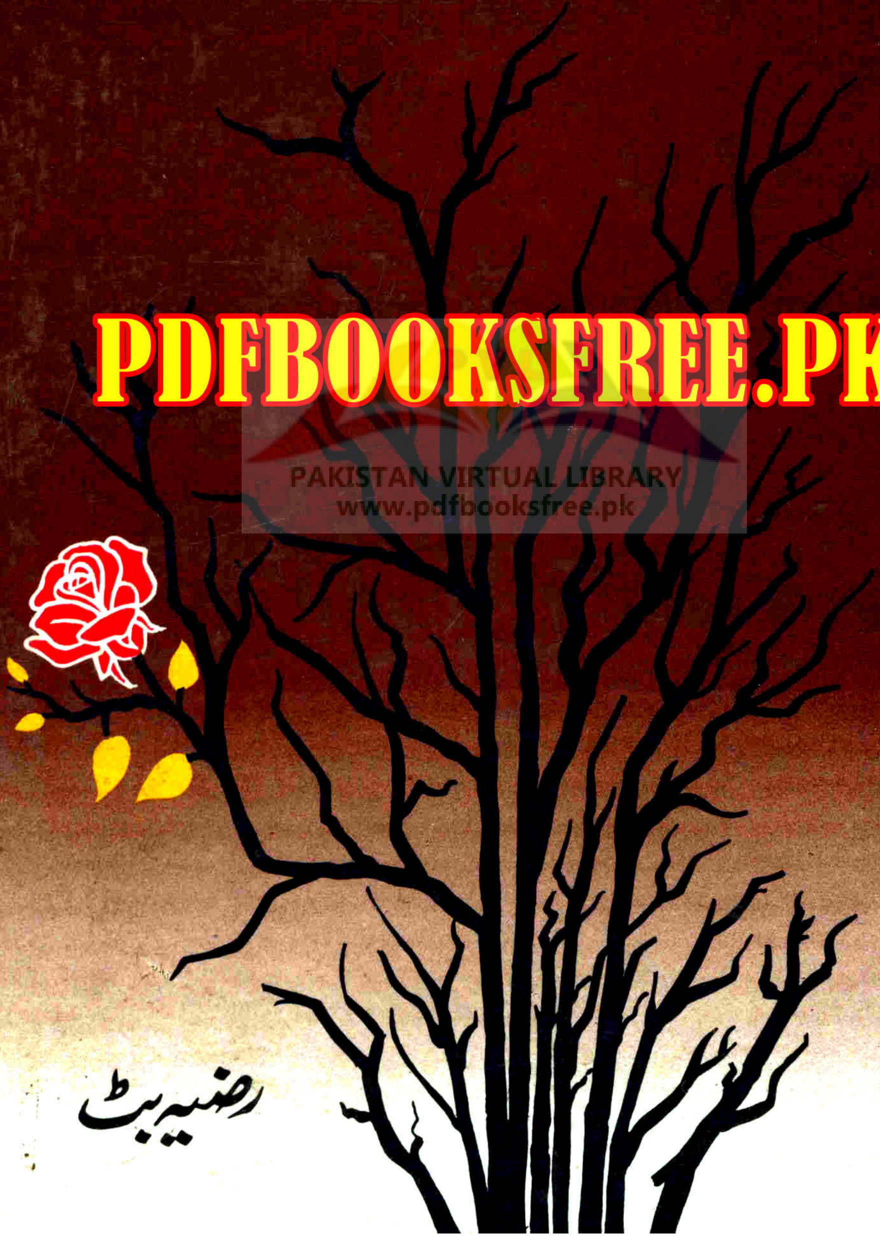

PDFBOOKSFREE.PK
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رضیہ بٹ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۱

وہ کھڑکی میں کھڑی گہری متفکر نظروں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ اس کا دماغ بوجھل تھا۔ اور اترے ہوئے اداس چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ جلتی ہوئی آنکھوں کو بند کر لیا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ بے ربط سی سوچ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی سے ہٹ کر وہ سنگار میز کے پاس پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گئی۔ آئینے میں اس نے دیکھا اس کا معصوم حسن سوگوار تھا۔ آنکھوں میں ٹھہرا ہوا اضطراب اور چہرے پر تفکرات سے پھیلے ہوئے تاریک سائے دیکھ کر وہ گھبرا گئی صبح سے وہ کئی بار رو چکی تھی۔ آنسو اب بھی اس کی پلکوں پر موتیوں کی طرح لرز رہے تھے۔ اس نے پھر آئینے میں دیکھا حسین آنکھیں آنسوؤں سے یوں جھلملا رہی تھیں جیسے زیر آب دو شمعیں روشن ہوں۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

"تم پھر رو رہی ہو"۔ فیروز نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

ناہید نے پلٹ کر روتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا اور پھر نفرت سے منہ پھیر لیا۔

فیروز بغل سے کپڑوں کا بھاری تھیلا نکالتے ہوئے بڑبڑایا۔

"بڑی ضدی لڑکی ہے۔ ماں سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہی ہے"۔

اس نے تھیلا ناہید کے پلنگ پر پھینک دیا۔ جیب سے سگریٹ نکالا اور لاپرواہی سے سلگاتے ہوئے بولا "میرا نام فیروز ہے"۔ اس نے بجھی ہوئی دیا سلائی کھڑکی سے باہر پھینک دی "ایسی بد دماغ چھوکریوں کو ٹھیک کرنا جانتا ہوں"۔

وہ ایک شیطانی ہنسی ہنسا۔ اس مکروہ مسکراہٹ سے اس کا چہرہ کچھ ڈراؤنا سا ہو گیا۔ وہ پلنگ سے ہٹ کر ناہید کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا

"تم ایک رنڈی کی لڑکی ہو۔ رنڈی کا لفظ تمہاری پیشانی سے کوڑھ کے داغ کی طرح کبھی نہیں مٹ سکتا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تم کبھی وہ نہیں بن سکتی جو تم بننا چاہتی ہو۔ تمہیں میری مرضی پر چلنا ہو گا۔"

"یہ ناممکن ہے" ناہید نے غصے سے کہا۔

"تم اپنی حیثیت بھول رہی ہو۔ تمہاری ماں طوائف تھی۔ شریفانہ زندگی بسر کرنے کا حق تم سے چھن چکا ہے" پچاس سالہ فیروز نے دانائی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"میری ماں جو کچھ بھی تھی میں"۔

"رنڈی کی لڑکی رنڈی ہی ہوتی ہے"۔ فیروز ناہید کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"کبھی نہیں" ناہید نے اپنی لمبی لمبی انگلیوں کی گلابی پوروں سے رخساروں پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔

"ناہید! مت بھولو کہ تم گناہ کی تخلیق ہو۔ تمہارے جسم سے وہ بدبوئیں اٹھ رہی ہیں جنہیں سماج کی لمبی ناک دور ہی سے سونگھ سکتی ہے۔ سماج تمہیں ایک شریف عورت کا درجہ کبھی نہیں دے گا۔

"تم جھوٹے ہو" میرا باپ...... میرا باپ" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

فیروز نے بھدا سا قہقہہ لگایا اس کے سانولے لبوترے چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"باپ" وہ طنز کے ساتھ بولا "باپ کی کہانی تمہاری ماں کے دماغ کی اختراع تھی"۔

اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔

ناہید نے حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس نے بھنوئیں سکیڑ لیں۔ فیروز دوسرے لمحے ہنستا ہوا ناہید کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"ہر ہاتھ تمہارا گلشن حسن تاراج کرنے کے لئے بڑھ سکتا ہے۔ سہارا دینے کے لئے نہیں۔ میری بات مان جاؤ تمہیں کوئی مقام"۔

"میں اپنا مقام خود بناؤں گی" ناہید اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی...... اس کی آنکھیں اک عزم سے چمکنے لگیں۔

"تم ابھی انجان ہو"۔

"اتنی انجان بھی نہیں۔ کہ اپنا اچھا برا نہ سمجھ سکوں"۔

"مجھ سے بگاڑ اچھا نہیں۔ تمہارا مستقبل میرے سہارے ہی چمک سکتا ہے۔ تم شاید نہیں جانتی کہ میری رسائی کہاں تک ہے"۔

"فیروز" وہ غصے سے چیخی۔ اس کی حسین آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔

"انجم اور سلیمہ سے پوچھو"۔ وہ اس کے غصے پر بے نیازی سے مسکرا دیا۔

"مجھ سے ذرا بگڑی تھیں۔ اب کوئی پوچھتا بھی نہیں انہیں کوٹھے ویران پڑے ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

فیروز کا غیر شائستہ طرز گفتگو اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مڑی۔ اور تڑاخ سے ایک تھپڑ فیروز کے منہ پر دے مارا۔

وہ اس غیر متوقع حرکت سے بھنا گیا۔ غصے سے اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ دانت پیس کر اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا "تمہاری یہ مجال"۔

ناہید غصے سے کانپ رہی تھی "نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ تم انسانیت کے پردے میں چھپے ہوئے شیطان ہو"۔

فیروز ایک کامیاب دلال تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہوئے تھے۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر غصہ پی گیا۔ وہ کئی بھولی بھالی دوشیزاؤں کو نسوانیت کی بلندی سے گرا کر معصیت کی پستیوں میں پھینک چکا تھا۔ اس کی جچی تلی باتوں اور فریب کے سنہری جال میں پھنس کر کئی معصوم جوانیاں تباہ ہو چکی تھیں۔ اب وہ ناہید پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ اسے پھنسا رہا تھا۔ بہکا رہا تھا۔

فیروز اپنا گال سہلاتا ہوا ڈھٹائی سے ہنسا "ظالم غصے میں تو تو اور بھی پیاری لگ رہی ہے۔ ایک بار بازار میں آ تو لے پھر دیکھنا تیری اک اک ادا پر لوگ مر مٹیں گے"۔

"اماں" ناہید بے بس ہو کر چلائی۔ دوسرے کمرے سے آیا دوڑتی ہوئی آئی۔

"کیا ہے بیٹی"

"اسے کہہ دو" وہ فیروز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اسے کہہ دو مجھے تنگ نہ کرے"۔

غصے سے بات منہ سے نہ نکل رہی تھی۔ آیا کے پچپن سالہ چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں...... اس نے فیروز کی طرف دیکھا۔ جو تھیلے میں سے کپڑے نکال کر پلنگ پر پھیلا رہا تھا۔ سرخ ساٹن کا غرارہ۔ کامدانی چولی اور تاروں بھری اوڑھنی۔

"دیکھو تو کتنے خوبصورت کپڑے لایا ہوں"۔

"واقعی" آیا نے اپنی بوڑھی آنکھوں میں جوانی کی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی......

"آج رات سیٹھ ہاشم آ رہے ہیں"۔

وہ سیٹھ ہاشم سے ناہید کی عصمت کا سودا کر چکا تھا۔

"اچھا" آیا بولی۔

ناہید پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ آج صبح سے گھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ صفائی ہو رہی تھی۔ گاؤ تکیوں پر ساٹن کے نئے غلاف چڑھائے گئے تھے۔ چاندنی کا نیا فرش بچھایا گیا تھا۔ چمکتا ہوا نیا پاندان آیا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اماں......میں کیا کروں" ناہید نے دکھتی ہوئی نظروں سے آپا کی طرف دیکھا۔

"جو یہ کہہ رہا ہے وہی کرنا ہوگا" وہ لاپرواہی سے بولی۔

ناہید کی روح لرز گئی۔

"اماں......یہ......یہ تم کہہ رہی ہو؟"

فیروز کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اپنی ضد چھوڑ دو بیٹی" وہ پیار سے اسے بہلانے لگی۔

"تم کیا کہہ رہی ہو" ......ناہید نے بوڑھی آپا کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہم ٹھہرے نوکر......جس کا کھائیں گے اسی کے گن گائیں گے" وہ فیروز کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

"جب تک تمہاری ماں زندہ تھی۔ اس کا کھاتا تھا۔ اب یہ دے رہا ہے۔ اس کے حکم پر چلوں گی"۔

آپا کے تیور دو چار دن سے بدلے ہوئے تھے۔ اور آج ناہید کو اپنی سماعت پر یقین نہ آرہا تھا۔

"اپنی ضد چھوڑ دو اس میں تمہاری بھلائی ہے بیٹا"۔

ناہید بھونچکی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ وہ پھٹی نظروں سے آپا کو دیکھ رہی تھی۔ اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے اسے پالا پوسا تھا اسے شرافت کے اصولوں سے روشناس کرایا تھا۔ نیکی اور پارسائی کی تعلیم دی تھی۔ اب اب وہی عورت اس مجسم شیطان کے ہاتھوں کٹ پتلی کا ناچ ناچ رہی تھی......ناہید لرز رہی تھی۔ سارا زمانہ اسے اپنا دشمن نظر آرہا تھا۔ انسانیت کا لبادہ اوڑھے خونی بھیڑیئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے "وہ اکیلی کیا کرے گی۔ کیونکر ان ناگہانی آفتوں کا مقابلہ کر سکے گی۔ دنیا میں ایک آپا کا سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا" وہ سوچتے ہوئے بے دم سی ہو کر بستر پر گر پڑی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے لامتناہی اندھیروں کا سیلاب امنڈا چلا آرہا ہے اور وہ تاریکیوں میں ڈوب رہی ہے۔

"آج ہی آرہے ہیں......کیا نام لیا تھا تم نے ان کا" آپا نے پوچھا۔

"سیٹھ ہاشم آج رات دس بجے کے بعد آئیں گے۔"

"بس تم بے فکر رہو بچی ہے گھبرا رہی ہے میں اسے رام کر لوں گی۔"

"یہ کپڑے رات کو اسے پہنا دینا"۔

"میری بٹیا تو چاند نظر آئے گی ان کپڑوں میں سج دھج دیکھ کر پھڑک اٹھیں گے سیٹھ صاحب۔"

"بس یہی میں چاہتا ہوں۔ پانچ ہزار پر معاملہ طے ہوا ہے۔ یہ تو بگلی ہے روئے جا رہی ہے۔ اسے تو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے پانچ ہزار اری بڑھیا پانچ ہزار۔"

وہ اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پھیلاتے ہوئے خوشی سے بولا۔

"میرا انعام" آپا نے للچائی ہوئی نظروں سے "اسے دیکھا۔

ناہید نے سر اٹھا کر آپا کو دیکھا۔ چاندی کے سکوں نے آپا کا ضمیر خرید لیا۔

"تمہارا انعام" فیروز خوشی سے جھومتے ہوئے بولا "پورے ایک سو روپیہ"

"بس!"

"اور"

"نہ ہزار نہ پانچ سو۔ نہیں بابا کچھ تو بڑھاؤ مشکل کام تو میرا ہے"۔

"اچھا دو سو"

"نہیں کم از کم پانچ سو تو ہوں"۔

"اچھا پانچ سو ہی سہی"۔

"کچھ پیشگی بھی دو"۔ آپا ہنستے ہوئے بولی "تمہارا کیا اعتبار"۔

"لو بڑھیا کیا یاد کرو گی" فیروز نے جیب سے سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جگ جگ جیو"۔

"بس تم اسے وقت پر تیار رکھنا۔"

"وہ سب ٹھیک ہو گا تم بالکل فکر نہ کرو" بڑھیا نے اسے اطمینان دلایا۔

ناہید کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ ان کی آوازیں جیسے وہ بہت دور سے سن رہی ہو۔

"اب سارا معاملہ تمہارے اوپر ہی ہے۔ مجھے ذرا بازار جانا ہے۔ کچھ پینے کے لئے لاؤں گا۔ ذرا سیٹھ صاحب ضرورت سے زیادہ ہی پیتے ہیں"۔

"ارے ہاں بازار جا رہے ہو" آپا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہاں کچھ کام ہے کیا"

"کب تک لوٹو گے"

"نو بجے سے پہلے ہی آجاؤں گا"۔

"آپا نے اطمینان سے ایک لمبی سانس لی گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بجنے میں دس منٹ تھے۔ کچھ سنگار کی چیزیں چاہئیں تھیں۔ بٹیا کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے"۔

"تم بتا دو میں لیتا آؤں گا"۔

"چلو میں لکھوائے دیتی ہوں" دونوں دوسرے کمرے میں آگئے۔

فیروز نے جیب سے ڈائری نکالی۔ آپا لکھوا رہی تھی۔ اور وہ جلدی جلدی لکھ رہا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بس یا اور کچھ بھی چاہئے"۔

"بس یہی جلدی کرو نو بجے سے پہلے ہی لوٹ آنا۔ اور ہاں بڑھیا قسم کی چیزیں لانا" اس نے صدر کی ایک بہت بڑی دکان کا پتہ دیا۔

"سمجھ گیا سمجھ گیا" اور وہ ہنستا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔

آیا کھڑکی سے اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ ناہید کے پاس آئی۔ جو اوندھے منہ پڑی اپنے مقدروں کی سیاہی کو آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ناہید" اس نے سرگوشی کے انداز میں پکارا۔

"ناہید اٹھو میری بچی" ناہید نے اس کا بوڑھا ہاتھ نفرت سے جھٹک دیا۔

"اٹھو" وہ اس پر جھک گئی" وقت بہت کم ہے" اس نے اٹھایا۔ آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ سرخ بھبوکا ہو رہا تھا آیا نے جھک کر اس کی پیشانی پر شفقت آمیز بوسہ دیا۔

"وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ یہاں سے نکل جائیں چلو اس ظلم کی بستی سے بھاگ چلیں"۔

ناہید مشکوک نظروں سے آیا کو دیکھنے لگی۔

"تم"

"وہ سب کچھ فیروز کا اعتماد جیتنے کیلئے کیا تھا میں نے" آہستگی سے بولی "تمہیں بچانے کی ترکیبیں سوچ رہی تھی۔ یہاں رہ کر تمہاری پاکیزگی کبھی محفوظ نہ رہ سکے گی۔ چلو اٹھو جلدی کرو۔ فیروز کو میں نے صدر بھیج دیا ہے۔ وہ نو بجے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ جب تلک ہم"۔

"اماں" ناہید اب بھی غیر تسلی بخش انداز سے اپنی بوڑھی آیا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے کانوں سے سب کچھ سن چکی تھی۔ آیا نے فیروز سے سو روپیہ پیشگی بھی لے لیا تھا۔

"وقت ضائع نہ کرو" آیا نے اس کے شہابی رخساروں پر سے الجھے الجھے بالوں کی لٹیں ہٹائیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آیا نے اس کے اٹھارہ سالہ جواں جسم کو اپنی بوڑھی بانہوں کے حلقے میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"سات بجنے والے ہیں۔ ساڑھے سات بجے گاڑی نکل جاتی ہے"۔

"کہاں جاؤ گی"

"چاند گاؤں میں میری ایک منہ بولی بہن رہتی ہے فی الحال اسی کے پاس جائیں گے"۔

"چاند گاؤں"

"ہاں" آیا اٹھتے ہوئے بولی" وقت بہت کم ہے چاند گاؤں یہاں سے کوئی رات بھر کا سفر ہے۔ صبح پانچ

بجے گاڑی وہاں پہنچتی ہے۔ وہی محفوظ جگہ ہے فیروز کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی"۔

"ناہید گم سم سی بیٹھی رہی۔"

"تم ایک رقعہ لکھو فیروز کے نام۔ پنسل کاغذ ہے کہیں" آیا نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"الماری میں میرا پن پڑا ہے"۔ ناہید الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی......

آیا پن لے آئی۔ گھبراہٹ میں کوئی کاغذ نہ ملا۔ میز پر پڑی ہوئی زرینہ کی تصویر فریم سے نکال کر ناہید کے ہاتھ میں دے دی۔

"لو اسی کے الٹی طرف لکھو"۔

"کیا لکھوں" وہ مستفسرانہ دیکھنے لگی"۔

"لکھو میں اپنی ایک سہیلی کے پاس مراد نگر جا رہی ہوں"۔

"تم تو چاند گاؤں کہہ رہی تھیں اماں"۔

"آیا کو ہنسی آ گئی ناہید قلم روکے معصومیت سے اسے دیکھنے لگی۔

"تو کیا پورا پتہ لکھ کر چھوڑ جاؤ گی۔ مراد نگر کا لکھو۔ جائیں گے تو چاند گاؤں۔ فیروز کو دھوکہ دینے کے لئے مراد نگر لکھوا رہی ہوں۔ ڈھونڈے گا تو اسی لائن پر......جب تک ہم اس کی دستبرد سے باہر ہو جائیں گے۔ سمجھیں ہاں تو لکھو اگر میرا پیچھا کیا۔ تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی"۔

ناہید نے تصویر کی پشت پر جو کچھ آیا لکھواتی رہی لکھ دیا۔

"چلو رکھ دو اسے یہیں۔ اور جلدی سے تیار ہو جاؤ" آیا نے کہا۔

"اماں اگر اسکیم ناکام ہو گئی تو"

"کیوں ناکام ہو گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھ بیٹی۔ وہی تیرا نگہبان ہے"۔

"میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اماں"۔

"حوصلہ رکھ بیٹی" آیا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ساتھ کوئی چیز لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی دو سو روپیہ ہے۔ تمہارے پاس یہ گھڑی اور ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ ضرورت پڑی تو ان کو بیچ دیں گے۔ اس وقت یہاں سے نکلنے کی سوچو مستقبل کا خدا حافظ ہے"۔

ناہید اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔

وہ حسین تھی۔ قدرت نے اس کی تخلیق میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی کاوش برتی تھی۔ اس کے حسن میں سورج کی حدت چاند کی ٹھنڈک تاروں کی تابانی اور بادلوں کی نمی تھی۔ گہری گہری کشادہ اور حیا بار آنکھیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نوکیلے کانٹوں جیسی پلکوں کی گھنی جھالریں۔ خوبصورت ناک۔ رسیلے ہونٹ۔ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا گداز جسم قیامت خیز قد...... شہابی رنگت...... وہ حسن معصومیت وقار اور سادگی کا اک دلکش مرقع تھی۔

"ناہید" آپا نے اسے آواز دی۔ چند منٹ بعد وہ غسل خانے سے تیار ہو کر نکل آئی۔ ہلکے نیلے رنگ کے کپڑوں میں وہ کوئی آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی بالوں کی آوارہ لٹیں اس کے رخ روشن پر نثار ہو رہی تھیں۔ سرخ رنگ کے فیتے میں بندھے ہوئے قدرتی لہروں والے بال اس کے شانوں پر پڑے تھے۔

"کوئی سویٹر تو پہن لو بستر وغیرہ تو ہو گا نہیں۔ رات کو گاڑی میں ٹھنڈ ہو گی"

"اچھا" کہہ کر اس نے الماری سے سرخ رنگ کا سویٹر نکال کر پہن لیا۔ چھوٹی سی کالی شال تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑلی۔

"میرا خیال ہے کوٹ بھی لے لو"

"اچھا"

"میں فخرو کو تانگے کیلئے کہتی ہوں" یہ کہہ کر آپا باہر صحن میں آگئی...... فخرو سامنے والے کمرے کے دروازے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ وہ دن رات نشے میں دھت رہتا تھا۔

"فخرو...... ارے او فخرو"۔

"کیا ہے بڑی بی" وہ بڑبڑایا

"ذرا نیچے چل کر ایک تانگہ تو پکڑنا۔"

"تانگہ"

ارے ہاں جلدی کرو۔ بیٹا کو بازار سے کچھ سنگار کی چیزیں لانا ہیں وہ...... وہ اپنے سیٹھ صاحب آج رات کو آ رہے ہیں نا!"

"ہاں ہاں" فخرو اپنے میلے میلے دانت نکال کر ہنسا "آج تو عید ہے بڑھیا۔ عید سیٹھ صاحب آ رہے ہیں خود بھی پیئیں گے ہمیں بھی پلائیں گے عید ہو گی۔ آج تو" وہ خوشی سے جھومنے لگا۔

"باتیں ہی بنائے جاؤ گے جلدی بھی کرو۔ واپس بھی لوٹنا ہے ہمیں۔"

فخرو نے جا کر تانگہ روک لیا۔ ناہید مسحور سی آپا کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر رہی تھی اس کا دماغ تھک چکا تھا۔ نہ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ نہ سمجھ رہی تھی۔ آپا دروازے تک گھر کی نوکرانی کو کچھ تاکید کرتی رہی۔ اور پھر سہارا دے کر اسے تانگے پر سوار کرایا۔

"کب تک لوٹو گی" فخرو نے آپا سے پوچھا۔

"کوئی ایک گھنٹے تک۔ میرے آنے تک ساری جگہ ٹھیک ہو۔ سمجھ گئے نا؟"

"بالکل بالکل" فخرو نے ہوا میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

تانگہ چل دیا۔

ناہید نے آخری نگاہ اس عمارت پر ڈالی جس کا اوپر کا حصہ رہائشی تھا۔ اور نچلا حصہ جنسی منڈی جہاں حسن کے ڈھیر پر سرمایہ بولی دیتا تھا۔ جہاں عصمت سکوں کے عوض بکتی تھی۔ جہاں جذبات کو چند روپہلی ٹھیکروں کے بدلے بیچا جاتا تھا۔ اور جہاں اس کی ماں نے زندگی کے طویل اٹھارہ سال گزارے تھے۔

"کہاں جانا ہے" تانگے والے نے پوچھا۔

"اسٹیشن بوڑھی آپا نے کالی شال کھول کر ناہید پر ڈالتے ہوئے کہا۔

تانگہ اسٹیشن کی طرف بھاگنے لگا۔

کئی دکانیں گھومنے بعد فیروز آپا کی مطلوبہ اشیاء لے کر کوئی سوا نو بجے گھر آیا۔ وہ سیدھا ناہید کے کمرے کی طرف گیا۔

"لو بھئی دیکھ لو" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ کمرہ خالی تھا۔

شام کو جو وہ کپڑے لایا تھا۔ پلنگ پر بکھرے پڑے تھے۔ چولی تکیے پر پڑی تھی۔ غرارہ دوپٹے میں الجھا ہوا پلنگ پر سے بے ترتیبی سے لٹک رہا تھا۔

"بڑی بی" فیروز نے کمرے میں سے باہر نکلتے ہوئے پکارا۔

"کہاں ہو" اب وہ دوسرے کمرے میں کھڑا تھا۔ لفافے بڑی احتیاط سے اس نے میز پر رکھ دیئے۔

"آپا" صحن میں آ کر وہ زور سے چلایا گھر کی ملازمہ ڈرتی ڈرتی باورچی خانے سے نکل آئی۔ وہ کئی سال سے فیروز کے پاس کھانا پکانے پر نوکر تھی۔ اور اس بدطینت انسان سے بے حد ڈرتی تھی۔

"کہاں ہے بڑی بی"

"وہ تو بازار گئی ہیں" وہ سہمی ہوئی بولی۔

"بازار...... کس لئے"

"کہہ رہی تھیں بٹیا کو کچھ سنگار کی چیزیں خریدنا ہیں"۔

فیروز کچھ سوچنے لگا۔ سنگار کی چیزیں تو اس سے منگوائی تھیں۔ پھر بازار جانے کا مقصد۔

"ناہید کہاں ہے"۔

"وہ بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔"

فیروز کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے دماغ میں وسوسے رینگنے لگے۔ شبہے جاگنے لگے جلدی سے بولا۔

"کب گئی تھیں"۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہو گا" ملازمہ اپنا پھٹا ہوا دوپٹہ سر پر ٹھیک کرتے ہوئے بولی"۔ بس آنے والی ہی ہونگی اب تو"۔

"میرے جانے کے بعد گئی تھیں کتنی دیر بعد گئی ہونگی"۔

"کوئی دس پندرہ منٹ بعد"۔

"ابھی تمہارا گھنٹہ ہی ہوا ہے"۔

وہ غصے سے گرجا ملازمہ سہم کر دیوار سے لگ گئی "نو بج چکے ہیں۔ فخرو کہاں ہے"۔

"وہ ابھی ابھی گیا ہے۔ کہتا تھا ان کا پتہ کرنے جا رہا ہوں"۔

"ہوں" فیروز نے غصہ سے فرش پر پیر مارا۔

فخرو مایوس لوٹ آیا۔ وہ بڑے بازار اور صدر تک آیا اور ناہید کو دیکھ آیا تھا۔ اس کے واپس آنے پر فیروز کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ دونوں نوکر سر جھکائے کھڑے تھے۔ اور وہ اپنا غصہ ان پر جھاڑ رہا تھا۔

"بھاگ گئیں۔ اس کے دل سے آواز اٹھ رہی تھی "آیا چکمہ دے کر نکال لے گئی اسے" نوکروں کو صحن میں چھوڑ کر وہ کمرے میں آ گیا۔ بے تابی سے ٹہلتے ہوئے وہ اس فرار کے متعلق سوچنے لگا لیکن وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا وہ ناہید کے کمرے میں آ گیا۔ پلنگ پر کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ گویا اس کا منہ چڑا رہے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ رات تاریک تھی۔ اور سردی سے ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر روشن ستارے اس کی بے قراری پر ہنس رہے تھے...... اس نے غصے سے کھڑکی بند کر دی۔

"میں تجھے پاتال کی گہرائیوں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا میرا نام فیروز ہے"۔

اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا۔ کہ یہ جھوٹ ہے۔ یہ اپنی شکست کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔ جانے والے جا چکے تھے نور ظلمت کو پچھاڑ چکا تھا۔ حق باطل سے ٹکرا کر دندناتا ہوا نکل گیا تھا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور پلنگ پر بیٹھ کر اطمینان سے سوچنے لگا۔

اس کی نظر میز پر پڑے ہوئے پن پر پڑی۔ یونہی خیال آ گیا۔ شاید کوئی تحریر چھوڑ گئی ہوں۔ دم بھر میں اس نے کمرے کی چیزیں الٹ پلٹ کر ڈالیں کوئی رقعہ کوئی کاغذ نہ ملا۔ ہو سکتا ہے بازار ہی گئی ہوں اور ابھی آ جائیں۔ اس نے اپنے دل کو تسکین دینا چاہی۔ میز پر زرینہ کی تصویر فریم سے باہر پڑی تھی۔ بلا ارادہ اس نے تصویر اٹھا لی۔ پشت پر چند سطور دیکھ کر وہ جلدی سے پڑھنے لگا۔

"میں مراد نگر آٹھ بجے کی گاڑی سے ایک سہیلی کے پاس جا رہی ہوں۔ اگر تم نے میرا پیچھا کیا۔ تو اپنی حفاظت کیلئے میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی"۔

.... ناہید

اس کا پارہ تیز ہو گیا۔ وہ خوف ناک اژدھے کی طرح پھنکارنے لگا۔ ان کے فرار کی تصدیق ہو گئی تھی۔ تصویر ہاتھ میں لئے وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس نے ایک نظر تصویر پر ڈالی۔ زرینہ تصویر میں مسکرا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے تصویر نہیں خود زرینہ اس کی شکست پر طنز یہ ہنس رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی سمٹی ہوئی نفرت کے شعلے لپکتے نظر آئے اس کے ہونٹوں پر اک جانا بوجھا طنز پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ چند ثانئے وہ تصویر کو دیکھتا رہا۔ اور پھر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ ٹکڑے کمرے میں پھیل گئے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی ہر چیز اس کی شکست پر خاموش قہقہے لگا رہی ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ یہ فرار اس کی شاطرانہ چالوں کے منہ پر اک زناٹے دار تھپڑ تھا۔ اس کے شیطانی ارادوں کی ہار تھی۔ اس کے برہنہ کردار کی شکست تھی۔

گھڑیال نے دس بجائے۔ فیروز نے گھڑی دیکھی۔ مراد نگر جانے والی گاڑی کو گئے دو گھنٹے گزر چکے تھے سیٹھ ہاشم بھی آنے والا تھا۔ وہ گھبرا کر سوچنے لگا۔ کہ پہلے اسٹیشن جائے یا سیٹھ کو اس واقعہ سے مطلع کرے۔ جو اپنی دن بھر کی اوڑھی ہوئی پارسائی کی چادر کو اتار کر رات کے اندھیرے میں سرمایے کے بل بوتے پر ایک نوخیز جوانی کو کچلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

فیروز جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ فخرو ڈیوڑھی میں بیٹھا اونگ رہا تھا۔

فیروز کو دیکھ کر ہوش میں آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"مالک"

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹ سے دروازہ کھولا۔ اور تیزی سے باہر نکل کر گلی کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

............○............

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۲

ناہید کی ماں زرینہ ایک مشہور طوائف تھی۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی بڑے بڑے رئیس بڑے بڑے نواب اس کے اشارۂ ابرو پر جان دیتے تھے۔ فریب حسن کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے جادو بھری آواز بھی ودیعت کی تھی۔ فیروز اس جادو سے آگاہ تھا۔ وہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کرتا۔ اور اس کے پرستار تو اس پر جان تک نثار کر دینے کو تیار رہتے۔ مال و دولت تو کوئی چیز ہی نہ تھی۔

وہ پیدائشی طوائف نہ تھی بلکہ حالات کی تیز و تند موجوں میں بہتی ہوئی اس مقام پر آپہنچی تھی۔ اس کا تعلق ایک خوش حال خاندان سے تھا۔ ماں بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ باپ نے اس عظیم صدمہ کو بھلانے کیلئے دوسری شادی کر لی تھی۔ دوسری بیوی نے غم غلط کرنے کے ساتھ ساتھ پہلی بیوی کی یادگار اس معصوم بچی کی یاد کو بھی باپ کے دل سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اس طرح شفقت مادری سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باپ کی محبت سے بھی محروم ہو گئی۔ وقت گزرتا گیا۔ اور زرینہ کی حیثیت گھر کی ایک لونڈی کی ہو کر رہ گئی صبح سے شام تک گھر کے کام کاج میں کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی۔ سوتیلی ماں کی طنز آمیز جھڑکیاں سہتی اور رات کو باپ کی جوتیوں سے مرمت ہوتی۔ دن رات یونہی گزرتے رہے۔ اور معصوم بچی ایک شگفتہ پھول بننے لگی بچپن گیا۔ جوانی آئی نشیلی جوانی اور اس کا قیامت خیز حسن سوتیلی ماں تو اسے دیکھ دیکھ کر جلنے لگی۔ اس کی نفرت کے شعلے تیز ہونے لگے بات بات پر وہ اس سے الجھنے لگی۔ رات کو باپ کے آنے تک اک طوفان زرینہ کی زندگی کی کمزور کمزور بنیادوں کو ہلاتا ہوا گزر جاتا وہ اپنی زندگی سے تنگ آگئی پندرہ سالہ حسین زرینہ اس مستقل آزاد سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچتی رہتی "کیا کرے کہاں جائے" اس کا دماغ ہر وقت اسی تانے بانے میں الجھا رہتا اسے اپنے گھر سے اپنے والدین سے اپنے سوتیلے بہن بھائیوں سے دبی دبی نفرت ہو چلی تھی ایک دن وہ باورچی خانے میں برتن صاف کر رہی تھی۔ برتن رکھ کر وہ اپنے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ نرم نرم ہاتھوں کی لکیریں راکھ سے کالی کالی ہو گئی تھیں۔ اس کا جی چاہا برتن اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دے "اب میں کبھی برتن نہ

دھوؤں گی۔ ہاتھوں کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ آخر نوکرانی کس لئے رکھی ہے۔ وہ تو سارا وقت ماں کے پاؤں دباتی رہے۔ اور میں"

مائی کو آواز دینے کے ارادے سے وہ اٹھی صحن میں ماں چارپائی پر پڑی تھی۔ مائی اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ ماں مائی سے بڑی رازداری کی باتیں کر رہی تھی وہ غسل خانے میں گھس گئی اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ ماں کہہ رہی تھی۔

"تم ہی کوئی رشتہ بتاؤ۔ میں تو کہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے اس لڑکی کی شادی کر کے دفان کر دوں"۔

شادی؟

ایک کیف آگیں تصور سے وہ جھوم اٹھی۔ اس کی شادی ہو گی۔ وہ اک نیا گھر بسائے گی۔ نئی دنیا آباد کرے گی۔ ایسی حسین دنیا جو اک ظالم ماں اور لاپروہ باپ کی دستبرد سے باہر ہو گی۔ اس کی اپنی بالکل اپنی دنیا خوشی سے اس کا انگ انگ جھوم رہا تھا۔ خوابیدہ امنگیں سر اٹھانے لگیں۔ اس کے جذبات میں تلاطم بپا ہو گیا۔ وہ سوتے جاگتے میں حسین اور سنہری سپنے دیکھنے لگی۔ نہ اب اسے ماں کی جھڑکیوں کی پرواہ تھی۔ نہ باپ کی مار پیٹ کا افسوس۔ وہ ہر سختی ثابت قدمی سے برداشت کرنے لگی۔ کیوں کہ ان شخصیتوں کے عقب میں مسکراتی ہوئی خوشیاں اور ناچتی ہوئی مسرتیں نظر آ رہی تھیں۔

دن گزرتے گئے۔ اس کی جوانی رنگین سے رنگین تر ہوتی گئی۔ اس کا حسن نکھرتا گیا۔ گھر کے کام کاج میں وہ نئے سرے سے دل چسپی لینے لگی۔ وہ مشین کی طرح کام کرتی رہتی۔ اور اس کے خیالات اس کے ہونے والے شہزادے سے الجھے رہتے۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے محبوب شوہر کی بھاری آواز سنتی اس کے تنومند جسم کا لمس محسوس کرتی...... اور پھر...... خود ہی شرما جاتی۔

عید قریب آ رہی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے کپڑے سینے کے لئے وہ اپنی ماں کی ایک سہیلی کے گھر جا رہی تھی۔ ان کا گھر بر لبِ ہوسٹل کے پچھواڑے تھا۔ ہوسٹل کے پچھلے کمروں کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ وہ لاکھوں مرتبہ اس گلی سے گزری تھی۔ ہزاروں مرتبہ بچپن میں ان اونچی اونچی کھڑکیوں پر چڑھی تھی۔ ایک کھڑکی کھلی تھی۔ اور کوئی کھڑا دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا۔

زرینہ ریشمی کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائے گلی سے گزر رہی تھی۔ مترنم آواز سن کر آنکھیں اٹھا کر دیکھا پیر نالی میں الجھ گیا۔ خود تو گرتے گرتے بچی۔ البتہ کپڑے کھل کر گلی میں بکھر گئے۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی سے بیٹھ کر کپڑے سمیٹنے لگی۔

"اوہو" ایک بھاری آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی کوئی کھڑکی سے نیچے کود آیا۔

"لاؤ میں اکھٹے کر دوں"۔ اس حسین نوجوان نے کپڑے اکھٹے کر دیئے۔ وہ حیران حیران نظروں سے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اسے دیکھتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ کوئی اجنبی نہیں اس کے خیالوں کا شہزادہ ہے۔ جس کی بھاری آوازوہ تخیل میں بارہاسن چکی ھسے ۔ جس کے تنومند جسم کالمس وہ کئی بار محسوس کر چکی ہے۔

وہ بے فکر نواب زادہ بی اے کا طالب علم تھا۔صحت مند جسم لانباقد خوبصورت آنکھیں وہ اس میں کھو کر رہ گئی اس کی جوانی اندر ہی اندر کلبلارہی تھی جوش کھارہی تھی راستہ پا کر پھوٹ نکلی۔ نظروں کا تصادم زندگی کا سب سے بڑا واقعہ بن گیا۔ چوری چوری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ چپکے چپکے تعلقات بڑھنے لگے۔ اور زرینہ نے اپنا اعتماد اپنا یقین اپنی محبت سب اس بت ہوش ربا کے قدموں میں ڈال دیا۔

خاندان میں کسی عزیز کی شادی تھی۔ زرینہ کے ماں باپ کی شرکت ضروری تھی۔ دو بچوں کو زرینہ کے پاس گھر پر چھوڑ کر باقی بچوں کو لے کر وہ دونوں شادی میں شرکت کیلئے دوسرے شہر چلد یئے۔

”آٹھ دن تک لوٹ آئیں گے“ ماں نے کہا تھا۔

” چھیمے کی ماں کو پاس سلالیا کرنا“ باپ نے بوڑھی ہمسائی کا ذکر کیا۔

”وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے“ ماں بولی۔

”بہت اچھا“ زرینہ ایسے خوش تھی۔ جیسے سر سے کوئی بڑی مصیبت ٹل رہی ہو آٹھ دن پورے آٹھ دن وہ آزاد ہوگی۔ وہ ہوگی اور اس کا محبوب......

ان آٹھ دنوں میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہو گیا۔ تنہائی کو غنیمت جان کر دونوں نے چوری چوری شادی کرلی۔ وہ بڑے ارمانوں سے خود ہی دلہن بنی۔ ماں کے صندوق سے نکال کر سرخ سہاگ کا جوڑا پہنا۔ اس کا محبوب شوہر اسے کچھ بھی نہ دے سکا ہاں ایک بڑے سے ہیرے کی چمکتی ہوئی انگوٹھی اس کی خوبصورت انگلی میں پہناتے ہوئے اس نے کہا۔

”یہ ہماری محبت کی یادگار ہے زرینہ اسے سنبھال کر رکھنا۔ چند دنوں تک چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ میں گھر جاؤں گا۔ اور پھر ہمیشہ کیلئے تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔“

زرینہ کا معصوم دل بڑے زور سے دھڑکا لیکن مستقبل کا تصور کر کے اس کی روح رقص کرنے لگی تھی۔

کالج میں چھٹیاں ہو گئیں۔ اور وہ چلا گیا۔ زرینہ کے لئے وقت گزارنا مشکل ہو گیا چھٹیاں ختم ہو گئیں کالج کھل گیا لیکن وہ نہ آیا۔ وہ بے قراری سے اس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ نہ آیا اس کی نظریں اس کھڑکی سے ٹکرا ٹکرا کر ناکام لوٹتی رہیں۔ جس سے کود کر وہ رات کی تاریکی میں اسے ملنے آیا کرتا تھا۔ تین چار ماہ گزر گئے۔ اس کے انتظار نے دم توڑ دیا۔ وہ مایوس ہو گئی۔ قطعاً مایوس ہو گئی۔ اس کی حالت عجیب ہوتی گئی۔ اس کے جسم میں اغم تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اس کے کولھے بھاری ہونے لگی۔ طبیعت میں وحشت اور ویرانی آ گئی۔ اس کی ماں اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور ایک دن جب اس کی ماں کو پتہ چلا۔ کہ وہ بچہ کی ماں بننے والی ہے تو

اس نے زمین آسمان ایک کر ڈالا باپ کی تو جیسے کسی نے کمر ہی توڑ ڈالی اس دن سے اس کی زندگی ایک کربناک ٹیس بن گئی۔ ایک رستا ہوا ناسور۔ جسے دیکھ کر سب کراہت سے منہ پھیر لیتے تھے وہ بہتیرا چیخی اس نے رو رو کر سب کو اپنی شادی کا یقین دلانا چاہا لیکن ہر طرف سے اس بات کے جواب میں اس پر پھٹکار برسی ہر آنکھ نے اسے قہر سے دیکھا اس کی بات پر کسی کو یقین نہ آیا دنیا کی نظروں میں وہ مجرم تھی۔ اس نے گناہ کیا تھا اس نے سماج کے ضابطے کو توڑا تھا اس نے ماحول کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس نے مذہب کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے خوابوں کے محبوب شہزادہ سے نکاح کیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ عنقریب اسے اس جیتے جاگتے جہنم سے نکال لے جائے گا سوتیلی ماں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ لیکن تقدیر کے چکروں نے اسے پیس کر رکھ دیا۔ کوئی اسے سچا نہ سمجھتا تھا کوئی اس کی بات پر یقین نہ کرتا تھا۔ وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار تھی۔ اسے طعنے دیئے گئے اسے مارا پیٹا گیا۔ اس کے زخموں میں نوکیلے نشتر گھنگھولے گئے وہ بے تاب ہو ہو کر تڑپی وہ بے قرار ہو ہو کر روئی اور آخر درد اتنا بڑھا کہ اس کی شدت کا احساس ہی مٹ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی شادی کا ذکر فضول سمجھا۔ اس کی زندگی تباہ ہو گئی۔ صاف و شفاف آئینے پر ان مٹ خراشیں آ چکی تھی۔ اس کا مداوا اس کے پاس نہیں تھا۔

آخر ماں باپ نے بڑی دقت سے اس ذلیل بوجھ کو اتارنے کیلئے جگہ تلاش کر لی۔ ایک آوارہ اور غنڈے کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔ ایک بار پھر اس نے احتجاج کیا۔ ایک بار پھر وہ پورے جوش کے ساتھ چیخی۔ لیکن ہزاروں پھٹکاروں اور لاکھوں نعنتوں کے شور میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔

نئے مالک نے اس کے حسن کو مختلف زاویوں سے جانچا۔ اس کی دبی ہوئی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ اور دوسرے شہر لے جا کر کسی اور غنڈے کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اور اس طرح زرینہ ہاتھوں ہاتھ بکتی فیروز کے ہاتھ آ گئی۔ وہ بڑا گھاگ تھا۔ پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ کہ مال اچھا ہے۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ اور زرینہ اک محبوب شوہر کی چہیتی بیوی بننے کی بجائے اک طوائف بن گئی۔ چراغ خانہ نہ بن سکی، شمع محفل بن گئی۔ حوادث کی پرشور آندھی نے اسے اپنے مقام سے اٹھا کر اس قصر ذلت میں لا پھینکا۔ پہلے پہلے تو وہ بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑائی۔ سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑ ڈالا۔ لیکن بند پنجرے سے فرار کی راہ نہ مل سکی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی حالت پر قانع ہوتی گئی۔ اپنے کو اس جہنمی ماحول کا خوگر بنانے کی کوشش میں لگ گئی۔

وہ طوائف بن گئی۔ طوائفیت کے تمام فرائض انجام دیتی رہی۔ وہ مجبور تھی۔ وہ نسوانیت کی بلندیوں سے اٹھا کر معصیت کی پستیوں میں پھینک دی گئی تھی۔ اور اسی معصیت کدے میں اس نے ناہید کو جنم دیا۔

ناہید کی پیدائش فیروز کے لئے ایک اچھا شگون تھی۔ اسے اپنا مستقبل درخشندہ نظر آنے لگا۔ ناہید اپنی ماں کی ہم شکل تھی۔ فیروز اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"زرینہ کا شباب ڈھلنے تک وہ جوان ہو جائے گی اور پھر......"

وہ آنے والے دور کی خوش آئند تصور سے مسرور ہونے لگا۔ لیکن زرینہ اس کے نظریئے کو بھانپ گئی۔ اس نے اس مکروہ نظریئے کی جی بھر کر مخالفت کی۔ ناہید اس کی ہم شکل تھی۔ وہ اپنی شکل ایک بار حالات کی رو میں بہہ کر مسخ کر چکی تھی۔ اب دوبارہ اسے خراب کرنا چاہتی تھی۔ وہ ناہید کو اپنے ماحول سے دور رکھ کر پالنا چاہتی تھی......

اس نے فیروز کی ایما پر ناچنا سیکھا۔ گانا سیکھا۔ عشوہ طرازیاں سیکھیں۔ دلوں کو لبھانا سیکھا۔ دل سے اٹھتے ہوئے آہوں کے دھوئیں کو مسکراہٹوں میں چھپانا سیکھا۔ لیکن ناہید کے بارے میں اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ فیروز اسے اس معاملہ میں جھکا نہ سکا۔ خود اسے جھکنا پڑا۔ وہ بظاہر راضی ہو گیا۔ لیکن اپنے شاطرانہ داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھا۔ اپنی ابلیسانہ قوتوں سے آگاہ تھا۔ ناہید کے جوان ہوتے ہی وہ اسے اس ماحول میں کھینچ لائے گا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اور پھر یوں بھی ناہید کی گھر میں موجودگی روزمرہ کے عمل میں رخنہ انداز تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بچی کو کسی آیا کی نگرانی میں دے کر الگ رکھا جائے۔ بھولی بھالی زرینہ فیروز کی باتوں کو سمجھ نہ سکی۔

ناہید کو ایک معتمد آیا کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ وہ ایک دیندار معمر عورت تھی۔ زرینہ نے بچی اس کی گود میں دیتے ہوئے روتی ہوئی آنکھوں سے اس کی پیدائش کی المناک کہانی اسے سنائی۔ آیا کا دل اس جانگداز واقعہ پر بھر آیا۔ بچی کو سینے سے لگاتے ہوئے اس نے زرینہ کو یقین دلایا کہ وہ اسے اپنا جگر گوشہ سمجھ کر پالے گی۔
اور اسی دن آیا بچی کو لے کر عالم آباد آ گئی۔ اس چھوٹے سے خوب صورت شہر میں ایک اچھا سا مکان لے لیا گیا تھا۔ آیا ناہید اور اک کام کاج کے لئے ملازمہ کو لے کر اس چھوٹے سے قرینے سے آراستہ مکان میں رہنے لگی۔

اور زرینہ فیروز کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتی رہی۔ اس کا حلقۂ احباب وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اس کی پنڈلیاں ناچتے ناچتے سوج گئیں۔ اس کے گھنگروؤں کی چھنا چھن میں اس کی نامراد زندگی کی چیخیں واضح ہوتی گئیں۔ اس کے گلے کے سوز میں اس کی ناشاد زندگی کی جلن بڑھتی گئی۔ اور فیروز ان چیخوں کی قیمت، اس جلن کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ وصول کرتا رہا۔

کلی جب کچھ شگفتہ تھی۔ پھول جب ذرا تازہ تھا۔ تو سب نے بے اعتنائی سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ لیکن جب کلی مرجھا گئی۔ پھول کملا گیا۔ سر راہ پھینک دیا گیا۔ تو ہر ہاتھ اس کی طرف لپکا۔ اس کے لمس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کی جانے لگی۔ اس کی بوسیدہ خوشبو کے حصول کے لئے بڑے سے بڑا معاوضہ دیا جانے لگا۔ وقت کا بوڑھا ہاتھ تاریخ کے ورق الٹتا رہا۔

ناہید آیا کی نگرانی میں پلتی رہی۔ بڑھتی رہی۔ اس کے خدوخال واضح ہوتے گئے اس کا حسن نکھرتا گیا۔ اس کی اٹھان صحت مند اصولوں پر ہو رہی تھی۔ شرافت کے اصول ذہن نشین کرائے گئے تھے۔ ہر چیز گناہ و ثواب کے پیمانے میں ناپ تول کر سمجھائی گئی تھی۔
زرینہ مہینے میں دو ایک مرتبہ اسے دیکھنے کو آتی۔ اور اس کی اٹھان سے مطمئن ہو کر واپس چلی جاتی۔ وہ اپنے ساتھ گراں مایہ کھلونے اور تحفے لے کر آتی۔ پہلے پہل تو ناہید اس سے جھجکی۔ لیکن رفتہ رفتہ مانوس ہو گئی۔ پانچ سال کی عمر میں اسے کانونٹ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ بڑی ہونہار بچی تھی۔ تعلیم کے مدارج بڑے اعزاز سے طے کرنے لگی۔ کچھ اپنی پیاری سی من موہنی صورت اور کچھ قابلیت کی وجہ سے وہ سکول میں ہر دلعزیز تھی۔
عمر کے ساتھ ساتھ اس کی سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں زرینہ اب بھی مہینے میں دو ایک بار اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھنے آیا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ اکثر فیروز بھی آتا تھا۔ فیروز سے ناہید کو ازلی نفرت تھی۔ اس کی کالی کالی مونچھوں اور چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے خوف آتا تھا۔ اس کی روح کی ساری خباثت ان آنکھوں میں جمع تھی۔ اور ناہید ان آنکھوں کو دیکھ کر سہم جایا کرتی تھی۔ اس کا ننھا سا دل کانپ جایا کرتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ امی اسے اپنے ساتھ کیوں لاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیوں رہتی ہے۔ ماں ہے۔ تو ناہید اور آیا کے پاس کیوں نہیں رہتی۔ ایک دن اس نے آیا سے پوچھ ہی لیا۔
"اماں"
"کیا ہے بیٹی"
"یہ فیروز کون ہے"
نو دس سالہ معصوم بچی کے اس سوال پر آیا گھبرا گئی۔ لیکن جلد ہی بات بناتے ہوئے بولی۔
"فیروز تمہاری امی کا منیجر ہے۔"
"منیجر"
"ہاں بیٹی" آیا اس کے گھنے گھنگریالے بالوں میں سرخ ربن درست کرتے ہوئے بولی۔ "بہت بڑا کاروبار ہے تمہاری امی کا۔ سارا فیروز نے سنبھالا ہوا ہے۔ بھلا اکیلی امی اتنا کام کیسے سنبھال سکتی ہے۔"
"امی یہیں کیوں نہیں رہتیں۔"
آیا ایک دفعہ پھر چکرائی۔
"اماں" ناہید آیا کا منہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "امی ہمارے پاس کیوں نہیں رہتیں۔ فیروز کے پاس کیوں رہتی ہیں۔ مجھے تو اس فیروز سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ امی سے کہہ دینا اسے اپنے ساتھ نہ لایا کریں۔ وہ جب

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھی آتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہونے لگتا ہے۔ "

آپا نے ہنس کر اس کی بات ٹال دی۔

"ڈرپوک کہیں کی۔ " اس نے ناہید کے سیب کی طرح سرخ گالوں کو پیار سے تھپتھپایا۔

"نہیں اماں تم امی کو ضرور منع کر دینا۔ اسے یہاں نہ لایا کریں۔ مجھے تو وہ دیوؤں سے بھی زیادہ ڈراؤنا لگتا ہے۔ "

"اچھا بھئی کہہ دوں گی۔ "

ناہید خاموش ہو گئی۔ اور آپا کا دماغ ایک نئی سوچ میں الجھ گیا۔ ناہید بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی پرورش ایک شریف گھرانے کی بچی کی طرح ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی ماں ایک رنڈی تھی۔ کیا یہ بات ناہید کو معلوم ہو جانی چاہئے۔

اور جب زرینہ آئی تو آپا نے ساری بات اسے کہہ سنائی۔

"اماں " زرینہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ " ناہید کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے۔ اس پر میری زندگی کا سایہ نہ پڑنے پائے۔"

" چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔ لیکن۔ "

"لیکن کیا؟ "

" سوچتی ہوں یہ بات اب چھپائے نہ چھپ سکے گی۔ وہ سیانی ہو رہی ہے۔ عجیب عجیب سوال کرتی ہے اب تو۔ چھوٹی تھی تو ٹال لیا کرتی تھی میں۔ اب تو اسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ "

زرینہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں سے جھلملانے لگیں۔ آنسو بے اختیار بہنے لگے اور دل کا غبار آنسوؤں سے دھلنے لگا۔

ناہید کی سوچ دن بدن گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آپا نے فیروز کو اس کی ماں کا منیجر بتا کر وقتی طور پر اسے مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن وہ جانے کیوں ان بات کی صداقت سے انکاری تھی۔ اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اور جب ناہید شعور کو پہنچی تو یہ بات اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ کہ فیروز اس کی ماں کا دوسرا خاوند ہے۔ اس کا سوتیلا باپ ہے۔ اسی لئے ماں اس کے پاس ہی رہتی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ناہید اور آپا کے پاس نہ رہے۔ اس قیاس سے اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن فیروز سے نفرت کم ہونے کی بجائے کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ جب بھی وہ آتا وہ حتی المقدور اس کے سامنے آنے سے گریز کرتی۔ اس کی بے باک باتوں کا جواب نہ دیتی۔

میٹرک کے امتحان میں وہ اول آئی۔ اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس مسرور موقعہ پر اس نے اپنی چند

خصوصی سہیلیوں کو رات کے کھانے پر بلایا تھا۔

"کھانے کے علاوہ گانے سے بھی تواضع کرو گی جب آئیں گے ہم تو۔ " ایک عزیز سہیلی نے کہا۔

"ضرور ضرور " ناہید نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ناہید کو گانے کا بچپن سے شوق تھا۔ ستار اس کا پسندیدہ ساز تھا...... ایک بوڑھے استاد سے اس نے گانا اور ستار بجانا سیکھا تھا۔ اس کی جادو بھری آواز ستار کی پرسوز آواز میں مل کر ایک عجیب سا سماں باندھ دیا کرتی تھی۔ سب سننے والے بے خود ہو جایا کرتے تھے۔

جس رات ناہید کے ہاں دعوت تھی۔ اس صبح زرینہ اور فیروز بھی آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ بیش قیمت تحائف لائے تھے۔ زرینہ اپنی بچی کی کامیابی پر پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ اسے بڑی دیر تک اپنے سینے سے لگائے اپنے دل کی جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرتی رہی۔

اچھا ہوا آپ بھی آ گئیں امی۔ آج رات میں نے چند سہیلیوں کو دعوت پر بلایا ہے۔ " ماں کا دل خوشی سے پھیلنے لگا۔

ناہید کھانے کے کمرے میں میز پر برتن سجا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں زرینہ اور فیروز باتیں کر رہے تھے۔ ناہید اپنے کام میں مشغول تھی۔ اس نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن آوازیں تلخ اور تیز ہوتی گئیں۔ ناہید کے ہاتھ رک گئے۔

" آٹھ بجے سے پہلے واپس پہنچنا ہے سمجھیں "

"میں آج نہیں جاؤں گی۔ "

"اور وہ سیٹھ رحیم "

"میری بلا سے "

"اچھا " فیروز گرجا۔ " تمہارا یہ حوصلہ۔ پانچ سو روپیہ ایک رات کا معاوضہ۔ اور تم یہیں رہوں گی۔ تمہیں ابھی چلنا ہو گا۔ سات بجنے والے ہیں۔ آٹھ بجے تک بمشکل پہنچیں گے۔ "

"فیروز میں نے کہہ دیا ہے میں نہیں جاؤں گی آج۔ " زرینہ کی رندھی ہوئی آواز آئی۔ " مجھے تمہارے سیٹھ کی قطعاً پرواہ نہیں ہے۔ "

"تمہاری ہٹ دھرمی سے مستقل آسامی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اسی سیٹھ کی جیبوں کی اگلی ہوئی دولت پر تو سب ٹھاٹھ باٹھ چل رہے ہیں۔ "

ناہید کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے کئی پردے اٹھ گئے تھے...... زرینہ کو فیروز لے کر چلا گیا سہیلیاں آئیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دعوت کچھ بدمزہ سی رہی۔ ناہید اصرار کے باوجود گا نہ سکی۔ رات بھر وہ بستر پر ماہئ بے آب کی طرح کروٹیں بدلتی رہی۔ لمحہ بھر نہ سو سکی۔ دن چڑھا۔ وہ ست سی بستر پر پڑی رہی۔ ملازمہ چائے لے کر آئی۔ برتن جوں کے توں پڑے رہے۔ وہ الجھنوں میں پھنسی رہی۔

دن کافی نکل آیا تھا۔ وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔ آپا اس کے کمرے میں آئی۔ اس کو یوں پڑا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"طبیعت تو اچھی ہے ناہید بیٹی۔" وہ اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے بولی۔

ناہید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"کیا ہوا میرے لال۔" آپا نے جھک کر اس کی چاندی سی پیشانی چوم لی۔

"اماں" آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔

"ناہید کچھ تو کہو۔ کیا ہوا۔ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا۔"

اور ناہید نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان رات کا جاگتے میں دیکھا ہوا خواب آپا کو سنا دیا۔ جو اس کی حساس اور غیور طبیعت پر تازیانے کی طرح لگا تھا آپا کچھ دیر کشمکش و پیچ میں مبتلا رہی۔ ناہید اسے مشتبہ نظروں سے گھور رہی تھی۔ آپا کے لب ہلے وہ بول رہی تھی۔ اور ناہید سن رہی تھی زرینہ کی داستان حیات دہرائی جا رہی تھی۔ کچھ چھپانا فضول تھا۔ مہلک تھا۔ آپا نے ساری روداد اس کے گوش گزار کر دی۔ جب وہ سنا چکی تو ناہید اس کی گود میں ٹوٹی ہوئی ڈالی کی طرح گر گئی۔ اس کے کانوں سے ایک ہی لفظ ٹکرا رہا تھا۔

"طوائف"

"میری بچی" آپا نے اسے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا۔ "تمہاری رگوں میں شریف خون ہے اور اس خون کی حفاظت تمہیں کرنا ہو گی۔ مجھے امید ہے۔ کہ تمہارے کردار کی بلندی تمہاری ماں کی موجودہ زندگی سے متاثر نہیں ہو گی۔"

اس دن سے اس کی زندگی بدل گئی۔ اس انکشاف نے جیسے جان بہار پھول کا سارا رس نچوڑ لیا تھا۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر گئی۔ وہ اپنی سہیلیوں سے خوف کھانے لگی۔ وہ شریف گھرانے کی لڑکیوں سے ملتے ہوئے ہچکچانے لگی۔ اس کی آنکھوں کی ساری شوخی' اس کی طبیعت کی ساری جولانی مفقود ہو گئی...... اس کی آنکھوں میں اک بسمل سی بے چینی نے گھر کر لیا۔ اک خفیف سی گھبراہٹ رہنے لگی۔ جب کوئی اس کی طرف غور سے دیکھتا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کی ماں طوائف ہے۔ تاہم وہ ہر وقت گھبرائی گھبرائی رہنے لگی۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا۔ تو اس کی کتنی ذلت ہو گی۔

طوائف! اس کی ماں طوائف تھی۔

طوائف جو سماج کے سینے کا بڑا زہریلا زخم ہے۔ جو معاشرے کی چھاتی کا کریہہ گھاؤ ہے۔ زندگی کا چکر چلتا رہا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ناہید کا دماغ زندگی کی راہیں استوار کرنے میں مصروف رہا۔ مستقبل کا اک نصب العین بنا کر وہ پوری توجہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے میں مصروف ہو گئی۔

اس نے ایف۔ اے کر لیا۔ اک اعزاز کے ساتھ وہ کامیاب ہوئی لیکن اس نے اپنی کامیابی پر کوئی خوشی نہ منائی۔ خاموشی سے تھرڈ ایر کا داخلہ لے لیا۔

فیروز کی حریص نظریں اس کے جہاں سوز حسن کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کا توبہ شکن صبیح حسن اس کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اسے اپنے ماحول میں کھینچ لانا چاہتا تھا۔ اس کا دماغ اسے نیلام کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کے پاکیزہ وجود کو طوائفیت کا رنگ دینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

زرینہ کا شباب مٹ رہا تھا۔ اکتا دینے والے دن اور تھکا دینے والی راتوں نے اس کی صحت کو کچل ڈالا تھا۔ اس کا سینہ کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس کا دل خالی تھا۔ اور اس کھوکھلے سینے میں اس خالی دل میں اگر کوئی تمنا سسک رہی تھی۔ تو وہ ناہید کے روشن مستقبل کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ چند دنوں سے وہ فیروز کی بھکی ہوئی نظریں دیکھ رہی تھی۔ ناہید کے بی اے میں داخلہ لینے پر وہ اس سے کئی بار الجھ چکا تھا۔

"آخر اتنی تعلیم کی ضرورت کیا ہے۔"

"تمہیں ناہید کے بارے میں رائے دینے کا کوئی حق نہیں۔" زرینہ نے تلخی سے جواب دیا۔

"میں اب اسے مزید خرچ دینے کو تیار نہیں۔ اسے یہیں بلا لو۔"

"یہاں کی تو ہوا بھی اسے نہ لگنے دوں گی۔" اس نے غصے سے کہا۔ "رہا خرچ۔ تو روپیہ میرا خرچ ہو رہا ہے تمہیں اس سے کیا۔"

"زرینہ" فیروز غرایا۔ "خرچ کی بات نہیں۔ تمہاری صحت اب گرتی جا رہی ہے۔ جس کے باعث یہ دھندا ٹھنڈا پڑتا جا رہا ہے۔ پرانے گاہک آنکھیں بدل رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ اب تمہارا کام ناہید سنبھال لے۔ وہ جوان......"

"فیروز" وہ اس زور سے گرجی کہ فیروز کا دل دہل گیا۔ "یہ ناپاک خیال اپنے دل سے نکال دو۔ ناہید کا مقام اتنا بلند ہے۔ کہ تم اسے چھو بھی نہیں سکتے۔"

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا لیکن فیروز کی معیت میں اسے اٹھارہ سال ہونے کو آئے تھے۔ وہ اس کی بدطینتی سے آگاہ تھی۔ وہ جو ناپاک منصوبہ بناتا اسے عملی جامہ پہنا کر رہتا تھا۔ زرینہ ہر وقت ایک ہی سوچ میں کھوئی رہنے لگی۔ مسلسل سوچ اور دن رات کی ادھیڑ بن نے اسے نڈھال کر دیا۔ اسے بخار رہنے لگا۔ اس کی ہمت ٹوٹتی گئی۔ اعصاب تھکتے گئے۔ اور دو ماہ کے اندر اندر زرینہ چارپائی سے لگ گئی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اپنی بچی کو اس خبیث انسان سے کیسے بچائے۔" یہ سوال کبھی لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح اس کے دماغ پر لگتا۔ اور کبھی منجمد برف کے ٹھنڈے ٹھنڈے تودوں کی طرح دماغ کو یخ کر دیتا۔ اس کی اپنی زندگی تباہ ہو چکی تھی۔ اک مرد نے مذہب کی آڑ لے کر اس کی نسوانیت کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ اک دھنوان نے اس کی معصومیت سے اک غاصبانہ کھیل کھیلا تھا۔ ایک بے وفا مرد نے اس کے خلوص کو کچلا تھا۔ وہ خود جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ساری مصیبت زرینہ کی تنہا جان پر ڈال کر وہ کہیں کھو گیا تھا۔ زرینہ کی زندگی جل جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ اب اسی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں سے وہ ناہید کے مستقبل کی شمعیں فروزاں کر رہی تھی۔

زرینہ بیمار تھی۔ اور فیروز جان بوجھ کر تغافل برت رہا تھا۔ وہ اپنے راستے کی اس رکاوٹ کو جلد از جلد دور کر دینا چاہتا تھا۔ بیماری دیمک کی طرح اس سنگ گراں کو چاٹ رہی تھی۔ کھا رہی تھی اور فیروز خوش تھا۔ وہ زرینہ کی موت کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ جس کے سامان بڑی سرعت سے ہو رہے تھے۔

زرینہ کی حالت خطرناک حد تک بگڑ چکی تھی۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ مجبور ہو کر اس نے ناہید کو بلا بھیجا۔ ناہید آیا کے ساتھ آ گئی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اس عمارت میں آئی تھی۔ ایک الگ تھلگ کمرے میں پلنگ پر زرینہ پڑی موت کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ ماں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اس زمانے کی ٹھکرائی ہوئی مظلوم عورت پر شدت سے پیار آ گیا۔ وہ اس کی ماں تھی اس نے اسے جنم دیا تھا۔ ناموافق حالات سے برسرپیکار رہ کر اک بلند عزم کے تحت اس کی پرورش کی تھی۔ اک ظالم مرد کی سونپی ہوئی امانت کی جان پر کھیل کر حفاظت کی تھی۔

ناہید نے ڈاکٹروں کو بلوایا۔ حکیموں کو دکھایا۔ لیکن گرتی ہوئی دیوار کو کوئی سنبھالا نہ دے سکا۔ بجھتی ہوئی شمع تابانی کے ساتھ نہ چمک سکی۔ ناہید اور آیا نے اس کی خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کیا۔ لیکن زرینہ کے دن پورے ہو چکے تھے۔

وہ ایک اداس اور ویران رات تھی۔ نحیف و نزار زرینہ موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا الجھے الجھے سانس لے رہی تھی۔ زندگی ہار رہی تھی۔ اور موت غلبہ پا رہی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ آیا زرینہ کی روحانی تسکین کے لئے قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھی۔ اور ناہید روتی ہوئی آنکھوں سے گردش دوراں کے اس شکار کو دیکھ رہی تھی۔

زرینہ نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔

"امی" ناہید اس پر جھک گئی۔

"میری بچی" زرینہ کے منہ سے نکلا۔ اس نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھایا۔ انگلی میں ایک بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے انگوٹھی اتاری ناہید کا نرم اور گداز ہاتھ ہاتھوں میں لیا۔ اور

پھر اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی پہنا دی۔

"یہ تمہارے باپ کی نشانی ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"باپ.......... باپ" یہ لفظ اسے کچھ عجیب سا لگا.......... "باپ کی نشانی" وہ انگوٹھی کو دیکھ کر بڑبڑائی۔

زرینہ تڑپ اٹھی۔

"میں دنیا کی نظروں میں ثابت نہ کر سکی.......... لیکن.......... میری بات کا یقین کرو ناہید۔ تم ایک باپ کی جائز اولاد ہو..... یہ انگوٹھی اس نے شادی کے دن مجھے دی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے مذہب کی آڑ لے کر میری عصمت کا سودا کیا ہو۔ اور یہ انگوٹھی.......... میری دوشیزگی کی قیمت کے طور پر ادا کی ہو.......... لیکن.......... تم میرے الفاظ پر یقین کرو.......... ہم نے شادی کی تھی۔ اور.........."

جانے وہ اور کیا کہنا چاہتی تھی۔ کھانسی اٹھی..... اس کی الجھی الجھی سانسیں اکھڑ گئیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ ناہید کی آنکھوں سے تیزی کے ساتھ آنسو بہنے لگے اور آیا جلدی جلدی سے کلام پاک پڑھنے لگی۔

اور صبح ہونے سے پیشتر ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

زرینہ مر گئی۔ اور ناھید کو جیسے کچھ سکون مل گیا۔ اس کی ماں اس ذلیل پیشے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا گئی تھی۔ یہ خیال اس کے لئے وجۂ تسکین بن گیا۔

سیٹھ ہاشم زرینہ کے مرنے کی خبر سن کر آیا۔ اسی کی عمر پینتالیس سال سے کچھ متجاوز ہی تھی، لیکن نفس کی آگ دن بدن بھڑک رہی تھی۔ ناہید کو دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ اسے پا لینے کی آرزو میں جلنے لگا۔ دوسرے دن ہی اس نے اپنی اس ذلیل خواہش کا اظہار فیروز سے کر دیا۔ فیروز کے راستے کی رکاوٹ ہٹ چکی تھی۔ اس نے سیٹھ کو تسلی دی۔

"ذرا ماں کا غم غلط ہو لے۔ پھر آپ کے ہی قدموں میں رہے گی۔"

سیٹھ کا لغزش زدہ نفس مطمئن ہو گیا۔

ناہید جلد از جلد اپنے گھر عالم آباد واپس جانا چاہتی تھی۔ اس برہنہ ماحول سے وہ تنگ آ گئی تھی۔ ماں کی وجہ سے مجبوری کے عالم میں وہاں رہ رہی تھی۔ اب ماں مر چکی تھی وہاں ٹھہرنا بے مقصد تھا۔ اس نے آیا کو واپس چلنے کے لئے کہا۔ فیروز پاس ہی بیٹھا تھا۔ بڑی ملائمت سے بولا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے دسواں تو ہو لینے دو۔ پھر چلی جانا"

آیا اور ناہید دونوں چپ ہو گئیں۔

دسواں ہو گیا۔ ناہید نے پھر جانے کے لئے اصرار کیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اماں آج رات کی گاڑی سے واپس چلو۔ میری پڑھائی کا بڑا ہرج ہو رہا ہے۔ آپا نے گہری فکر مندی نظروں سے اسے دیکھا پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دے۔ فیروز بولا۔

"کہاں جاؤ گی"

"اپنے گھر"

"اس گھر کو اب اپنا گھر سمجھو"

"کیا مطلب؟"

"تمہاری ماں مر چکی ہے۔ اس کی خالی جگہ کو اب تمہیں پر کرنا ہو گا۔ تمہارا نام میں نے کالج سے کٹوا دیا ہے۔"

ناہید کو چھاتی میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ گئی۔ ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ دماغ سن ہو گیا۔ فیروز ظالمانہ مسکرایا۔

"گھبراؤ نہیں جلد ہی عادی ہو جاؤ گی۔ یہ تمہاری ماں کی غلطی تھی جو تمہیں اس ماحول سے دور رکھا۔ خیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

آپا خالی خالی نظروں سے دونوں کو دیکھتی رہی۔

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ کش مکش جاری رہی۔ فیروز نرمی سے اسے سمجھاتا رہا۔ ترغیب گناہ دیتا رہا۔ آمادۂ لغزش کرنے کی کوشش کرتا رہا' لیکن جب ناہید کا آہنی کردار متزلزل نہ ہو سکا تو وہ سختی پر اتر آیا۔ سیٹھ ہاشم سے پانچ ہزار پر ناہید کی عصمت کا سودا کر لیا' لیکن قدرت کو شاید ناہید کی بے بسی پر رحم آ گیا۔ آپا فرشتۂ رحمت بن کر اسے اس گندے گڑھے سے نکال کر لے گئی۔ فیروز کف دست ملتا رہ گیا۔

..............○..............

۳

اونچی نیچی سبز پوش پہاڑیوں کے دامن میں سلطان پورہ کا خوب صورت شہر آباد تھا۔ صاف ستھری سڑکیں۔ کشادہ گلیاں پر رونق بازار' آراستہ پیراستہ دو کانیں سلطان پور کی زینت کو بڑھاتے تھے۔ یہاں کی آبادی تو کچھ زیادہ نہ تھی' لیکن زندگی کے سارے لوازمات یہاں موجود تھے۔ لوگ محنتی اور جفاکش تھے۔ محنت اور جفاکشی ان کی خوش حالی کی ضامن تھی۔ یہاں باغات کی کثرت تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشموں کی افراط تھی۔ دور دور سے لوگ سیر و تفریح کے لئے یہاں آتے تھے۔ قدرت نے یہاں حسن جی کھول کر لٹایا تھا۔ دریائے سطیر بل کھاتا لہراتا کہیں بلند و پست پہاڑیوں پر سے اچھلتا کودتا کہیں اونچائیوں سے سر کے بل گر کر چیختا چنگھاڑتا کہیں ہمواریوں کے سینے پر خراماں خراماں چلتا سلطان پور کے حسن میں اضافے کا باعث تھا۔

آبادی سے ذرا ہٹ کر اونچے اونچے دیو قامت درختوں کے جھرمٹ میں قصرِ رعنا کی خوب صورت اور شان دار عمارت کسی پراسرار حسینہ کی طرح کھڑی تھی مرمریں ستونوں اور سفید گنبدوں والی یہ عمارت اپنے مکینوں کے وقار عظمت اور جاہ و جلال کی مظہر تھی۔ شاندار باغ اس کے تمام تر حسن کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا۔ خوب صورت اور دلآویز چمن۔ بہترین پھولوں سے مزین کیاریاں نوکیلی کانٹے دار جھاڑیوں سے والہانہ لپٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیلیں۔ جگہ جگہ تمکنت سے استادہ مرمریں مجسمے۔ خوب صورت حوض باغ کی خوب صورتی کو بڑھاتے تھے۔

قصرِ رعنا بہترین ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ انگلینڈ فرانس اور دیگر کئی بیرونی ممالک سے اکٹھے کئے ہوئے نوادرات اس محل کی شان کو دوبالا کرتے تھے۔ دیکھنے والے کی عقل حیرت میں پڑ جاتی تھی۔ سرخ بجری والی سڑک سرو و شمشاد کے درختوں میں سے ہوتی ہوئی قصرِ رعنا کے قدموں میں مچلتی ہوئی گزرتی تھی۔ یہاں سے چند زینے طے کر کے طویل بر آمدوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ چمکیلے فرشوں پر نرم اور موٹے موٹے قالین پڑے تھے۔ محرابی دروں میں سنہری ٹوکریوں میں سبز سبز گھاس کے گملے کچھ عجب بہار دیتے تھے۔ ان بر آمدوں کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عقب میں کشادہ اور آراستہ کمرے تھے۔ درمیان میں بڑی نفاست سے سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ یہ ڈرائنگ روم قصر رعنا کے دل کی حیثیت رکھتا تھا۔ قالین گداز صوفے، قیمتی لہراتے ہوئے پردے، چمکیلے اور منقش گلدان غرضیکہ وسیع کمرہ دلہن کی طرح آراستہ تھا۔

اس وسیع محل کے ایک پہلو میں چند کمرے دفتر کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔

یہ محل نواب منصور علی خاں کی رہائش گاہ تھی۔ نواب موصوف ایک مخیّر اور ہمدرد انسان تھے۔ اپنے بے پناہ مردانہ حسن۔ اپنی ضرب المثل فراخدلی۔ اپنے مشعل راہ کردار کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ حسنِ صورت اور حسن سیرت نے مل کر ان کی شخصیت کو شش انگیز اور جاذب النظر بنا دیا تھا۔ یہ چھبیس سالہ نوجوان ہر طبقے میں ہر دلعزیز تھا۔

نواب منصور کے والد نواب افتخار علی خاں وجاہت اور شجاعت کے پیکر تھے۔ منصور ابھی عمر کی چند ہی بہاریں ان کے دامن تلے گزارنے پائے تھے کہ موت کا بے رحم ہاتھ انہیں اچک کر لے گیا۔ منصور تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیئے گئے۔ اور والدہ کی موت کا صدمہ ان کے ناپختہ ذہن سے محو ہوتا گیا۔ ان کی عدم موجودگی میں جاگیر کا سارا انظام معتبر ملازمین کی اعانت سے والدہ نے سنبھالے رکھا۔ وہ ایک وجیہہ اور باوقار خاتون تھیں۔ منصور بیس بائیس برس کی عمر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹے، لیکن شفقت مادری سے اچھی طرح لطف اندوز ہونے بھی نہ پائے تھے کہ بیمار پڑ گئیں۔ دعاؤں اور دواؤں کا اثر نہ ہوا۔ اور وہ اپنے عزیز بیٹے کے سہرے کے پھول دیکھنے کی حسرت دل میں لئے عالم جاودانی کو سدھار گئیں۔

ان کی مفارقت کا صدمہ منصور کی حساس طبیعت نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ دنیا ان کی نظروں میں اندھیر ہو گئی، لیکن وقت ایسے ایسے گھاؤ بھرتا ہی آیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ طبیعت سنبھلتی گئی۔ ماں کی موت اک ان مٹ خلش بن کر رہ گئی۔ اور منصور زندگی کے میدان میں آگے بڑھتے رہے۔ ماں کے بعد ان کی محبت اپنی بڑی بہن یاسمین پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔

یاسمین عمر میں ان سے دو سال بڑی تھیں۔ دوشیزگی میں ضرور چنچل اور شوخ ہوں گی لیکن عمر نے چنچل پن کو سنجیدگی میں بدل دیا تھا۔ وہ ایک سلجھی ہوئی بامذاق اور باذوق خاتون تھیں۔ ان کی شادی نواب صدیق علی خاں آف ناظم پور سے ہو چکی تھی۔ وہ ان کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ تین پیارے پیارے خوب صورت اور گول مٹول بچے ان کی ازدواجی زندگی کو پُر بہار بنائے ہوئے تھے۔

منصور اور یاسمین میں بے انتہا محبت تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے قصر رعنا آتیں۔ ان کی آمد سے محل میں اک چہل پہل سی ہوتی۔ نواب منصور کی ساری دلچسپیاں ان کے بچوں پر مرکوز ہو جاتیں۔

پچھلے دنوں یاسمین آئی ہوئی تھیں۔ محل کے خاموش در و دیوار کا جمود ٹوٹ گیا تھا۔ قہقے بکھر رہے تھے۔

ہنسیاں پھوٹ رہی تھیں۔ سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں لیکن ابھی انہیں آئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ نواب صدیق علی خاں کا فون آیا۔ وہ چند دنوں کے لئے نیویارک جا رہے تھے۔ یاسمین کو بھی ہمراہ لے جانا چاہتے ہیں تفریح کے سارے پروگرام ادھورے چھوڑ کر انہیں واپسی کی تیاری کرنا پڑی۔ جلدی جلدی سامان باندھا جا رہا تھا۔ ملازمہ کپڑے تہہ کر کے بڑے بڑے چرمی بکسوں میں رکھ رہی تھی۔ یاسمین مخملی صوفے پر بیٹھی اسے ضروری ہدایات دے رہی تھیں۔ بچوں کی ڈچ گورنس ننھے شاہین کو سرخ اونی سیٹ پہنا رہی تھی...... اور منصور خاموشی سے جانے والوں کی تیاریاں دیکھ رہے تھے۔

"امی حضور" سات سالہ سمیرا نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

"کیا بات ہے" یاسمین نے پوچھا۔

"امی حضور مجھے یہیں چھوڑ جایئے نا۔"

"کیوں؟"

"بس...... ماموں حضور۔ کیسے نامی سے۔" وہ منصور سے لپٹ گئی۔ منصور مسکرا دیئے۔

"نہیں بیٹا...... پھر آجائیں گے"

"چھوڑ جایئے نا باجی۔ ابھی چند دن تو ہوئے ہیں انہیں آئے ہوئے۔" منصور نے سفارش کی۔ بچی خوشی سے ناچنے لگی۔

"میں بھی نہیں جاؤں گا"۔ چار سالہ فریدوں سینہ تان کر بولا۔

سب ہنس دیئے۔

"امی حضور اجازت ہے"۔ سمیرا ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"لو ان کو دیکھو۔ دونوں باغی ہو گئے۔"

"ہرج بھی کیا ہے۔ آپ کی واپسی پر میں انہیں لے کر آجاؤں گا ایک دم سب کے چلے جانے سے میری طبیعت بھی اچاٹ رہے گی۔ یہ گھر بالکل سونا ہو جاتا ہے ان کے جانے کے بعد۔"

"گھر کو آباد کیوں نہیں کرتے" یاسمین نے منصور کو دیکھ کر دبا سا قہقہہ لگایا۔ ان کے خوب صورت دانت گلے میں پڑی ہوئی سچے موتیوں کی مالا سے زیادہ آب دار تھے۔ بہن کے دل میں بھائی کی شادی کی لگن تھی۔ جب بھی وہ شادی کا ذکر کرتیں منصور بڑی خوب صورتی سے اس تذکرے کو ٹال جاتے تھے۔

خاندان کی چیدہ چیدہ لڑکیاں۔ بلند مرتبہ باپوں کی حسین بیٹیاں ان کی زندگی میں داخل ہونے کے لئے کوشاں تھیں۔ لیکن منصور کے ذہن میں رفیقۂ حیات کا جو اچھوتا معیار تھا۔ اس پر آج تک کوئی بت طناز پورا نہ اتر سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کا معاملہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ماموں حضور" دونوں بچے ان سے لپٹے جا رہے تھے۔ "کہئے نا امی سے۔"

"بھئی کہہ تو دیا میں نے۔"

"کیا خیال ہے مس ڈی سوزا" یاسمین نے بچوں کی گورنس کو مخاطب کیا۔

"جیسے آپ کی مرضی" وہ ادب سے بولی۔

"چلو بچو چھٹی ہوئی" منصور نے بچوں کو الگ کرتے ہوئے کہا۔ بچے خوشی سے ناچتے کودتے کمرے سے باہر نکل گئے۔ مس ڈی سوزا نے جلدی جلدی بچوں کا سامان الگ کیا۔

انگوراوول کے سرخ نیٹ میں ننھا شاہین بے انتہا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ ہمک ہمک کر منصور کی طرف آنے لگا۔

"نہیں بھئی آپ نہیں" منصور اس کے پیازی پیازی گال کو تھپتھپانے لگے "آپ اپنی امی کے ساتھ تشریف لے جائیے۔"

تھوڑی دیر بعد دونوں بہن بھائی پورٹیکو میں کھڑی ہوئی موٹر کے پاس کھڑے تھے۔ ڈرائیور دروازہ کھول کر ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ یاسمین منصور سے مل کر موٹر میں جا بیٹھیں۔ شاہین اب بھی منصور کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اور آیا کی گود سے مچل مچل کر باہر آنے کی کوشش میں تھا۔

"میرا خیال ہے واپسی پر ہم زلفی چچا کے پاس لندن ٹھہریں گے۔"

"اگر بھائی جان کو واپس آنے کی جلدی ہوئی تو" منصور موٹر کے دروازے کو پکڑے کھڑے تھے۔

صدیق علی خان ایک مصروف انسان تھے۔ آئے دن انہیں لندن اور نیویارک کاروبار کے سلسلہ میں جانا پڑتا تھا، لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ وہ زلفی کے پاس چند گھنٹے ہی قیام کرنے کے بعد چلے آتے تھے۔

"نہیں بھئی میں تو ضرور ٹھہروں گی۔ زلفی چچا کو ملے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اس دفعہ تو تم بھی ان کے پاس نہیں جا سکے۔"

"میرا کیا۔ جب جی چاہا پہنچ جاؤں گا۔"

یاسمین کچھ سوچ کر بولیں۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ ہمارے قیام لندن کے دوران تم بھی آ جاؤ۔ اللہ قسم منصور بڑا لطف رہے گا۔"

"واقعی"

"زلفی چچا بڑے خوش ہوں گے۔"

"وہ تو ظاہر ہی ہے۔"

کچھ دیر تک زلفی چچا کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ یاسمین نے پیار سے منصور کے کندھے پر ہاتھ رکھا وہ تعظیماً

جھک گئے۔ بہن نے ایک شفقت آمیز بوسہ ان کے گھنے گھنگھریالے بالوں پر دیا۔ اور رخصت ہو گئیں۔

دونوں بچے وہیں رہ گئے۔ وہ سارا سارا دن کھیلتے رہتے۔ کبھی حسین تتلیوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، کبھی رنگین مچھلیوں کو پکڑ رہے ہیں، صرف اتنی ہی دیر آرام سے بیٹھتے جتنی دیر مس ڈی سوزا پڑھائی کے لئے انہیں کمرے میں مقید رکھتی۔ منصور بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ شاداں و فرحاں بچے انہیں اپنی زندگی کے وہ دن یاد دلاتے تھے۔ جب وہ اور یاسمین انہیں بوڑھے درختوں کے سایوں تلے کھیلا کرتے تھے۔ گرمیوں میں آفتاب کی حدت سے بے خبر، سردیوں میں برف کی منجمد برودت سے لاپرواہ۔ اور اسی لاپرواہی اور بے خبری پر انہیں ان کی بوڑھی انگریز نگراں مسز الٹر سزا کے طور پر کمرے میں بند کر دیا کرتی تھیں۔ اور ان کے ننھے ننھے دماغ کوئی نئی شرارت سوچنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

نواب ذوالفقار علی خان منصور کے چچا تھے۔ تعلیم کے سلسلہ میں انہیں ولایت بھیجا گیا تھا لیکن جانے دیارِ غیر کی ہوا انہیں کیوں راس آ گئی۔ وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے ان کی جاگیر دولت آباد میں تھی۔ اور اس کا انتظام ان کی عدم موجودگی میں سرفراز کے سپرد تھا۔ وہ ایک مخلص اور معتمد انسان تھا۔ ایمان داری سے کام کو سنبھالے ہوئے تھا۔ دولت آباد ہی میں قصر فردوس تھا۔ جس میں ذوالفقار تو نہیں رہتے تھے۔ دور پار کے کچھ عزیز تھے جو اس محل کو آباد کئے ہوئے تھے۔

لندن کے ایک پرسکون گوشے میں ان کی خوب صورت محل نما کوٹھی تھی جہاں اپنے ملکی ملازموں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے۔ ان کی عمر کوئی چالیس برس کے لگ بھگ تھی، لیکن بے فکر زندگی اور دولت کی فراوانی سے ان کی صحت قابل رشک حد تک اچھی تھی۔ شکار کھیلنا اور بڑی بڑی دعوتیں دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کا دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ اور وہ اپنے دوستوں میں بڑے مقبول تھے وہ خوش خلق تھے۔ باذاق تھے۔ اسی لئے اپنے احباب میں اک نمایاں مقبولیت کے حامل تھے۔

سال میں صرف ایک مرتبہ وہ سلطان پور آتے۔ اور وہ موقعہ ہوتا منصور کی سالگرہ کا۔ دنیا میں سوائے منصور اور یاسمین کے ان کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔ دونوں بہن بھائی بھی انہیں بے حد چاہتے تھے۔ ان کی سلطان پور میں آمد ان کی خوشیوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ وہ خود بھی ہنستے تھے اوروں کو بھی ہنسایا کرتے تھے "جینا ہے تو ہنس کے جیو" کے مقولے پر کاربند تھے۔

ان کی آمد پر قصر رعنا میں زندگی کی سوئی ہوئی لہر بیدار ہو جاتی۔ رونقیں جاگ اٹھتیں۔ نئے نئے پروگرام بنتے۔ دعوتیں دی جاتیں۔ ادبی محفلیں منعقد ہوتیں۔ وہ بھوپال کے جنگلوں میں شکار کے لئے جاتے۔ سمندر کے کنارے تفریح کے لئے جاتے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ مہینہ بھر رکتے، لیکن ان تیس دنوں میں ہزار ہا مصروفیتیں ہوتیں اور جب وہ چلے جاتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی چلتے چلتے رک گئی ہو منصور کی طبیعت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ان دنوں اداس رہتی اور پھر صبح و شام کا وہی گھسا پٹا معمول شروع ہو جاتا۔

اور کچھ اسی قسم کے مشاغل منصور کے لندن جانے پر ہوتے۔ زلفی اپنے عزیز بھتیجے کی آمد پر اپنے مشرقی اور مغربی دوستوں کو مدعو کرتے۔ کبھی شکار کے لئے افریقہ کے جنگلوں میں لے جاتے۔ کبھی سوئٹزرلینڈ کی گل پوش اور برف پوش پہاڑیوں میں گھماتے۔ غرضیکہ زندگی میں اک ہل چل سی مچ جاتی۔

منصور ان کے انگریز دوستوں میں بڑے مقبول تھے۔ لارڈ ہیرٹ 'مسٹر پیٹر' جان مکالے تو ان کی آمد کے بڑے شوق سے منتظر رہا کرتے تھے۔ لارڈ ہیرٹ کی صاحب زادی مس روبی تو ان کی پرستار تھی۔ مشرقی حسن کا یہ نادر نمونہ اس کے خیالوں کی دنیا پر چھایا رہتا تھا۔ سنہری بالوں اور نیلی نیلی آنکھوں والی یہ حسین گڑیا چپکے چپکے منصور کو چاہے جا رہی تھی۔ لیکن منصور اس کے لطیف احساسات سے بے خبر تھے۔ وہ ان کے دوست تھے۔ اور دوستی سے آگے بڑھنے کا خیال بھی کبھی ان کے وہم میں نہ آیا تھا۔

پچھلے سال منصور و یاسمین چند دنوں کے لئے لندن گئے تھے۔ ایک بہت بڑی پارٹی ان کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ کھانے کے بعد مہمان ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے۔

"مجھے آپ کا گھر دیکھنے کا بڑا شوق ہے" مس روبی نے بڑے شوق سے منصور سے کہا۔

"کبھی تشری لائیے نا۔ ہمیں بڑی مسرت ہوگی۔"

"یہی تو دقت ہے کیسے آؤں۔ کب آؤں۔"

"منصور کی شادی پر آئیے گا روبی" یاسمین نے کہا" ہمارے ہاں کی شادی بھی آپ کے لئے باعث مسرت ہوگی۔"

منصور مسکرا دیئے۔ اور روبی کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ اس نے اک گہری سانس بھر کر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ یاسمین نے سنجیدہ نظروں سے اس کے چہرے پر چھا جانے والے سایوں کو دیکھا۔ اس کے دل کی کیفیات ان سے چھپی نہ رہ سکیں۔ لیکن وہ خاموش ہی رہ گئیں۔ منصور کے نظریئے کو وہ جانتی تھیں۔ روبی پر سوائے ترس کھانے کے وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔

۴

ایکسپریس ٹرین رات کے تاریک سینے کو چیرتی اڑتی چلی جا رہی تھی۔ مسافر اونگھ رہے تھے۔ کچھ غافل سو رہے تھے۔ طبقاتی امتیاز نمایاں تھا۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں مسافر بڑے ٹھاٹھ سے سو رہے تھے۔ جو ریل کے شور کی وجہ سے سو نہ سکے تھے' پاؤں پسارے سیٹوں پر لیٹے تھے۔ تھرڈ کے ڈبوں میں مخلوق کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سیٹیں پر تھیں۔ میلی میلی گٹھڑیوں کو سروں پر رکھے مسافر جگہ کے لئے لڑ رہے تھے۔ اک ہنگامہ بپا تھا۔ جو مسافر جگہ حاصل کر چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو پھیلا کر زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ شور سے کسی کی بات سنائی نہ دیتی تھی۔ اس شور سے لاپرواہ گاڑی چلی جا رہی تھی۔ ہر سٹیشن پر وہ جتنی بھیڑ اگلتی اس سے کہیں زیادہ بھیڑ اس کے پیٹ میں سما جاتی۔ اور گاڑی اس زائد بوجھ پر چیختی چلاتی چلی جا رہی تھی۔

تھرڈ کے ایک زنانہ ڈبے میں آیا اور ناہید سوار تھیں۔ جگہ تو نہیں تھی۔ لیکن آیا نے ذراہمت کر کے ایک کونے میں ناہید کے لئے جگہ بنا کر اسے بٹھا دیا تھا۔ خود اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد اسے دنیا کی نظروں سے چھپانا تھا۔ لیکن یہاں اس ہڑبونگ میں کسی کو ناہید کے متعلق سوچنے کی کیا پڑی تھی۔ ہر ایک کو اپنے کام کے سوا کسی سے کوئی کام نہ تھا۔ پھر بھی بوڑھی آیا نے احتیاطی تدابیر برتتے ہوئے اسے چھپا رکھا تھا۔

ناہید گم سم بیٹھی تھی۔ اس کے خیالات بھٹک رہے تھے۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ تھرڈ ایر کی طالبہ تھی۔ زندگی کا ایک سیدھا سادا پلان بنا کر وہ تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھی' لیکن ماں کے مرنے کے بعد تو اس کی زندگی کی بنیادیں تک ہل گئی تھیں۔ فیروز نے اس کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیا تھا۔ اب وہ آیا کے ساتھ جا رہی تھی۔ "کہاں" یہ وہ نہ جانتی تھی۔ ایک نامعلوم منزل تھی۔ جس کی طرف وہ جانے پر مجبور تھی۔ "جب ایک سوچی سمجھی منزل کا نشان نہ مل سکا تو اس انجان منزل کا کیسے پتہ ملے گا" وہ کچھ یہی سوچ رہی تھی۔

فیروز ابھی تک اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ وہ سر کو کئی بار جھٹک کر اس کے خیال سے چھٹکارا پانے کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کوشش کر چکی تھی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

"اگر وہ پھر کہیں سے آگیا تو کیا ہو گا" اس تصور ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کا دل لرز اٹھا۔ اس نے گھبرا کر آپا کی چادر پکڑلی۔ آپا نے مڑکر دیکھا "سو جاؤ" آپا نے ناہید کی آنکھوں کو دیکھا۔ جو شدت گریہ سے سوج گئی تھیں۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے اماں"

آپا نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"کتنا حبس ہو رہا ہے۔ کھڑکی کھول دو۔ طبیعت کچھ بہل جائے گی۔"

ناہید اسی طرح سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ وہ فیروز کے خیال سے خوف کھا رہی تھی اور آپا کی جہاندیدہ نظریں سب کچھ سمجھ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی دوسری سیٹ پر کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی عورت چلائی۔

"اے ہے اتنی ٹھنڈ ہے۔ کھڑکی کھول دی تم نے۔ سرد ہوا سینہ چیر رہی ہے۔ تم نے تو گرم کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ہمارا بھی کچھ خیال کرو۔"

"اماں بند کر دو" ناہید نے کہا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سے اسے قدرے سکون ملا تھا۔ لیکن وہ لڑائی سے ڈرتی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ تھرڈ کلاس میں عورتیں باتوں باتوں ہی میں لڑتے لڑتے ہاتھا پائی تک نوبت لے آتی ہیں۔

آپا نے کھڑکی پھر بند کر دی۔

"کہاں جانا ہے تمہیں" آپا نے اس عورت سے پوچھا۔

"بس اگلے سٹیشن پہ اترنا ہے" وہ عورت ناہید کو دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھی "میری جگہ پہ تم بیٹھ جانا۔ تمہیں کہاں جانا ہے۔"

"چاند گاؤں"

"صبح پہنچو گی تم تو"

"ہاں سحری ہوگی۔ چار پانچ بجے پہنچتی ہے وہاں گاڑی۔"

"میں اتروں گی تو تم جگہ لے لینا" وہ بڑی فراخدلی سے آپا پر احسان کر رہی تھی "۔ میرا تو تھوڑا سا سفر باقی ہے" پھر وہ اپنے میلے میلے کپڑے سمیٹنے لگی۔

"یہ تمہاری کیا لگتی ہے" وہ ناہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ آپا خاموش رہی۔

"بیٹی ہے"

"ہاں" مختصر سا جواب دے کر آپا چپ ہوگئی۔ اس وقت وہ کسی گفت گو میں الجھنا نہ چاہتی تھی۔ رات کے واقعہ سے اس کا دماغ بھی متاثر تھا۔ وہ اس وقت ذہنی تھکن محسوس کر رہی تھی۔

سٹیشن آگیا۔ بھیڑ قدرے کم ہوگئی۔ سیٹیں خالی ہوئیں۔ بیٹھی ہوئی سواریاں پاؤں پسار کر لیٹ گئیں۔ آپا نے بھی ایک سیٹ پر قبضہ کر لیا۔ خالی تختے چبھ رہے تھے۔ آپا نے ناہید کا کوٹ سیٹ پر بچھا کر اسے لٹا دیا۔ کالی شال اس کے اوپر ڈال دی اور کھڑکی پھر کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ناہید کے تپتے ہوئے دماغ کو فرحت بخشی۔ باہر رات سیاہ تھی۔ ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ اور ڈبے کے اندر چھت سے چمٹے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے قمقمے دھندلی روشنی بکھیر رہے تھے۔

"اب تو جگہ کافی ہے تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

"نہیں اماں مجھے نیند نہیں آرہی۔"

"آنکھیں بند کر لو خود ہی نیند آجائے گی۔ کب تک جاگو گی۔ ابھی تو سفر بہت ہے کیا بجا ہو گا۔"

ناہید نے کلائی پر بندھی ہوئی چھوٹی سی خوب صورت گھڑی دیکھی۔

"بارہ بجنے والے ہیں"

دوسری سیٹ پر سوئی ہوئی عورت نے کروٹ بدلی۔ اور نیند سے بھری ہوئی آنکھیں کھول کر اس حسن سوگوار کو دیکھا۔ نیند کا غلبہ تھا۔ پلکیں دو چار بار جھپکا کر پھر غافل ہوگئی۔ آپا ناہید کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اس کی کنپٹیاں سہلانے لگی۔ ناہید کو اک کیف آگیں سرور ملنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تپتی ہوئی سرخ آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔ آپا اس کا سر سہلاتی رہی۔ اور کچھ دیر بعد وہ اس کی گود میں سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔

آپا کا تھکا ہوا دماغ مستقبل کا خاکہ بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک ناہید کے گھنے بالوں میں الجھے ہوئے تھے۔

ناہید نے کروٹ لی۔ سوئی سوئی آنکھوں سے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دو بج رہے تھے۔ وہ پھر غافل ہوگئی۔ آپا کی آغوش میں پھیلے ہوئے شفقت اور سکون نے اس کی تھکی ہوئی روح کو بڑی حد تک تسکین دی۔

دوسری سیٹ پر لیٹی ہوئی عورت کا بچہ لڑھک کر نیچے گر گیا۔ وہ زور سے چیخا ماں ہڑبڑا کر اٹھی۔ بچے کو اٹھا کر سیٹ پر زور سے پٹخا۔ بچہ اور زور سے رویا۔

"کم بخت نہ دن کو آرام کرتا ہے۔ نہ رات کو۔ چپ ہو جا" وہ ایک دو ہتڑ اس کے سر پر جماتے ہوئے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بولی۔

"سوئے گا یا نہیں" اسے اپنی نیند کے ٹوٹ جانے پر شاید غصہ آرہا تھا۔

"کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی" بچہ زور زور سے چلانے لگا۔

آپا نے اس خیال سے کہ ناہید کی نیند خراب نہ ہو کہا۔

"بہن پیار کرلو اسے۔ ایک تو گر گیا۔ دوسرا تم مار رہی ہو۔"

"تمہیں کیا ہے۔ میرا اپنا بچہ ہے چاہے میں ماروں چاہے پیٹوں" وہ گنوار عورت بگڑ کر بولی۔

"گھر میں تو نہیں بیٹھی ہو" آپا کو بھی غصہ آگیا۔ "کم از کم دوسروں کے آرام کا بھی خیال رکھنا چاہئے"

"اتنا ہی آرام کا خیال تھا۔ تو فرسٹ کلاس میں سفر کرتیں۔ اس ڈبے میں کیوں بیٹھی تھیں۔"

کون جانے یہ تھرڈ کا سفر اس نے کس مصلحت کے تحت کیا تھا۔

اس عورت نے اتنا شور مچایا۔ کہ دوسری سیٹوں پر اونگھتی ہوئی عورتیں آنکھیں مل مل کر اسے دیکھنے لگیں۔

"بڑی آئی نصیحت کرنے والی"۔ وہ اپنے میلے کپڑوں کی گٹھڑی سر کے نیچے جماتے ہوئے لیٹ گئی۔

آپا کوئی جواب سوچنے بھی نہ پائی تھی' کہ اک دھماکہ ہوا فضا چیخوں سے تھرا اٹھی۔

ٹرین مال گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔

کئی جانیں تلف ہو گئیں۔ مجروح اور مردہ سب اکٹھے پڑے تھے۔ کوئی دم توڑ رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ کوئی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اگلی تین بوگیاں بالکل تباہ ہو گئی تھیں۔ پچھلے ڈبوں کے مسافر خوف سے کپکپا رہے تھے۔ کچھ دہشت سے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔

یہ جانکاہ حادثہ سلطان پور سے تین میل آگے ہوا۔ حادثے کی خبر بجلی کی لہر کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ لوگوں کا ہجوم جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ ایمبولینس گاڑیاں آئیں۔ شہریوں کی مدد سے زخمیوں اور مرنے والوں کو الگ کیا گیا۔ زخمی ہسپتال لائے گئے۔ اور مرنے والوں کو مردہ خانے میں لاڈالا گیا۔

اس خوف ناک حادثے کی خبر پاتے ہی نواب منصور علی خان مع اپنے سٹاف کے پہنچ گئے۔ جگہ کا معائنہ کیا۔ زخمیوں کو دیکھا۔ اور اپنی گرہ خاص سے پچیس ہزار کا چیک زخمیوں اور تباہ شدگان کی امداد کے لئے دیا۔

ان کی پرزور اپیل پر شہر بھر کے ڈاکٹر ہسپتال میں جمع ہو کر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے لگے۔ ڈاکٹروں کی بروقت اعانت سے ہسپتال کے ڈاکٹروں کو بڑی سہولت ہوئی۔ ڈاکٹر حمان ہسپتال کے انچارج تھے دوپہر تک سب زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاچکی تھی۔

حادثے کو دو دن گزر گئے۔

سورج کی الوداعی کرنیں ہسپتال کی سنگین عمارت کو بوسہ دے رہی تھیں۔ نیلے نیلے آسمان پر جا بجا بادلوں کے آوارہ ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وارڈ نمبر تین میں کئی زخمی عورتیں پڑی تھیں۔ نرس میز کے قریب کھڑی بستروں پر پڑی ہوئی بے ہوش عورتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اک سہما ہوا سکوت چھایا ہوا تھا۔ دروازہ آہستگی سے کھلا۔ ڈاکٹر حمان ہاتھ میں اسٹیتھو سکوپ لئے اندر داخل ہوا۔ نرس تعظیم سے ایک طرف ہٹ گئی۔

"ہوش آیا" معمر ڈاکٹر نے بستر نمبر ۵ کی طرف اشارہ کیا۔

"ابھی تک تو نہیں آیا" نرس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا سفید پردہ کھینچ دیا۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا چھا گیا۔ اس نے بتی جلادی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔

"زخم تو زیادہ نہیں آئے دہشت سے بے ہوش ہو گئی ہیں" ڈاکٹر بستر نمبر ۵ پر جھکتے ہوئے بولا "ہوش آجانا چاہئے اب تو...... دو دن گزر گئے ہیں۔"

نرس خاموشی سے دیکھتی رہی۔

تیسرے پلنگ پر ایک عورت چلائی۔ ڈاکٹر اور نرس دونوں اس کی طرف بھاگے۔

وہ عورت بری طرح زخمی تھی۔ سر میں کافی چوٹیں آئی تھیں۔ ایک بازو بھی ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے نرس کو دوائی لانے کو کہا چند منٹ بعد نرس دوائی لے کر آگئی اور اس عورت کو بدقت پلائی۔ عورت کچھ دیر شور مچاتی رہی اور پھر غافل سو گئی۔

"توبہ" نرس اس کی تکلیف سے بڑی متاثر نظر آرہی تھی۔

"بڑا خوف ناک حادثہ ہوا ہے" ڈاکٹر حمان متفکرانہ زخمیوں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔"

"ہاں"

"بعض زخمیوں کی حالت تشویش ناک ہے۔"

"وارڈ نمبر ۲ کے تو سب مریض ہی بری حالت میں ہیں۔ خدا ہی رحم کرے۔"

ڈاکٹر بولا۔ "میرا خیال ہے دو چار ہی جانبر ہو سکیں گے۔"

"ان کے رشتہ داروں کو مطلع کیا گیا ہے۔"

"کئی تو یہاں پہنچ بھی گئی ہیں۔ ابھی ابھی تین مرنے والوں کے رشتہ دار آئے تھے۔ میرا تو دل بیٹھنے لگا تھا ان کی آہ و زاری سن کر" ڈاکٹر جو موت و زندگی کی کش مکش دیکھنے کا عادی تھا۔ اس وقت بڑا پریشان ہو رہا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ پھر بستر نمبر ۵ کی طرف آ گیا۔ کچھ دیر نبض ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔

"نبض تو ٹھیک چل رہی ہے۔"

نرس نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن تو دیکھی۔ اور امید افزا لہجے میں بولی۔

"دل بھی ٹھیک ہے۔ سانس بھی ٹھیک چل رہی ہے۔ ہوش میں آنے والی ہیں۔"

"ان کی حالت مخدوش نہیں۔ جب ہوش آئے تو مجھے اطلاع دینا۔"

ڈاکٹر کمرے پر اک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف چل دیا۔

"بہت بہتر" نرس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر صبح سے وارڈوں میں گھوم رہا تھا۔ مخدوش زخمیوں کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ ہر امکانی کوشش انہیں آرام پہنچانے کی کی جا رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ قدرت نے اسے ایک ہمدرد اور دردمند دل عطا کیا تھا۔ اس ہسپتال کو پندرہ سال سے وہ انچارج کی حیثیت سے سنبھالے ہوئے تھا۔ ہزاروں بیمار اس کی توجہ سے شفایاب ہو چکے تھے۔ غریبوں کے ساتھ اس کا سلوک فیاضانہ تھا۔ اس لئے وہ بڑا ہر دلعزیز ڈاکٹر تھا۔ ہسپتال کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے خوب صورت بنگلے میں وہ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ بڑی خوش حالی سے زندگی گزار رہا تھا۔ دو لڑکیاں اور ایک بیوی اس کے خاندان کے افراد تھے۔

بستر نمبر ۵ کے زخمی نے حرکت کی۔ نرس جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس گئی۔

ناہید نے آنکھیں کھول دیں۔ اجنبی در و دیوار' ان دیکھا کمرہ۔ کھڑکیوں کے سفید لرزتے ہوئے پردے۔ وہ حیران آنکھوں سے اپنے گرد و پیش دیکھنے لگی۔ اس نے کئی بار آنکھیں جھپکائیں۔ تھکا ہوا دماغ کچھ نہ سمجھ سکا۔

نرس تیزی سے باہر نکل گئی۔ واپسی پر ڈاکٹر حمان جلدی جلدی قدم اٹھاتے اس کے ہمراہ آ رہا تھا۔ وہ دونوں ناہید پر جھک گئے۔ وہ ششدر سی انہیں دیکھنے لگی۔ اس نے ہاتھ اٹھانا چاہا۔ جو پٹیوں کی بندش کی وجہ سے بھاری ہو رہا تھا۔ سارے بدن میں اک تشنجی اکڑاؤ تھا۔ اس نے دماغ پر زور دیا حافظے کی مدد سے کچھ یاد کرنا چاہا۔ لیکن کچھ نہ سمجھ سکی۔ سامنے کھڑکی کا سفید پردہ لرز رہا تھا۔ اور بجلی کا بلب روشن نظر آ رہا تھا۔

"میں کہاں ہوں" وہ نحیف آواز میں بولی۔

"آپ ہسپتال میں ہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہسپتال"

"گھبرایئے نہیں۔ آپ کو صرف معمولی چوٹیں آئی ہیں۔"

"میں کیوں یہاں لائی گئی ہوں۔"

"آپ ٹرین کے حادثہ میں زخمی ہو گئی تھیں" ڈاکٹر نے نرمی سے کہا "شکر ہے آپ کو بالکل معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ چند دنوں تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھیں آپ" نرس نے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

ناہید کو جیسے کوئی بھولا ہوا خواب آ گیا۔

"ٹرین کی ٹکر ہو گئی تھی۔"

"ہاں"

"میں اب کس جگہ ہوں۔"

"آپ سلطان پور کے سول ہسپتال میں ہیں۔"

"اور میری آپا...... اماں" ناہید کو خیال آ گیا۔

"آپ ابھی آرام کیجئے صبح ان کا پتہ چل جائے گا۔"

نرس دوائی لے آئی۔ ناہید نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نے اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کو پورے آرام کی ضرورت ہے۔"

نرس نے اسے دوائی پلا دی۔

ناہید نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دماغ ماؤف سا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکی۔

ڈاکٹر اس کے متعلق نرس کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ ناہید کو ان کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ معلوم ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آپا کو موت کا ظالم دیو نگل چکا تھا۔ یہ خونی حقیقت یہ تلخ انکشاف ناہید کے احساسات پر برق بن کر گرا۔ وہ تھرا اٹھی۔ اس کی شفیق آپا اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔ وہ عزیز ہستی ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی تھی جس کی نرم و گرم آغوش میں اس نے زندگی کے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ جس کی پرسکون گود میں دندناتے ہوئے طوفانوں اور امنڈھی ہوئی آندھیوں سے اسے پناہ ملی تھی۔ وہ بچھڑ گئی تھی وہ ہانپتا کانپتا بڑھاپہ جس کی کمزور کمزور بنیادوں پر وہ اپنے مستقبل کی دیواریں کھڑی کرنے کو نکلی تھی۔ ختم ہو چکا تھا۔ ناہید بلک بلک کر روئی۔ مچل مچل کر روئی۔ دیکھنے والوں کے دل دہل گئے۔ کئی آنکھیں اس کی ہم آہنگ ہو کر برسیں لیکن کسی کے پاس اس کے درد کا درماں نہ تھا۔ نرسیں اسے تسلی دیتیں۔ ڈاکٹر اسے حوصلہ دلاتا لیکن جو عظیم نقصان آپا کے مرنے سے پہنچ چکا تھا۔ اس کی تلافی ان کھوکھلی تسلیوں اور ظاہرداری کے حوصلوں سے نہ ہو سکتی تھی۔

اسے مستقبل اندھا کنواں نظر آ رہا تھا۔ آپا کا سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اب وہ دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ تقدیر

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نے اس کے ساتھ مہلک مذاق کیا تھا۔ اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی۔ جسے شکاری تفنن طبع کی خاطر پر کاٹ کر پنجرے سے باہر نکال دیتا ہے۔ پرندہ آزادی پا کر اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کٹے ہوئے بال و پر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ وہ اچھلتا ہے اور پھڑپھڑا کر صیاد کے قدموں میں آ گرتا ہے۔ اور شکاری اک دلچسپ کھیل سمجھ کر اس کی محرومی کا تماشہ دیکھتا رہتا ہے۔

پچھلے چند دنوں میں اس کی زندگی نے کئی پلٹے کھائے تھے۔ لیکن یہ پلٹا کچھ اس قدر سنگین تھا کہ ناہید کا دماغ چکرا گیا۔ آپا کی تدبیر سے وہ فیروز کے چنگل سے آزاد ہو گئی تھی۔ لیکن تدبیر تقدیر سے الجھ گئی تھی۔ آپا بغیر منزل مقصود پر پہنچائے ابدی نیند سو چکی تھی ۔ کوئی مونس و غم گسار نہ رہا تھا۔

دن بھر روتے رہنے سے اس کا دماغ کسی بات کو اچھی طرح سوچنے سے عاری تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے ادھوری ادھوری باتیں سوچ رہی تھی۔ سفید سوتی ڈھیلے ڈھالے ہسپتال کے کپڑوں میں ملبوس وہ ماضی حال اور مستقبل کی الجھنوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی خاکہ نہ بن سکا۔ کوئی پروگرام مرتب نہ ہو سکا۔ معاً اسے اپنی ماں کی دی ہوئی ہیرے کی انگشتری کا خیال آ گیا۔ بیش قیمت انگوٹھی بیچ کر کچھ تو گزارے کی صورت ہو جائے گی۔ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا مخروطی انگلیاں خالی تھیں۔ انگوٹھی اور گھڑی دونوں غائب تھیں۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بلا ارادہ اس کے ہاتھ تکئے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے چادر الٹ پلٹ کر ڈالی لیکن دونوں چیزیں نہ ملیں۔ وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ اور اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

نرس رات کا کھانا لے کر آ گئی۔ ناہید آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ نرس نے سمجھا وہ سو رہی ہے۔ کھانا میز پر رکھ کر بغیر اسے جگائے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کوئی نصف گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو ناہید اسی طرح پڑی تھی۔ اس نے جھک کر اسے ہلایا۔ ناہید نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں جو وسوسوں اور اندیشوں سے گھری ہو رہی تھیں۔

"کھانا کھا لیجئے"

اس نے انکار کر دیا۔ نرس نے بہلایا۔ پھسلایا وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اپنی عزیز آپا کے مرنے کا صدمہ ہے۔ جو وہ کھانا کھانے سے انکار کر رہی ہے۔ لیکن اس وقت اس کی موت کے صدمے سے زیادہ اسے اپنی انگوٹھی کے کھونے کا غم تھا۔ اس نے چاہا کہ اس کے متعلق نرس سے استفسار کرے۔ لیکن نرس سے کچھ پوچھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ وہ خاموش رہ گئی۔ نرس کے اصرار پر چند لقمے زہر مار کئے۔ اور پھر نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی۔ مستقبل تاریک تھا۔ اتنا تاریک جس میں اجالے کی چمک نظر آنے کا کوئی گمان ہی نہ تھا۔

صبح ڈاکٹر حمان نے اس کی پٹی کھولی۔ بازو کا زخم اچھی حالت میں تھا۔

"چند دن اور لگیں گے۔ پھر آپ گھر جانے کے قابل ہو سکیں گی" ڈاکٹر زخم پر پھایا رکھتے ہوئے بولا۔

ناہید نے گھبرا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

"اپنا پتہ دیجئے۔ تاکہ آپ کے رشتہ داروں کو مطلع کیا جا سکے" پٹی باندھ کر ڈاکٹر میز پر جھک گیا۔

ناہید چکرا گئی۔ اس کا رشتہ دار کون تھا اس دنیا میں۔ اور گھر جہاں جہنمی آگ سلگتی تھی۔ جہاں شرافت کو چٹ کر جانے والے شعلے لپکتے تھے۔ جہاں امارت نفس کی تشنگی بجھانے آتی تھی۔ نہیں وہ اس دوزخ میں جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس جلتی ہوئی بھٹی میں واپس جانے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ ڈاکٹر اس کی خاموشی پر متعجب تھا۔ اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ناہید اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں ویرانی تھی۔

"اپنا پتہ بتائیے" ڈاکٹر پن ہاتھ میں لئے اس سے مخاطب تھا۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے" وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

ڈاکٹر ایک دم اس کی طرف گھوم گیا۔ اور حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ناہید کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"آپ جا کہاں رہی تھیں" وہ پن کا کلپ گھماتے ہوئے قدرے توقف کے بعد بولا۔

"روزگار کی تلاش میں" ناہید کے معصوم چہرے پر حزن و ملال کی شکنیں ابھر آئیں "لیکن جس کے سہارے جا رہی تھی۔ وہ بھی جاتا رہا۔"

"بیٹھ جائیے" ڈاکٹر کے لہجے میں اک باپ کی شفقت تھی۔ ناہید میز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اور اپنے وجود کا بار سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کا اشارہ پاتے ہی شکریئے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ کے والدین" ڈاکٹر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

ناہید کے دماغ کو اک جھٹکا سا لگا۔ اس سے یہ سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے اس سوال پر اس نے غور ہی نہ کیا تھا۔ وہ کیا بتائے۔ کون تھے اس کے والدین۔ باپ...... جو کسی جائز یا ناجائز ذریعہ سے اسے جنم دینے کا موجب بنا تھا۔ اور ماں جس کی ساری عمر طبلے اور گھنگروؤں کی سنگت پر ناچتے گذر گئی تھی جس کی راتیں۔ دن کی روشنی میں تقدس کا ڈھنڈورا پیٹنے والے سرمایہ داروں کی خلوتیں آباد کرتے گذر گئی تھیں۔ اسے اپنے ماضی سے گھن آنے لگی۔ یہاں اسے کون جانتا ہے۔ وہ کسی کو کیوں بتائے۔ اسے اپنے آپ کو سبک کرنا گوارہ نہ تھا۔ خود دار اور غیور ناہید کو اپنی تشہیر منظور نہ تھی۔ اس نے سوچا ماضی مر چکا ہے۔ اس کے بھیانک چہرے سے کفن ہٹانے کی ضرورت نہیں۔ وہ سوچ میں مستغرق تھی۔ ڈاکٹر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے سوال کا جواب نہ پا کر سوال کو دوسرے رنگ میں دہرایا۔

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"آپ کے والدین حیات ہیں۔"

"نہیں" ناہید نے بوجھل پلکیں اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ آنسو آنکھوں میں ٹھٹکے ہوئے تھے۔

"والد بچپن میں وفات پا چکے ہیں۔ والدہ کو فوت ہوئے صرف ایک ماہ ہوا ہے۔"

"افسوس" ڈاکٹر بڑے تجسس سے اس کے دلفریب چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ "آپ کس کے پاس رہتی تھیں۔" دوسرے کے راز جاننے کی انسان کی ازلی خواہش کو ڈاکٹر رد نہ کر سکا۔ "کوئی قریبی رشتہ دار ہوں گے۔"

"ماں کے مرنے کے بعد چند عزیزوں کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لئے میری آیا مجھے وہاں سے نکال لائی۔ لیکن کسی منزل پر پہنچانے سے پیشتر ہی اس کا ساتھ چھوٹ گیا۔" ٹھہرے ہوئے آنسو بے تابی سے بہنے لگے۔

"بڑا افسوس ہے۔" ڈاکٹر حمان نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد کیا ارادہ ہے آپ کا۔"

ڈاکٹر نے جیسے اس کے آبلوں کو ناخنوں سے پھوڑ ڈالا۔ وہ تلملا کر رہ گئی۔ رک رک کر بہنے والے آنسو زیادہ روانی سے بہنے لگے۔ وہ سر جھکائے روئے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کو اپنے سوال پر پشیمانی ہوئی۔

"آپ روئیے نہیں۔" وہ بولا۔ "آپ کے حالات جان کر مجھے بیحد افسوس ہوا ہے۔ دنیا میں ایسے مظالم ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ جہاں تک ہو سکا میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

ناہید آنسو خشک کر رہی تھی۔ لیکن جتنے آنسو پونچھتی اس سے کہیں زیادہ اور بہہ جاتے۔ دکھا ہوا دل ہمدردی کے الفاظ پر اب اظہار تشکر کے طور پر رو رہا تھا۔

"آپ تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہیں۔"

"جی میں تھرڈ ایر میں پڑھ رہی تھی۔"

"تو پھر کہیں نوکری......" ڈاکٹر ہچکچا کر خاموش ہو گیا۔

"میں نوکری کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔" وہ بھیگی بھیگی التجا آمیز نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ "نوکری کیسے تلاش کروں گی۔"

اس کی بے چارگی پر ادھیڑ عمر ڈاکٹر کا دل پسیج گیا۔

"اچھا میں کوشش کروں گا۔"

"ڈاکٹر" وہ احسان مندانہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے کہیں نوکری دلوا دیجئے میں تا عمر آپ کی

ممنون رہوں گی۔"

"دیکھیں کوشش کروں گا۔ فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

ناہید کی امیدیں ڈوبنے لگیں۔

"میں نواب صاحب سے بات کروں گا۔ وہ ایک مخیر انسان ہیں۔ ان کی سرپرستی میں کئی سکول اور امدادی ادارے چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے جلد ہی آپ کا کوئی معقول بندوبست ہو جائے۔"

"میں آپ کی احسان مند ہوں۔" وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

"میں جہاں تک میرے امکان میں ہو گا۔ کوشش کروں گا۔"

"شکریہ" ناہید کو جواب کے لئے یہی موزوں لفظ مل سکا۔ وہ اٹھی۔ اور اپنے وارڈ کی طرف جانے لگی۔

"گھبرایئے گا نہیں۔ ابھی تو آپ کے زخم ٹھیک ہونے میں بھی کچھ دن لگ جائیں گے۔ انشاءاللہ جب تک آپ کا انتظام ہو جائے گا۔" ناہید نے پلٹ کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کے اخلاص نے ناہید کی نظروں میں اس کی وقعت بڑھا دی تھی۔

"یہ قسمت کی بات ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں آپ کو ایسے اندوہ گیں حالات پیش آئے۔ لیکن گھبرانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ صبر و تحمل سے کام لینا ہو گا آپ کو......اور ہاں اگر آپ کو مالی امداد کی ضرورت ہو۔ تو ہسپتال کے فنڈ سے آپ پیسہ لے سکتی ہیں۔"

ناہید کو اپنی انگوٹھی اور گھڑی کا خیال آ گیا۔ دونوں چیزیں ہوتیں۔ تو اسے یوں خیرات نہ مانگنا پڑتی۔ اس کے پندار کو ٹھیس سی لگی۔

"میرے پاس جو بھی اثاثہ تھا............وہ بھی لٹ چکا۔ اپنی ضروریات کے لئے آپ کے آگے ہی ہاتھ پھیلانا ہو گا۔"

ڈاکٹر کو کچھ خیال آ گیا۔

"آپ کی امانت میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کو بتانا یاد نہ رہا تھا۔"

ناہید سمجھ نہ سکی۔ ڈاکٹر کس امانت کا ذکر کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے ذکر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جب آپ زخمی حالت میں یہاں لائی گئی تھیں۔ تو آپ کو کوئی ہوش نہ تھا۔ نرس نے آپ کی انگلی سے انگوٹھی اور کلائی سے گھڑی اتار لی تھی۔ تاکہ دونوں چیزیں کوئی آپ کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر اتار نہ لے۔"

ناہید سانس روکے ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے اس بات سے اتنی خوشی ہوئی جیسے تیرہ و تاریک مستقبل ایک دم چمک اٹھا ہو۔

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میری انگوٹھی اور گھڑی......"

"ہاں"

"میں سمجھی دونوں چیزیں کھو چکی ہیں۔"

"نہیں وہ میرے گھر پڑی ہیں۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر جواب میں مسکرا دیا۔

ناہید کے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک ہسپتال میں ہی تھی۔ اس کی پریشانیاں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ ماضی کا خوف حواس پر چھایا ہوا تھا۔ حال کی بدحالی نے پریشان کر رکھا تھا۔ اور مستقبل اک لامحدود پھیلاؤ نظر آ رہا تھا۔ اس کی نوکری کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر سے اس بارے میں پھر کوئی بات چیت نہ ہو سکی تھی۔ شاید وہ اپنی مصروف زندگی میں ناہید کے آلام کو بھول چکا تھا ناہید یہی سوچ رہی تھی۔ وہ سہمی ہوئی زندگی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ جدھر سے روشنی کی کرن نظر آتی۔ اسی طرف راستے کی تلاش میں دوڑ اٹھتی۔ لیکن بند راستے تھے۔ اور وہ بھٹک رہی تھی۔

ڈاکٹر حمان ایک مخلص اور خدا ترس انسان تھے۔ ناہید کے حالات سن کر انہیں بڑا ترس آیا۔ وہ زمانے کی سرد گرم دیکھے ہوئے تھے۔ ناہید کے گرد منڈلانے والے خطرات سے انہیں آگہی تھی۔ اس کا بے مثال حسن اس کے لئے اک مستقل خطرہ تھا۔ وہ اس وقت سر راہ پڑی ہوئی چمکتی ہوئی اشرفیوں کی تھیلی تھی جسے اٹھانے کے لئے ہر ہاتھ لپک سکتا تھا۔ وہ اس دولت بے بہا کو کسی محفوظ مقام پر رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی اپنی بچیاں فاخرہ اور ناصرہ بھی ناہید کی ہم عمر ہی تھیں۔ بیٹیاں رکھتے تھے۔ اس لئے انہیں اس بے آسرا لڑکی سے گہری ہمدردی ہو گئی۔

ناہید اپنے بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک چکا تھا۔ ذہن مفلوج سا ہو رہا تھا۔ "یہاں سے ڈسچارج ہو کر کہاں جائے گی۔" یہی اک سوال رہ رہ کر دریا کی خوفناک لہروں کی طرح اس کے دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔

"مس ناہید" نرس نے اسے آواز دی۔ ناہید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بات کرنے کو اس کا جی نہ چاہا۔

"آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے۔"

"ڈاکٹر حمان نے"

"جی ہاں"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کہاں ہیں وہ"

"اپنے دفتر میں"

ناہید اٹھی۔ ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں کو درست کیا...... موٹی ململ کا سفید دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھا۔ اک بوجھل دل اور امید و بیم کی راہوں میں بھٹکتا ہوا دماغ لئے وہ ڈاکٹر کے آفس میں پہنچی۔

"آؤ بیٹا" ڈاکٹر بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"تمہاری نوکری کا بندوبست ہو گیا۔"

"سچ" وفور مسرت سے وہ اچھل پڑی۔

"نواب منصور علی خان سے میں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے تمہیں کام دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"وعدہ" ناہید کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ خوشی کافور ہو گئی۔ وعدہ۔ کسی کا دل دکھائے بغیر ٹال جانے کا بہترین طریقہ۔ وہ سوچ میں غرق تھی۔

"آج شام انہوں نے بلایا ہے۔"

"مجھے..........."

"ہاں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ معمولی قسم کا انٹرویو سمجھ لو۔"

ناہید کی آنکھیں ایک بار پھر امید سے چمکنے لگیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اپنے سوتی ہسپتال کے لباس کو دیکھ کر وہ کچھ مغموم سی ہو گئی۔

"میرے پاس تو کوئی کپڑا بھی نہیں ہے۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

"اسی طرح جانے میں کیا ہرج ہے۔" ڈاکٹر بے ساختہ ہنس دیا۔ "تمہاری موجودہ حالت کی ترجمانی اچھی طرح ہو سکے گی۔"

وہ اداس ہو گئی۔

"آج میرے ساتھ گھر چلنا۔ وہاں ناصرہ یا فاخرہ کے کپڑے پہن لینا۔"

دونوں بہنیں اسے دیکھنے کئی بار ہسپتال آ چکی تھیں۔ اس کی پیاری پیاری صورت اس کے حسن اخلاق اور اس کے موجودہ قابل رحم حالات نے دونوں بہنوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ گھر جا کر اپنی امی سے گھنٹوں اسی کے متعلق باتیں کرتی رہتیں۔ اور ان کی باتوں نے بیگم رحمان کے تجسس کو اس قدر بڑھا دیا تھا کہ وہ بھی محض اسے دیکھنے کے لئے ہسپتال آئی تھیں۔

ناہید ڈاکٹر حمان کے ساتھ ان کے گھر گئی۔ ناصرہ اور فاخرہ نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بیگم رحمان نے اس کے سلام کے جواب میں بڑھ کر اسے چھاتی سے لگالیا۔ اور ناہید پیار کے ترسے ہوئے بچے کی طرح اس کی چھاتی سے لگ گئی۔ سب ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ناہید کو اپنے لباس پر کچھ ندامت آمیز حجاب آرہا تھا۔

چائے کے بعد ڈاکٹر رحمان نے فاخرہ سے کہا۔

"بیٹا انہیں کوئی کپڑے دے دو۔ آج انہیں انٹرویو کے لئے جانا ہے۔"

"کہاں" بیگم رحمان شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ناہید صوفے پر ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

"قصر رعنا" ڈاکٹر نے مختصر سا جواب دیا۔

"نواب صاحب کے ہاں۔"

"ہوں"

"وہ کیوں" بیگم رحمان بات کو نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

"نوکری کے لئے بلایا ہے انہوں نے۔"

بیگم رحمان نے ترحم آلود نظروں سے ناہید کو دیکھا۔ جسے ہنسنے کھیلنے کی عمر میں اس قسم کی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ وہ ڈاکٹر سے اس کے سارے حالات سن چکی تھی۔

"تمہارا کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔" بیگم رحمان نے ناہید کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

ناہید نے بے قرار ہو کر کروٹ بدلی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کچے پھوڑے میں نشتر ڈال دیا ہو۔ ہر ملنے والا اس سے یہی سوال کیوں کرتا ہے۔ ماضی کو وہ اپنے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتی تھی۔ لیکن وہ بار بار اس کے سامنے لایا جاتا تھا۔ وہ مضطربانہ اپنے ناخنوں کو کھرچنے لگی۔

"رشتہ دار تو تھے" ڈاکٹر رحمان نے ناہید کے اضطراب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج کل کے رشتہ داروں کا حال تمہیں معلوم نہیں کیا۔ سب کچھ تو تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"توبہ کیسا زمانہ آگیا ہے۔" بیگم رحمان نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "خوفِ خدا تو دلوں سے اٹھ ہی چکا ہے۔"

ناہید کے لئے یہ ذکر اذیت ناک تھا۔ وہ اس واقعہ کو بھول جانا چاہتی تھی۔ اسے آنے والے وقت کا فکر تھا۔ گذرے ہوئے لمحات کا ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔

"وقت ہو رہا ہے تم تیار ہو جاؤ" ڈاکٹر نے ناہید کو کہا۔

"آیئے" ناصرہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ناہید اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں بہنیں اسے اپنے کمرے میں لے آئیں۔

"آپ کو کون سا رنگ پسند ہے۔" فاخرہ نے الماری کھول کر ناہید سے پوچھا۔ "دیکھ لیجئے جو کپڑے پسند ہوں پہن لیجئے۔" فاخرہ بڑے فخر سے الماری کھولے اسے اپنے رنگا رنگ کپڑے دکھا رہی تھی۔

"پسند ناپسند کا تو سوال ہی نہیں مجھے تو ستر پوشی کے لئے کپڑے چاہئیں۔ کوئی سے دے دیجئے۔"

ناہید کے چہرے پر اک مغموم تبسم تھا۔ وہ میز پر پڑی ہوئی فاخرہ کی تھرڈ ایر کی کتابوں کو بڑی حسرت سے الٹ پلٹ رہی تھی۔ اس کا ذہن پیچھے کی طرف گھوم چکا تھا۔ اپنی بک شیلف پر قرینے سے رکھی ہوئی کتابیں۔ اپنا شاندار ٹیبل لیمپ یاد آرہا تھا۔ ڈیڑھ ماہ قبل وہ گورنمنٹ کالج کی ایک ہونہار طالبہ تھی۔ اور آج در بدر بھٹکتی ہوئی نوکری کے لئے سرگرداں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر اک دبی سی آہ پھیل گئی۔

"میری قمیض آپ کو کھلی ہوگی۔ ناصرہ کی ٹھیک رہے گی۔" فاخرہ کہہ رہی تھی۔ ایک سفید ریشمی سوٹ نکال کر اس نے ناہید کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور جب ناہید سفید سوٹ میں ملبوس غسل خانے سے باہر نکلی تو دونوں بہنیں اس کے جمال کی تجلیوں میں کھو کر رہ گئیں۔

"کہیں آپ کو نظر نہ لگ جائے۔" ناصرہ شوخی سے مسکرائی۔

ناہید شرما گئی۔

فاخرہ نے سیاہ شنیل کا خوب صورت چوڑا سا مفلر اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔

"لو اب نظر نہیں لگے گی۔"

اور تھوڑی ہی دیر میں تینوں بے تکلف سہیلیوں کی طرح باتیں کر رہی تھیں۔

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۵

"ابھی شاید نواب صاحب کو آنے میں کچھ دیر لگ جائے" ڈاکٹر حمان نے ناہید سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ میں ذرا ہسپتال فون کر دوں۔ نرس کو چند ایک ضروری ہدایات دینی ہیں"۔

ناہید چپ چاپ بیٹھی رہی۔ وہ قصر رعنا کے دفتر سے ملحقہ نواب منصور علی خان کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھی تھی۔

"میں دس منٹ تک آتا ہوں"۔ کہہ کر ڈاکٹر حمان پردہ اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

ملاقاتی کمرہ شاندار اور قیمتی سازوسامان سے آراستہ تھا۔ ہلکے سبز رنگ کے قالین کے ہم رنگ نرم صوفے تھے۔ خوبصورت کشن بڑے جاذب نظر تھے۔ ہلکے سبز رنگ کے مہین پردے اونچی اونچی کھڑکیوں اور چوڑے چوڑے دروازوں پر کسی معصوم دل کی طرح لرز رہے تھے۔ بڑے بڑے روسی گلدانوں میں پھول بڑی نفاست سے رکھے ہوئے تھے۔ سیاہ آبنوسی میزوں پر نقرئی راکھ دان پڑے تھے۔ چوڑے چوڑے سنہری چوکھٹوں والی دلفریب سینریاں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ کمرے کی ہر چیز سے شان امارت ٹپک رہی تھی۔

ناہید صوفے کی پشت پر سر ٹکائے امید و بیم کی پر پیچ راہوں میں بھٹک رہی تھی تلاش روزگار میں وہ یہاں آئی تھی۔ اگر کام نہ ملا۔ تو کیا ہو گا۔ اس خیال سے اس کا دل ہول کھا رہا تھا۔ اپنی مجبور اور بے بس زندگی پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ دن رات کے تفکرات نے اسے مضمحل کر رکھا تھا۔ وہ ایک تھکن سی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا سرخی مائل سفید رنگ زرد ہو گیا تھا۔ خوبصورت آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑ گئے تھے۔ لیکن اس کی رعنائی میں کوئی فرق نہ آیا تھا حسن ہر رنگ میں حسین تھا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر کا ملاقاتی کارڈ لے کر نوکر کبھی کا گیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کو گئے بھی کافی دیر ہو چکی تھی۔ اپنے خیالات کو منتشر کرنے کے خیال سے وہ اٹھی اور کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ بے چینی رفع نہ ہوئی۔ پچھلے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا طویل برآمدے کا چمکیلا فرش قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ محرابی

دروں میں سنہری ٹوکریاں سبز سبز ریلنگ والے زینے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ زینہ بل کھاتا ہوا اوپر کی منزل کو جاتا تھا۔ چوبی زین پر بھی سرخ قالین چمک رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈاکٹر اور نوکر دونوں میں سے ایک بھی واپس نہ آیا تھا۔ کمرے میں اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ پردہ اٹھا کر باہر آ گئی۔

ہلکی ہلکی نم آلود ہوا چل رہی تھی۔ سورج تیزی سے آغوش مغرب میں سمانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کی بیمار بیمار کرنیں برآمدے کے سنہری ستونوں پر تھرک رہی تھیں ناہید ایک مجسمے کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ سنگ مرمر کا ایک بہترین مجسمہ تھا۔ ایک دوشیزہ آنچل میں پھولوں کے گلدستے لئے قدم اٹھانے کو تیار تھی۔ سنگ تراش نے فن کو کمال پر پہنچایا تھا۔ ناہید حیرت بھری نظروں سے اس نصب شدہ مجسمے کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ وہ دیکھنے میں منہمک تھی۔ کہ ایک گول مٹول سا پیارا پیارا بچہ زینے سے اترا۔ آخری زینے سے جاتے پاؤں پھسلا یا چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ بچہ گر گیا۔ ناہید لپکی اور بڑے پیار سے بچے کو اٹھا لیا۔ وہ اپنی تکلیف بھول کر اسے شوق سے دیکھنے لگا۔

"کہیں چوٹ تو نہیں آئی" ناہید نے پوچھا۔

"نہیں شکریہ" بچہ اس کی گود سے اترتے ہوئے بولا۔ وہ اب بھی پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کا نام" ناہید آخری زینے پر ایک پیر رکھے ریلنگ کا سہارا لئے کھڑی تھی۔

"میرا نام فریدوں ہے"۔

"بڑا پیارا نام ہے"

"آپ کون ہیں"۔

"میں ناہید"۔

"نا......ہیں" فریدوں نہیں کو کھینچ کر سر انکار کی صورت میں ہلاتے ہوئے بولا......

"کیوں بھلا" وہ مسکرا دی۔

"مجھے پتہ ہے آپ کون ہیں" وہ بڑے اعتماد سے سینہ پھلا کر بولا۔ ہلکے گلابی گرم سوٹ میں اس کا چہرہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ ناہید بچے کی معصوم باتوں میں فکر فردا کو بھول سی گئی۔

"کون ہوں میں"

"آپ...... آپ پریوں کی شہزادی ہیں" بچے کو اس بات سے توصیف حسن مقصود نہ تھی۔ ناہید کو دیکھ کر سنی ہوئی کہانیوں کی وجہ سے مشابہت کے سلسلہ میں اس نے ایسا کہہ دیا تھا۔

"پریوں کی شہزادی"۔ وہ ہنس دی۔ اس کے چہرے کا رنگ گلابی ہو گیا۔

"آنٹی ڈی سوزا نے مجھے بتایا ہوا ہے" وہ معصومیت سے بولا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کیا بتایا ہے" وہ شوق سے بولی۔

"آپ نے آنٹی ڈی سوزا کو دیکھا ہوا ہے"۔ بچے کے ذہن کا دھارا دوسری طرف منتقل ہو گیا۔

"نہیں"

"آیئے میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں"۔

"ابھی نہیں"۔

"کیوں نہیں" بچہ اصرار کرنے لگا۔

"ابھی مجھے کچھ ضروری کام ہے"۔

بچے نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔

"سچ کہہ رہی ہوں پھر آؤں گی تو تمہاری آنٹی ڈی سوزا سے ضرور ملوں گی"۔

"ابھی چلیئے نا" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

"پھر آؤں گی وعدہ رہا"...... اسے بچے پر بے انتہائی پیار آرہا تھا۔ اگر نواب منصور سے ملنا نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کے ساتھ جا کر اس کی خواہش پوری کر دیتی۔ وہ مجبور تھی۔ بچہ حسرت اور مایوسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کچھ اداس سا ہو گیا تھا۔ ناہید نے جھک کر اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

"وعدہ کیا ہے نا پھر آؤں گی"۔

زینے کے اوپر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔ ناہید نے سر گھما کر دیکھا۔ زینے کے آخری چکر پر۔ بہترین قیمتی سوٹ میں ملبوس منصور کھڑے تھے۔ مردانہ حسن و وجاہت کا دلکش شاہکار اپالو کا مجسمہ کشادہ پیشانی۔ روشن آنکھیں تابناک چہرہ۔ لانباقد صحت مند جسم وہ حیرت زا نظروں سے ناہید کو دیکھ رہے تھے۔ نگاہیں ٹکرائیں اور چند لمحوں میں گنگناہٹ سی فضا پر چھا گئی۔ منصور کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ ان کے حسین تخیلات کا عکس لطیف تھی۔ ان کے تصورات کا پرتو تھی۔ چند ثانئے دونوں سحر زدہ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ننھا فریدوں کبھی منصور اور کبھی ناہید کو دیکھ رہا تھا۔

"ماموں حضور" اس نے خوشگوار سکوت کو توڑ ڈالا "یہ پریوں کی شہزادی ہیں"۔ اپنی دانست میں وہ بہت بڑا انکشاف کر رہا تھا۔

جمود ٹوٹ چکا تھا۔ ناہید بچے کی بات پر شرما گئی۔ اس کا چہرہ کانوں کی لووں تک سرخ ہو گیا۔ اور منصور بھی جیسے کسی حسین خواب سے چونک گئے۔ فریدوں ایک رنگین تتلی کے پیچھے بھاگ گیا۔ ناہید کمرے میں واپس جانے کیلئے مڑی۔

"آپ" منصور کے لب ہلے۔ وہ ابھی تک مسحور سے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

"مجھے بڑے نواب صاحب سے ملنا ہے"۔ ناہید نے آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔ مخیر ہمدرد اور خدا ترس کے الفاظ سن کر اس کے ذہن نے نواب منصور کو ایک معمر نواب کی شکل دی تھی۔

"بڑے نواب صاحب سے" وہ زیر لب ناہید کی لاعلمی پر مسکرا دیئے۔

"جی" وہ گھبراہٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنی پلکیں تیزی سے جھپکا رہی تھی "وہ غالباً اپنے دفتر میں آچکے ہونگے" منصور شوخی سے مسکرائے۔

وہ موج کی طرح بل کھا کر مڑی۔ اور منصور اسے شوق اور تجسس سے دیکھتے رہے۔ کمرے میں ڈاکٹر رحمان کھڑا تھا۔

"آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ میں تو باہر چمن تک آپ کو دیکھ آیا"۔

"معاف کیجئے گا آپ کو تکلیف ہوئی" اس کا دل ابھی تک تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی کھڑی تھی۔ وہ تذبذب کی حالت میں تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کچھ کھو دیا ہو۔ کچھ پالیا ہو۔

باوردی ملازم نے آکر انہیں نواب صاحب کی آمد سے مطلع کیا۔

"سرکار تشریف لے آئے ہیں" وہ ادب سے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

"کہاں ہیں" ڈاکٹر رحمان نے استفسار کیا۔

"دفتر میں تشریف لے چلیئے"

ناہید ڈاکٹر رحمان کے ساتھ منصور کے پرشکوہ دفتر میں داخل ہوئی...... وہ بڑی سی چمکدار میز کے دوسری طرف شاندار کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر چکرا گئی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ اور منصور چشم شوق سے اس حسین چہرے پر قوس و قزح کے حسین رنگوں کا امتزاج دیکھتے رہے۔ ناہید کو اپنی غلط فہمی پر ندامت سی ہو رہی تھی۔

"تشریف رکھیئے" منصور زیر لب مسکرا رہے تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

ڈاکٹر رحمان اور ناہید میز کے اس طرف پڑی ہوئی گدے دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور نے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور پھر ڈاکٹر رحمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ڈاکٹر رحمان پہلے بھی اس کے حالات منصور کے گوش گزار کر چکا تھا اب پھر نئے سرے سے وہ کہانی دہرا رہا تھا۔ منصور میز پر کہنیاں ٹکائے بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا۔ اور منصور کیا سن رہے تھے۔ ناہید کا اس طرف کوئی دھیان نہ تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور اپنی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو بے قراری سے گھمائے جا رہی تھی۔

"آپ ٹائپ جانتی ہیں" منصور نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔ وہ اپنے آپ ہی سے الجھی رہی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"مس ناہید" ڈاکٹر حمان نے متوجہ کرنے کیلئے آواز دی۔

وہ چونک پڑی۔

"جی" وہ ڈاکٹر کا منہ دیکھنے لگی۔

"آپ ٹائپ جانتی ہیں" ۔

"نہیں"

اس نے جواب دیا۔ خیالات کی یورش میں وہ بھول چکی تھی۔ کہ وہ نوکری کیلئے یہاں آئی ہے۔ اس سوال نے اسے پھر مادی دنیا میں لا پٹخا...... وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا منصور سامنے پھیلے ہوئے کاغذوں پر نظر جمائے کچھ سوچ رہے تھے۔

"دیکھیئے" منصور قدرے توقف کے بعد بولے "تینوں سکولوں میں جگہ کی گنجائش نہیں ہے"۔

ناہید کو جیسے موت کا حکم سنا دیا گیا ہو۔ اس کی کمزور کمزور امیدوں نے دم توڑ دیا۔ پریشان سی ہو کر منصور کو دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر حمان بھی سوچ میں پڑ گیا۔

"مجھے اس دفتر کے لئے ٹائپسٹ کی ضرورت ہے۔" منصور نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لیکن میں ٹائپ نہیں جانتی" وہ مایوسی کے انداز میں بولی۔

"کوشش کرنے سے سیکھ تو سکتی ہیں" منصور اس کے مایوس چہرے سے بڑے متاثر ہوئے۔

"کیوں نہیں پڑھی لکھی لڑکی ہیں۔ جلد ہی سیکھ جائیں گی" ڈاکٹر حمان نے سفارش کے طور پر کہا۔

سیکھنے کیلئے مدت درکار تھی۔ اور ناہید کے حالات جلد از جلد روزگار حاصل کرنے کے متقاضی تھے۔ وہ ناامید ہو گئی۔ منصور خاموش تھے۔ اور ڈاکٹر جانے کیا الم غلم باتیں کئے جا رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہے" منصور کی آواز پر ناہید نے چونک کر دیکھا۔ وہ ڈاکٹر کی کسی بات کا جواب دے رہے تھے۔

"آپ کل سے کام پر آجایئے" منصور کہہ رہے تھے۔ ناہید تعجب سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"لیکن میں ٹائپ نہیں جانتی" وہ بڑی سادگی سے بولی۔

"آپ لکھنا تو غالباً جانتی ہیں" منصور نے برجستہ جواب دیا۔ محجوب ہو گئی منصور اس کے گالوں پر پھوٹتی ہوئی شفق کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر حمان پھر باتوں میں مشغول تھا۔ اور ناہید اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی منصور نے میز پر پڑی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کچھ لمحوں بعد پچھلے دروازے کا پردہ اٹھا کر ان کا سیکرٹری اعجاز احمد اندر آگیا۔ اس نے کمرے پر اک اچٹتی نگاہ ڈالی ناہید کو دیکھ کر نگاہیں کچھ دیر کیلئے ٹھٹکیں۔ لیکن وہ جلد ہی منصور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کچھ دیر دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ اعجاز کمرے سے چلا گیا کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا۔ تو اس کے ہاتھ میں اک فارم تھا۔ اس نے جھک کر فارم منصور کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے دو ایک جگہوں پر دستخط کئے۔ اعجاز نے فارم اٹھایا۔ اور ناہید کی طرف بڑھا۔ کھلا ہوا پن اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

"یہاں دستخط کر دیجئے" ایک نشان پر اس نے انگلی رکھی۔

ناہید نے جھجکتے ہوئے پن لیا۔ اور نشان والی جگہ پر دستخط کر دیئے۔ قلم اس کی نازک انگلیوں میں تھرتھرا رہا تھا۔

ڈاکٹر حمان نے فارم دیکھا۔ ایک معقول مشاہرہ پر ناہید کو ملازمت مل گئی تھی۔ ڈاکٹر کو ایسے خوشی ہوئی جیسے اس نے کوئی بہت بڑی مہم سر کر لی ہو۔ اس نے مناسب الفاظ میں منصور کا شکریہ ادا کیا۔ ناہید کو مبارک باد دی۔ اور اٹھتے ہوئے رخصت کی اجازت چاہی۔

"کل سے آجائیں کام پر" ڈاکٹر نے ایک بار پھر پوچھا۔

"صبح نو بجے سے ایک بجے تک آفس ہو گا۔" اعجاز احمد نے جواب دیا۔

ناہید نے بھی نواب منصور کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ لیکن زبان نہ ہل سکی۔ وہ گنگ سی ہو گئی تھی۔ اس نے منصور کی طرف دیکھا۔ نگاہوں کو انداز تکلم مل گیا تھا۔ جو زبان نہ کہہ سکی تھی۔ وہ آنکھیں کہہ چکی تھیں۔

وہ چلے گئے۔ اور منصور کھڑکی میں کھڑے تیزی سے جاتی ہوئی کالی موٹر کو دیکھتے رہے۔ موٹر جا چکی تھی۔ اس کی اڑائی ہوئی دھول بھی منتشر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ بے خیالی میں وہیں کھڑے تھے۔ وہ اک انجانی سی بے قراری۔ اک انجانا سا اضطراب محسوس کر رہے تھے۔ حسن اپنے تمام بشری تقاضوں کے ساتھ ہزار ہا بار ان کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔ انہوں نے جہاں سوز حسن کو تحسین کی نظروں سے بھی دیکھا تھا۔ قیامت خیز جوانیوں کی تعریف بھی کی تھی۔ لیکن ایسی بے کلی آج سے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ آج تو حملہ کچھ اس شدت سے ہوا تھا۔ وار کچھ اس طرح اچانک پڑا تھا۔ کہ کسی مدافعتی قوت کو بروئے کار لانے سے پہلے ہی لوٹنے والا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے بڑی ہی احتیاط سے بڑی ہی محنت سے رکھی ہوئی عمر بھر کی کمائی کوئی نظروں کے سامنے ہی چرا کر لے گیا ہو۔

دل سے کہیں زیادہ ان کی روح مچل رہی تھی۔ اس کا جھکاؤ اسی رخ روشن کی طرف تھا۔ جو منصور کے ذہن میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

رات کے کھانے پر ڈاکٹر حمان نواب منصور علی خان کے اوصاف حمیدہ پر اچھا خاصا لیکچر دے رہا تھا۔ بیگم رحمان پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ناصرہ فاخرہ بھی بڑے شوق سے باپ کی باتیں سنتے ہوئے کھا رہی تھیں۔ ناہید کو انہوں نے اپنے گھر ہی روک لیا تھا۔ وہ کچھ اپنے خیالوں میں مست میز پر پڑے ہوئے

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کھانوں کی طرف توجہ دیئے بغیر اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ آج وہ بے انتہا خوش تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے دل کی وسعتوں سے کہیں زیادہ مسرتوں سے ہمکنار ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی صحرائی آندھیوں کی طرح بے مقصد زندگی کو ٹھکانہ مل گیا ہو۔ جیسے خزاں کی روندی ہوئی جیسے خزاں کی روندی ہوئی ٹہنیوں پر بے موسمی پھول کھل اٹھے ہوں۔ جیسے تپتے ہوتے صحرا میں میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے ہوں۔ جیسے اس کی بیمار روح کو بلاوجہ قرار آ گیا ہو۔ جیسے کسی مسیحا نے اس کے رستے ہوئے زخم لحہ بھر میں مندمل کر دیئے ہوں۔ اس کی روح نامعلوم لطیف گہرائیوں میں کھوتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا یہ ساری خوشی نوکری مل جانے سے ہے۔" رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے وہ اپنے دل سے پوچھ رہی تھی۔ دل باغی ہو چکا تھا۔ سرکش ہو گیا تھا۔ "نہیں نہیں" کی صدائیں دل کے گوشے گوشے سے اٹھنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ زینے پر پاؤں رکھے فریدوں کی پیشانی کو چوم رہی تھی۔ اور زینے کے آخری چکر پر ریلنگ کو پکڑے وہی تابناک چہرہ۔ وہی متبسم آنکھیں۔ وہی گہری نظریں اک والہانہ شگفتگی سے اسے گھور رہی تھیں۔ وہ تصور میں بار بار یہی متحرک تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اور محظوظ ہو رہی تھی۔ اور نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

"اٹھیئے گا نہیں آج" صبح فاخرہ نے ناہید کی رضائی سرکاتے ہوئے کہا۔ ناہید جاگ رہی تھی۔ طبیعت کچھ ست تھی۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ ریشمی رضائی کو آہستگی سے پیروں کی طرف سرکا دیا۔ سورج کی تازہ تازہ کرنیں کھڑکی کے بند شیشوں سے اندر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سردی آج جوبن پر تھی۔ ناہید نے سرہانے رکھی ہوئی فاخرہ کی شال کندھوں پر ڈالی۔ فاخرہ کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"آپ کو بھی تو آفس جانا ہے آج۔" وہ کتابیں اکٹھی کرتے ہوئے بولی۔

"جانا تو ہے" ناہید نے آہستگی سے جواب دیا۔ نشہ اتر چکا تھا۔ خمار ٹوٹ چکا تھا۔ اور حقیقت کی دنیا میں سانس لے رہی تھی۔ اس کی زندگی کا سفینہ اک نئے دھارے پر بہے جا رہا تھا۔ فاخرہ کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ حسرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا کالج اور کتابیں داستان پارینہ بن چکی تھیں۔ اسے تو اب زندگی سے نبرد آزمائی کرنا تھی۔ جینے کی جدوجہد میں معروف ہونا تھا۔

"کیا ٹائم ہے آپ کے آ کا۔" فاخرہ پن میں سیاہی بھر رہی تھی۔

"شاید نو بجے پہنچنا ہے وہاں۔"

"آٹھ تو بجنے والے ہیں۔" اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی چھوٹی سی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ہائے باجی آپ تیار بھی ہو گئیں۔" ناصرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں تھیں۔ آٹھ بج رہے ہیں۔" فاخرہ نے غصیلا چہرہ بنانے کی کوشش کی۔ "میں کوئی تمہارے لئے ٹھہروں گی تھوڑا ہی۔"

"اچھی باجی صرف پانچ منٹ میں تیار ہوتی ہوں۔" وہ کپڑے لے کر غسل خانہ کی طرف بڑھی۔

"صرف پانچ منٹ۔"

"نہیں نہیں کبھی نہیں ٹھہروں گی۔ تم آتی رہنا۔ تمہارے لئے میں بھی لیٹ ہو جاؤں" فاخرہ کتابیں اٹھا کر باہر جانے لگی۔ ناصرہ واپس پلٹی اور پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر فاخرہ کے بڑے اہتمام سے بنے ہوئے بالوں کو الجھا کر غسل خانہ کی طرف بھاگی فاخرہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ ناصرہ کی طرف لپکی۔ ناصرہ نے منہ چڑا کر کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دی۔

"بڑی شریر ہے" فاخرہ نے ناہید کی طرف دیکھا۔ جو دونوں بہنوں کی چپقلش کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ کتنی دل کش تھی ان کی گھریلو زندگی۔ اور اس کی زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ شروع ہی سے خاموش اور الجھی ہوئی۔ تقدیر نے اسے تاک تاک کر نشانہ بنایا تھا۔ وہ ننھے بچے کی اس گیند کی طرح تھی جسے وہ بے خبری کے عالم میں اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ اور گیند لڑھکتی ہوئی کبھی نشانے سے ادھر اور کبھی نشانے پر جا لگتی ہے۔

تقدیر نے اب اسے ڈاکٹر کے ہاں پھینکا تھا۔ ڈاکٹر کی شفقت آمیز ہمدردی اور اس کے گھر والوں کی بے لوث چاہت نے اس کے رستے ہوئے زخموں پر پھایا رکھ دیا تھا۔ لیکن زخموں کی پیپ۔ پھوڑوں کا گندہ مادہ اندر ہی اندر کلبلا رہا تھا۔ اس گندے مادے کی کربناک جلن اور اذیت ناک سوزش کو وہ چپ چاپ کہہ جانے پر مجبور تھی۔ وہ اک طوائف کی بیٹی تھی۔ طبلے کی تھاپ پر چھنک چھنک ناچنے والی کی بیٹی۔ رات کی تاریکیوں میں ان تاریکیوں سے بھی تاریک گناہوں کو جنم دینے والی بیوہ کی بیٹی۔ یہ بات ناہید کے لئے رسوا کن تھی۔

ناصرہ تیار ہو کر باہر آ گئی۔ دونوں بہنوں نے کتابیں اٹھائیں۔ ناہید کو سلام کیا اور کمرے سے باہر آ گئیں۔ ناہید کی آنکھوں کا اضطراب بڑھ گیا تھا...... وہ بے دلی سے اٹھی اور غسل خانے میں کل والے کپڑے لے کر چلی گئی۔ اسے اپنے ڈھیروں قیمتی ملبوسات یاد آ گئے۔ پیارے پیارے رنگوں کے ریشمی کپڑے جنہیں وہ بڑے سلیقے سے الماری میں رکھا کرتی تھی۔ اچھے کپڑوں کا اسے بچپن ہی سے بڑا شوق تھا۔ اور اس کے اس شوق کی تکمیل اس کی ماں خود بڑے شوق سے کیا کرتی تھی۔ کیوں کہ ناہید ہی اس کا منتہائے آرزو تھی۔ کنگھی کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر سے کچھ روپیہ قرض لینے کے متعلق سوچنے لگی۔ آج تک اس نے کسی سے کچھ مانگا نہ تھا۔ بے مانگے ہی سب کچھ مل جاتا تھا۔ قرضہ لینے کے خیال ہی سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔ لیکن مجبور تھی۔ اس کے پاس نہ کوئی کپڑا تھا۔ نہ جوتا۔ نہ ہی ضرورت کی اور کوئی چیز۔ "آخر حرج ہی کیا ہے۔ اس نے دل کو تسلی دی...... تنخواہ ملنے پر قرضہ چکا دوں گی۔" لیکن مانگنے کے لئے بھی تو ہمت درکار تھی۔ کس منہ سے مانگے گی۔ گھر کی ملازمہ نے آ کر اسے چائے کی اطلاع دی۔

"بیگم صاحبہ چائے پر انتظار کر رہی ہیں۔" نوکرانی اس کے لہراتے ہوئے گھنگھریالے بالوں کو دیکھ رہی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ جنہیں ناہید بڑی مشکل سے قابو میں لا کر باندھ رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سرکش لٹیں اس کی منور پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ اس کے رخ زیبا پر تصدق ہو رہی تھیں۔

"چلو" اس نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔ سنگار میز پر پڑی ہوئی گھڑی اٹھا کر کلائی پر باندھی اور ملازمہ کے ساتھ چلدی۔

میز پر قرینے سے چائے کے برتن لگائے گئے تھے۔ چائے دانی پر سرخ ٹی کوزی پڑی تھی۔ اور چھوٹا ملازم لڑکا دودھ کا جگ لئے دوسرے دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ ر حمان اور ان کی بیگم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

ناہید نے انہیں جھک کر سلام کیا۔

"آؤ بیٹا" ڈاکٹر ر حمان نے کہا۔ ناہید سمٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"شرماؤ نہیں بیٹی بے تکلفی سے ناشتہ کرو۔" بیگم ر حمان ناہید کی جھجک پر بول اٹھیں۔ "اپنا گھر ہی سمجھو اسے۔ ہم تو یہی سمجھ رہے ہیں۔ کہ اللہ میاں نے بیٹھے بٹھائے تمہارے جیسی پیاری بیٹی عنایت کر دی۔ ڈاکٹر ر حمان چائے پیتے ہوئے مسکرانے لگا۔ ناہید نے تشکرانہ انہیں دیکھا۔ اور ناشتہ کرنے لگی۔

"انہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہوگی۔" ڈاکٹر اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

"جتنے جی چاہے لے لیں۔"

ناہید کی مشکل ڈاکٹر نے حل کر دی تھی۔ وہ اس کی ممنون تھی۔ ڈاکٹر اس کے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہو رہا تھا۔ اور ناہید اس کے رحمت کے سایوں تلے سکون کا سانس لے رہی تھی۔

"آج شام کو فاخرہ ناصرہ کے ساتھ بازار جانا اور ضرورت کی چیزیں خرید لانا۔" چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پیار سے بڑے خلوص سے بیگم ر حمان بولیں۔

پھر بیگم ر حمان دیر تک کپڑوں کی گرانی کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ ناہید ان کے خلوص سے بڑی متاثر تھی۔ اس کے خیالات پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ماں کی طوائفیت کھوکھلی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔

ساڑھے آٹھ ہو چکے تھے۔ نو بجے ناہید کو قصر رعنا پہنچنا تھا۔ ڈاکٹر میز سے اٹھا۔ بیگم بھی اٹھی۔ اور ناہید نے بھی ان کی پیروی کی۔

"شام کو بازار ضرور جانا۔ پیسوں کا کوئی فکر نہ کرو۔ فاخرہ کو سب دکانیں معلوم ہیں۔ تمہیں کوئی دقت نہ ہوگی۔" بیگم ر حمان چابیوں کا بڑا سا گچھا گھماتے ہوئے بولیں۔

ناہید نے شکریہ ادا کیا۔ وہ مضمحل سی ہو رہی تھی۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے۔ کہ وہ اک طوائف کی بیٹی ہے۔ تو ناصرہ فاخرہ کو اس کے پاس پھٹکنے تک نہ دیں...... عجب دنیاداری ہے۔ یہاں خلوص بھی چند بندھے

اصولوں کے تحت برتا جاتا ہے۔ شفقت بھی جانے بوجھے قوانین کے ماتحت کی جاتی ہے۔ اگر انہیں اس کی اصلیت معلوم ہو جائے۔ تو سارا خلوص ساری شفقت دم بخود ہو کر رہ جائے۔ محبت پاش نظریں قہر برسانے لگیں۔ اور اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ گھر سے باہر کر دیا جائے۔ ناہید کی معصوم روح لرز اٹھی۔

..............○..............

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۶

شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کے خون کی لالی ابھی تک افق پر پھیلی ہوئی تھی۔ موسم خوش گوار حد تک خنک تھا۔ یہ سلطان پور کی آب و ہوا کی خصوصیت تھی۔ فضا ہمیشہ خوش گوار رہتی۔ پندرہ بیس دن کچھ حبس ہوتی تھی۔ ورنہ موسم عام طور پر اچھا ہی رہتا۔ سرما البتہ کافی سرد ہوتا تھا۔ ارد گرد کی پھیلی ہوئی پہاڑیوں پر برف پڑتی۔ اور برف سے ٹکرائی ہوئی ہوائیں موسم کو یخ کر دیتیں۔

قصر رعنا کی سرخ بجری والی سڑک اندھیرے میں کچھ ٹیالی ٹیالی سی دکھائی دے رہی تھی۔ سرو کے بلند درخت خاموش کھڑے تھے۔ نیلے رنگ کی لمبی چمکیلی کار بجری پر رینگتی ہوئی آئی اور پورٹیکو میں ٹھہر گئی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا ملازم باادب کھڑا ہو گیا۔ موٹر کا دروازہ کھلا۔ شمسہ بڑے اہتمام سے باہر نکلی۔ تراشے ہوئے بال مرمریں بازوؤں سے کھسکتی ہوئی سرخ ساڑھی۔ چست بلاؤز کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے بے قرار جسم۔ خوب صورت آنکھوں میں قہرمانی تناؤ۔ لمبی لمبی انگلیوں پر کیوٹکس آلود ناخن۔ چہرے پر اک آوارہ مسکراہٹ۔ یہ تھی شمسہ شہر کے متمول سیٹھ نظیر الدین کی اکلوتی بیٹی۔ جو اپنے حسن کے حدود اربعے سے بخوبی واقف تھی۔ اور اپنی دانست میں اپنے حسن کے تیروں سے منصور کے دل کو گھائل کر چکی تھی۔ عام لوگوں کا بھی خیال یہی تھا کہ منصور مستقبل قریب میں اس سے شادی کر لیں گے۔ خود منصور نے بھی کئی دوستوں کی دبی دبی زبان سے یہ ذکر سنا تھا۔ لیکن اس بات کو کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ شمسہ ان کے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ اور اس سے دوستی کی وجہ سے منصور کو شمسہ سے دوستانہ مراسم قائم رکھنے پڑ رہے تھے۔

برآمدے کا زینہ چڑھتے ہوئے شمسہ کو پچھلی دفعہ کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جب انہیں سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس کا پیر پھسل گیا تھا۔ اونچی ایڑھی کا نفیس سینڈل اس کے پاؤں میں تھا۔ پیر بری طرح مجروح ہو جاتا۔ لیکن گرنے سے پہلے منصور نے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا تھا۔ پیر معمولی سے دباؤ کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ منصور جلدی سے اس کا لطیف بوجھ اٹھائے ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے تھے۔ اسے صوفے پر لٹا کر

پاؤں سے سینڈل اتار دی تھی۔ شمسہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ان کے تومند بازوؤں کا کساؤ محسوس کر کے وہ فرحت سی محسوس کر رہی تھی۔

منصور نے جو کچھ کیا تھا۔ اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر کیا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ کچھ دیر کے لئے شمسہ کے حسن و جوانی کی قیامت خیزیوں کے معترف ضرور ہو گئے تھے۔ اس کا پاؤں سہلاتے ہوئے وہ اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن یہ جذباتی سکر تھی۔ جو کچھ دیر کے بعد خود بخود ہی رفع ہو گیا۔ منصور ڈوبنے سے پہلے کنارے پر آ گئے تھے۔ لیکن شمسہ کی حالت ان سے مختلف تھی۔ پہلے تو اس کے تعلقات منصور سے محض دوستانہ تھے۔ اور پرستاروں کا ایک وسیع حلقہ ہوتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کبھی بات بڑھانے کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد اس کے دل میں سوئے ہوئے لطیف احساسات جاگ اٹھے۔ اور وہ منصور سے دوستی کی حدوں سے آگے تعلقات بڑھانے کی خواہش محسوس کرنے لگی۔

اپنی اسی خواہش کے اتمام کے لئے آج وہ اک نئی شان سے' نئی وضع سے سج دھج کر منصور کے پاس آئی تھی۔

"صاحب" شمسہ نے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے باوردی ملازم سے پوچھا۔

اندر وہ ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

شمسہ آگے بڑھی۔ دروازے کا جھلملاتا ہوا ریشمی پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ منصور صوفے پر تقریباً نیم دراز بڑے مطمئن انداز سے سگریٹ پی رہے تھے۔ آبنوسی میز پر کیون اے کا ڈبہ کھلا ہوا پڑا تھا۔ اور چاندی کے خوبصورت راکھ دان میں جلے ہوئے سگرٹوں کے بے شمار ٹکڑے پڑے تھے۔ منصور نیم وا نظروں سے مرغولوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہر مرغولہ کئی چکر کھا کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اور اس تحلیل شدہ دھوئیں سے ایک ہی مجلا چہرہ ابھر رہا تھا۔ اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ۔ اپنی تمام دل آویزیوں کے ساتھ۔ وہ بڑی خاموشی سے اس ابھرنے والے چہرے کو دیکھتے ہوئے شام کے رنگین و سنگین حادثے پر غور کر رہے تھے۔ ناہید کو ایک بار دیکھا تھا۔ لیکن وہ بڑی اپنائیت سے ان کے مطلع حیات پر چھا گئی تھی۔

وہ ناہید کے متعلق سوچ رہے تھے۔ جس کے متعلق انہیں صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔ کہ اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ وہ تھرڈ ائر میں پڑھتی تھی اور رشتہ داروں کے مظالم سے تنگ آ کر ایک معتبر آیا کی مدد سے تلاش روزگار کے لئے گھر سے بھاگ نکلی تھی۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر حمان نے بتایا تھا۔ لیکن انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ناہید ان کے لاشعور میں مدتوں سے دبی بیٹھی تھی۔ اور آج اچانک شعور میں ابھر آئی ہے۔ وہ مدتوں سے اسے جانتے ہیں۔ وہ ان کی اپنی ہے۔ بالکل اپنی۔ وہ کچھ اس محویت کے عالم میں تھے کہ شمسہ کے اندر آنے کی انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہلو منصور" شمسہ نے انہیں متوجہ کرنے کے لئے آواز دی۔ وہ سگرٹ کے بکھرے ہوئے بے شمار ٹکڑوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

منصور نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ "اوہ آپ" کہتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کب تشریف لائیں۔ مجھے پتا ہی نہ چلا۔"

"اندھیرے میں کیا ہو رہا تھا۔ سو گئے تھے کیا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"سویا تو نہیں تھا۔" وہ کھسیانہ ہنسی ہنسے۔

"پھر کیا ہو رہا تھا۔"

شمسہ کا جی چاہ رہا تھا منصور کہہ دیں "آپ کی یاد میں غافل ہو رہا تھا۔" اسی لئے اس نے پھر پوچھا۔

"آپ کی آمد کا الہام ہو رہا تھا" منصور بولے۔ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے بٹن دبایا۔ کمرہ برقی روشنی میں جگمگا اٹھا۔ شمسہ کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمک رہی تھیں۔

"میری آمد کا الہام ہو رہا تھا۔" وہ منصور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ آنکھیں! جن میں تصورات کا لوچ تھا۔

"بالکل"

"اور غالباً آپ کو یہ بھی پتا چل گیا ہو گا۔ کہ مابدولت کا ورود کس سلسلے میں ہے۔"

"ضرور"

"بتایئے تو بھلا"

"پہلے تشریف رکھیئے" منصور صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

شمسہ اک ادائے دلربانہ سے بالوں کو پیچھے جھٹک کر بڑھی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ منصور اس کے سامنے کھڑے تھے۔ شمسہ کے آنے سے ان کے خیالات کا حسین تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اور وہ کچھ بے قرار سے ہو رہے تھے۔ اخلاقی بندشوں کی وجہ سے اس وقت وہ شمسہ کا خیر مقدم کرنے پر مجبور تھے۔

"ہاں تو بتایئے نا میں کیوں آئی ہوں" وہ بولی۔

"اس وقت سوائے کلب جانے کے آپ کو اور خیال ہی کیا آسکتا ہے۔" منصور نے سادگی سے جواب دیا۔

"اوں ہوں" وہ بڑے ناز سے اٹھلاتے ہوئے بولی۔ "غلط کہا آپ نے۔"

"پھر" منصور بڑے سے خوب صورت گل دان میں پڑے ہوئے پھولوں کی پتیاں نوچ رہے تھے۔

"یونہی ذرا گھومنے کو جی چاہ رہا تھا۔ آج موسم بے حد خوش گوار ہے۔ ایسے حسین سمے میں کمرے میں

مقید ہو کر رہ جانا انتہائی ظلم ہے۔" وہ اپنی طلائی چوڑیوں کو گھماتے ہوئے بولی۔ ساڑھی کا پلو شانے سے کھسک گیا۔ لیکن اس نے دانستہ اسے نہ اٹھایا۔

"باہر گھومنے کی بجائے آپ یہاں کیسے آگئیں" وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"آپ کو لینے آئی ہوں۔ اکیلے میں کیا لطف آتا" اس نے اک ساختہ ادا سے منصور کی طرف دیکھا۔ لیکن ناہید کی بے ساختہ اداؤں سے متاثر دل اس ساختہ ادا سے کیا تاثر لے سکتا تھا۔ منصور کچھ کھوئے سے کھڑے رہے۔

"چلئے نا" وہ ملتجی انداز میں بولی۔

منصور کو جیسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ وہ بولے

"آج تو کلب میں ڈنر بھی ہے"۔

"مجھے معلوم ہے" وہ ہنسی "پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کیجئے۔ ابھی بڑا وقت ہے۔ آٹھ بجے کلب پہنچ جائیں گے۔ اتنی دیر پہلے جانا کوئی ضروری تھوڑی ہی ہے"۔

"سب ممبر موجود ہوں گے۔ ذرا گپ شپ رہے گی"۔ منصور نے جواباً کہا۔

"یوں کہیئے کہ آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے" شمسہ روٹھنے کے موڈ میں آگئی۔ منصور کو مجبوراً ہاں کہنا پڑی۔ اسے وہیں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں تیار ہونے کے لئے چلے گئے۔ شمسہ صوفے کی پشت پر سر ٹکائے اپنی کامیابی پر نازاں ہو رہی تھی۔ ملازم چاندی کی طشتریوں میں پھل اور سوکھا میوہ رکھ کر چلا گیا۔ لیکن شمسہ اپنی دھن میں مست رہی۔

کچھ دیر بعد منصور آگئے۔ وہ اس وقت سیاہ ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کا مردانہ حسن اور نکھر آیا تھا۔

"چلئے" منصور کے کہنے سے پہلے ہی شمسہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے برآمدے میں آگئے۔ ملازم جھک کر پیچھے ہٹ گیا۔

برآمدے کے زینے سے اترتے ہوئے منصور کی نظر شمسہ کی پتلی ایڑھی والی نازک سی سینڈل پر پڑ گئی۔

آج پھر ویسی ہی سینڈل پہنی ہے"۔ منصور کو شمسہ کے گرنے کا واقعہ یاد آگیا۔

"آج پھر گر جانے کو جی چاہتا ہے"۔ اس نے گردن گھما کر منصور کو دیکھا انہیں اس کی آنکھوں میں اک آگ نظر آئی۔ ناہید کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید اس آگ کی لپک ان کا دامن بھی جلا ڈالتی۔ لیکن اس راہزن ہوش وحواس کو دیکھ چلے تھے۔ اس وقت وہ اپنے اور شمسہ کے درمیان کوسوں کا فاصلہ محسوس کر رہے تھے۔

"گر جاؤں" وہ جھومتے ہوئے بولی۔ اس کے لبوں پر ہنسی پھیل رہی تھی۔

"آج گریں تو گہری چوٹ کھائیں گی۔ سنبھل جایئے" کہتے ہوئے منصور موٹر کی طرف بڑھے۔ ان کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لہجے کی سردی نے شمسہ کی گرم جوشی کو تخ کر دیا۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ منصور نے بظاہر معمولی سی بات کہی تھی۔ لیکن جو وہ سمجھانا چاہتے تھے۔ شمسہ سمجھ گئی تھی۔

بڑی خاموشی سے موٹر چلاتے ہوئے وہ منصور کے جملے پر غور کر رہی تھی۔ اسے اپنی بے باکی پر ندامت ہو رہی تھی۔ اپنی شکست پر غصہ آ رہا تھا۔ منصور کی بات نے اس کے نسائی وقار کو کسی حد تک ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ اس جملے کو شاید کچھ اہمیت نہ دیتی۔ لیکن منصور کے لہجے کی خنکی اور اس قدر سنجیدگی سے بیٹھنا اسے بری طرح کھٹک رہا تھا۔

بڑی سڑک طے کرنے کے بعد موٹر کلب روڈ کی طرف گھوم گئی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں" منصور نے ناگوار سکوت کو توڑا۔

"کلب" سامنے شیشے پر نظر جمائے شمسہ بولی۔

"کیوں" وہ متعجب ہو کر بولے "آپ تو گھومنے کے لئے اصرار کر رہی تھیں"۔

"بس گھوم لیا" وہ اسی روکھے انداز میں بولی۔

منصور کے لئے اس کی ناراضگی کو سمجھنا دشوار نہ رہا تھا۔

"خفا ہو گئی" وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کس بات پر" اس کا لہجہ بدستور سرد تھا۔

"آپ گرنا چاہتی تھیں۔ میں نے بروقت آپ کو متنبہ کر دیا" منصور پھر سنجیدہ ہو گئے تھے۔ "ہم دونوں دوست ہیں شمسہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اسے سمجھیئے ......ہماری اسی میں بھلائی ہے۔ ہم ہمیشہ مخلص دوست رہ سکتے ہیں"۔

شمسہ خاموش رہی منصور نے اب تو بات کی وضاحت بھی کر دی تھی۔ شمسہ جل کر رہ گئی۔ کلب آ گیا موٹر رک گئی۔ منصور اترے...... شمسہ بیٹھی رہی۔

"آیئے"...... منصور اس کی طرف آتے ہوئے بولے

"میں گھر جاؤں گی"۔

"معلوم ہوتا ہے آپ سنجیدہ طور پر ناراض ہو گئی ہیں"۔

"نہیں تو" ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

منصور کے اصرار کے باوجود وہ گھر چلی گئی۔ انہیں اس کی حالت پر رحم بھی آیا۔ لیکن ان کی دوستی اسی اخلاص کی متقاضی تھی۔ انہوں نے شمسہ کو دھوکے میں نہ رکھا تھا۔

شمسہ کئی دن تک منصور سے نہ ملی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا رہی۔ منصور کی باتوں سے واضح نتیجہ نکلتا تھا۔ شمسہ

نے بیدار ہونے والے جذبات کو پھر سے سلا دینا ہی مناسب سمجھا۔ وہ دونوں دوست رہ سکتے تھے۔ دوستی کی حدود سے تجاوز کرنے کا خیال دبانا ہی پڑا۔ اور جب کئی دنوں کے بعد منصور اور شمسہ ملے تو یہ ملاقات شگفتہ رہی دونوں بے تکلف دوستوں کی طرح ملے۔

......☆......

دفتر کا کام بالکل معمولی تھا۔ تھوڑی سی کاوش سے ناہید ساری باتیں سمجھ گئی۔ وہ نو بجے مستعدی سے تیار ہو کر دفتر جاتی اور ایک بجے تک پورے انہماک سے پوری توجہ سے اپنے کام میں مشغول رہتی۔ اس مصروفیت نے اس کی ذہنی پریشانیوں میں بڑی حد تک کمی کر دی تھی۔ ماضی کا خوف اور فیروز کا دھڑکا یادوں سے کسی حد تک محو ہو چکا تھا۔ وہ پرسکون انداز سے زندگی کے نئے راستے پر گامزن ہو گئی۔

دفتر میں ایک چھوٹا سا الگ تھلگ کمرہ اس کے لئے مخصوص تھا۔ منصور کچھ دیر کے لئے اس کے کمرے میں آتے۔ اس کا کام دیکھتے ہوئے دو چار رسمی باتیں بھی ہوتیں۔ عام طور پر وہ کام دیکھتے اور ناہید لاتعلقی سے پن کے سرے سے کھیلتی رہتی یا بے خبری سے کسی جاذب النظر فریم میں لگی ہوئی خوب صورت تصویر کو دیکھنے میں منہمک ہو جاتی۔ لیکن اس لاتعلقی میں بھی اک تعلق ہوتا۔ اس بے خبری میں بھی اک خبر ہوتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی روح ہر زاویئے سے منصور کی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی ہے۔

سارے دن میں منصور سے چند لمحوں کا یہ ٹکراؤ اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ ٹکراؤ جو چنگاریاں پیدا کر رہا تھا۔ مدھم مدھم سی چمکتی ہوئی چنگاریاں جو راکھ کے ڈھیر تلے بھی نہیں بجھتیں جلتی ہیں اور جلائے جاتی ہیں اور مسلسل جلائے جاتی ہیں۔

سردیوں کا ایک حسین دن تھا۔ فضا سردی سے بوجھل سی ہو رہی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا اور بھیگی بھیگی ہوا چل رہی تھی۔ ناہید نے اٹھ کر مشرقی کھڑکی بند کر کے پردہ گرا دیا۔ ہیٹر چل رہا تھا۔ کمرہ تھوڑی دیر میں خوش گوار حد تک گرم ہو گیا۔ وہ لکھنے میں مصروف تھی۔ ہلکے فیروزی رنگ کے کپڑوں پر سیاہ سویٹر پہنے وہ میز پر جھکی ہوئی تھی۔ کاغذات میز پر پھیلے ہوئے تھے۔

منصور آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ لکھنے میں کچھ اس درجہ محو تھی کہ ان کی آمد کی خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ وہیں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ حسن بے پرواہ تصنع سے بے نیاز اک انوکھے انداز میں ان کے سامنے جلوہ گر تھا۔ وہ مسحور سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے۔

ناہید کچھ سوچنے کے لئے رکی۔ نگاہیں اٹھائیں منصور کو یوں کھڑے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ منصور آہستہ آہستہ بڑھے اور میز کی دوسری طرف رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میز پر پڑے ہوئے کاغذات کو یونہی الٹتے پلٹتے وہ ناہید کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اب تک نہ سنبھل سکی تھی اور لکھے ہوئے کاغذوں کو سمیٹنے کے بہانے اپنی گھبراہٹ چھپا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے بالکل خاموشی رہی۔ ایسی خاموشی جس سے دونوں کی روحیں آسودگی حاصل کر رہی تھیں۔

"آپ ابھی تک ڈاکٹر رحمان کے ہاں مقیم ہیں"۔ بالآخر منصور نے سکوت کو توڑا۔

"جی" نظریں اٹھائے بغیر ناہید نے جواب دیا۔

"وہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"

انہوں نے ایسا سوال کیا تھا۔ جس کا جواب ناہید کے پاس نہیں تھا۔

"میرا مطلب ہے وہاں سے آنے جانے میں آپ کو دقت ہوتی ہوگی...... دو میل"...... وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔

"میں بس سے آتی جاتی ہوں" ناہید نے آہستگی سے کہا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں" وہ کرسی کے پشت پر سر ٹکا کر چھت میں بنے ہوئے خوب صورت نقش و نگار دیکھنے لگے اور ناہید ان کی گفت گو سے کوئی مفہوم نکالنے کی کوشش میں اپنے ناخنوں کو پنسل سے رگڑنے لگی۔

"آپ وہیں رہنے کا فیصلہ کر چکی ہوں تو خیر" وہ قدرے توقف کے بعد بولے "ڈاکٹر رحمان اچھے آدمی ہیں"۔

وہ ہراساں سی انہیں دیکھنے لگی۔ فکر معاش سے تو وہ آزاد ہو چکی تھی۔ لیکن رہائش کا مسئلہ بڑی سوچ بچار کے بعد بھی وہ حل نہ کر سکی تھی۔ وہ تقریباً دو ماہ سے ڈاکٹر کے ہاں رہ رہی تھی۔ ناصرہ فاخرہ کی پرلطف صحبتوں ڈاکٹر اور ان کی بیگم کی اخلاقی سخاوتوں نے اجنبیت کے خلاء کو پر کر رکھا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو ان پر اک بوجھ سمجھتی تھی اور بوجھ سمجھنے کے باوجود وہ ابھی تک وہیں مقیم تھی...... وہ اکیلی جا بھی کہاں سکتی تھی۔ ایک فیروز سے چھٹکارا پا کر آئی تھی۔ لیکن اپنے چاروں طرف پارسائی کے لبادوں میں لپٹے ہوئے کئی فیروز نظر آتے تھے۔ کسی اکیلے گھر میں ایک ملازم کے ساتھ رہنا بھی معیوب تھا۔ تھوڑے سے عرصے میں وہ دنیا کی نظروں کو پہچان گئی تھی۔ تن تنہا کہاں جائے۔ اکیلی کیسے رہے۔ وہ اس کے متعلق صبح و شام سوچتی رہتی تھی۔ جتنا سوچتی تھی۔ اتنا ہی الجھتی جاتی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے ہاں رہ رہی تھی۔ اک مجبوری کے تحت...... وہاں رہ کر وہ کسی حد تک تو گرسنہ آنکھوں اور تشنہ نگاہوں سے محفوظ تھی۔

"میں وہاں رہنے پر مجبور ہوں" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"مجبور" منصور کچھ بے تاب سے ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"آپ میرے حالات جانتے ہیں" وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس

نے ان آنسوؤں کو چپکے چپکے پی جانا چاہا۔ لیکن منصور اس کے جھکے ہوئے سر کے باوجود ان آنسوؤں کو دیکھ چکے تھے۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو سختی سے دانتوں سے کاٹ رہے تھے۔ ان کی یہ حرکت ان کے قلبی ہیجان کی آئینہ دار تھی۔

"میرا مقصد آپ سمجھیں نہیں" وہ کرسی کی پشت کا سہارا لئے کھڑے تھے "دراصل لڑکیوں کے ہوسٹل میں دو کمرے خالی تھے۔ آپ کو جگہ کی ضرورت ہوگی"۔

وہ گھوم کر کھڑکی کی طرف بڑھے اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ ناہید نے موقع کو غنیمت جانا اور آنکھوں میں ٹھٹکے ہوئے آنسوؤں کو جلدی سے پونچھ ڈالا۔

"ہوسٹل میں تین استانیاں رہتی ہیں اور غالباً ساٹھ لڑکیاں جن کمروں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہ بالکل الگ تھلگ ہیں۔ اور محفوظ بھی" انہوں نے وضاحت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دوسرا یہاں سے بالکل نزدیک بھی ہیں" انہوں نے کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہوئے ناہید کی طرف دیکھا۔

"وہ دیکھئے یہاں سے عمارت نظر آ رہی ہے"۔

ناہید اٹھ کر کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ منصور ایک ہاتھ کھڑکی کا کھلا ہوا پٹ تھامے دوسرے ہاتھ کے اشارے سے اسے عمارت بتا رہے تھے۔ وہ ان کے آگے کھڑی تھی۔ اس کی پشت منصور کی طرف تھی بل کھاتی لہراتی بالوں کی لٹیں فیروزی ریشمی فیتے سے بندھی تھیں۔ ہلکی ہلکی مدہوش کن خوشبو نے منصور کی توجہ ان گھنیری زلفوں کی طرف مبذول کر دی۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کی تھکی ہوئی پژمردہ روح کو ان گھنیری زلفوں کے سائے ہی اطمینان بخش سکیں گے۔

بیگم رحمان کا لگاؤ ناہید کے ساتھ دن بدن گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ناہید کے ہوسٹل میں اٹھ جانے کی انہوں نے بڑی مخالفت کی۔

"ہم تو تمہیں اپنی بچی سمجھ رہے ہیں" وہ ناہید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کسی بات کا غم نہیں ہونا چاہئے"۔

لیکن ناہید نے انہیں سمجھایا بڑے اصرار کے بعد وہ رضامند ہوئیں۔ ناہید بھی ان سے بڑی مانوس ہو گئی تھی۔ لیکن اس وقت یہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔ اسی لئے باوجود سب گھر والوں کے اصرار کے وہ اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئی۔

بیگم رحمان جہاں جاتی۔ ناہید کے قصیدے ہی پڑھتی رہتی۔ اس کے حسن کا اس کے وقار آمیز برتاؤ کا اس کی سادگی کا قصہ کوئی محفل ایسی نہ تھی جس میں بیگم رحمان تفصیل کے ساتھ روداد نہ دہراتی۔ ہر چند ناہید نے اسے کوئی بات نہ بتائی تھی۔ لیکن ڈاکٹر رحمان سے اس کے حالات سننے کے بعد اس نے ایک اچھی خاصی حکایت بنا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لی تھی۔

"بہت بڑے خاندان کی بچی ہے" وہ بڑے وثوق سے اپنے ملنے والوں سے کہتی "باپ کا انتقال ہو گیا لیکن ماں زندہ تھی کسی کی مجال نہ تھی جو آنکھ بھر کر اسے دیکھتا۔ ماں کو قضا چھین کر لے گئی۔ تو رشتہ دار بھی اٹھ کھڑے ہوئے لاکھوں کا کاروبار تھا۔ جو ماں سنبھالے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی بے چاری پر افتاد آن پڑی۔ وہ تو خیر ہوئی جو آیا ایک ایمان دار عورت تھی ظالموں سے بچالائی اسے ورنہ وہ تو زہر دے چکے ہوتے۔ اللہ نے ہی بچالیا۔ ورنہ انہوں نے کسر تھوڑا چھوڑی تھی۔ مال و دولت صدقہ کیا۔ شکر ہے بچی کی جان بچ گئی۔ اللہ قسم میرا بس ہو تو ان کم بختوں کا منہ نوچ لوں۔ جو یتیم مسکین بچی کا مال غصب کر کے عیش اڑا رہے ہیں"۔

ناہید کے ہاتھ میں بڑے سے ہیرے کی چمکتی ہوئی بیش قیمت انگوٹھی اور آیا کا ہونا بیگم رحمان کے بیان پر مہر تصدیق تھی۔

جب ناہید اپنے گھر آئی تھی بیگم رحمان مع دونوں بچیوں کے کئی بار اسے ملنے آچکی تھی۔ ڈاکٹر رحمان بھی ایک آدھ دفعہ آیا تھا۔ لیکن ہسپتال کی مصروفیات کی وجہ سے چند منٹ ٹھہر کر چلا گیا تھا۔ ناہید بھی فرصت کے وقت ان کے ہاں چلی جاتی تھی۔ ڈاکٹر رحمان اس کا محسن تھا۔ اسی کی بدولت وہ ایک نئی زندگی کی راہیں استوار کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر اور اس کے گھر والوں کی دل سے قدر کرتی تھی۔ انہوں نے اسے اس وقت سہارا دیا تھا جب دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو چکی تھی۔ وہ اس کے لئے مشعل راہ بن گئے تھے۔

بیگم رحمان کے شفقت آمیز برتاؤ کے پس پردہ اپنے بھائی خلیق کے گھر کو آباد کرنے کی تمنا کروٹیں لے رہی تھی۔ خلیق اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ آنکھیں ذرا بڑی اور رنگ ذرا کھلتا ہوا ہوتا۔ تو شاید وہ ایک خوب صورت مرد ہوتا۔ معقول تنخواہ پاتا تھا۔ طبیعت کا بھی کچھ برا نہ تھا۔ بیگم رحمان ناہید کی نیک طبیعت اور اس کی طبعی شرافت کو اچھی طرح پرکھ چکی تھی۔ اس کے حالات کسی حد تک جانتی تھی۔ وہ اسے ایک شفاف سمندر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جس کی تہہ میں نگاہوں کو خیرہ کرنے والے درِ بے بہا نظر آ رہے تھے۔

"شاید میرے خلیق کی قسمت جاگ اٹھے۔ اسی لئے قدرت نے یہ انمول عطیہ ہمیں بخشا ہے" یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مسرت سے جھوم اٹھتیں۔ اور پھر اپنے تخیل کی وسعتوں سے خلیق کو لاکھوں کے کاروبار کا تنہا مالک دیکھتی۔ اس کے رہنے کی شاندار کوٹھی۔ اور سواری کی شورلٹ موٹر کا تصور کر کے اِن کا روں رواں خوشیوں سے پھڑکنے لگتا۔

"شادی کے بعد تو کسی کی جرأت نہ ہو گی۔ نپٹ لیں گے۔ ان ظالم رشتہ داروں سے" وہ دانت پیس کر ان رشتہ داروں کے متعلق سوچتی رہتی۔ آخر ایک دن اس نے اپنی اس ڈھکی چھپی خواہش کا تذکرہ ڈاکٹر رحمان سے کر ہی دیا۔

"ڈاکٹر حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"تم عورتوں سے خدا ہی بچائے۔" یہ کہتے ہوئے وہ طب کی موٹی سی کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔

"آخر اس میں قباحت ہی کیا ہے۔" اس نے کرسی ڈاکٹر کے قریب کھینچ لی۔

"تم تو مجھے یوں کہہ رہی ہو جیسے میں ناہید کا مختار ہوں" وہ کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے بولا "بہتر یہی ہے یہ بات یہیں پر ختم کر دو۔"

"وہ کیوں" وہ ماتھے پر شکنیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ناصرہ کی ماں۔ میں نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا نیک نیتی سے۔ خوف خدا سے ڈر کر۔ مصیبت کے وقت اسے مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے حتی المقدور اس کی مدد کر دی۔ خدا کارساز ہے۔ اسے نوکری مل گئی۔ اس کی زندگی سنور گئی۔" اس نے کتاب پر پھر نظریں جمادیں۔ بیگم کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

"نوکری مل جانے سے زندگی سنور گئی۔ کیا اچھوتا خیال ہے جناب کا۔ میں تو کہتی ہوں۔ مصیبتوں کا دور تو اب شروع ہو گا۔ غضب خدا کا جوان، حسین اور تن تنہا لڑکی......"

ڈاکٹر کو جیسے کوئی دقیق مسئلہ سمجھ آگیا ہو۔ کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ اور کرسی پر آگے کو جھک کر بیٹھ گیا۔ بیگم ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ ناہید ایک پر خطر مقام پر کھڑی ہے۔ وہ اکیلی اور بے سہارا لڑکی ہے، ہر نگاہ اس کی جانب بے باکی سے اٹھ سکتی ہے۔ ہر ہاتھ اس کی طرف بڑی سہولت سے بڑھ سکتا ہے۔ وہ زندگی کے پچاس سرد و گرم سال دیکھے ہوئے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا گستاخ نگاہوں اور بے باک ہاتھوں سے بھری پڑی ہے۔ نوکری مل جانے سے وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو چکی ہے۔ دو کمرے مل جانے سے رہائش کا مسئلہ بھی طے ہو چکا ہے۔ لیکن اس کا مستقبل اتنا ہی دھندلا ہے جتنا پہلے تھا"۔

وہ سوچ رہا تھا اور بیگم گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کسی عالی خاندان کی لڑکی ہے"۔ بالآخر ڈاکٹر بولا "یہ رشتہ کرنے سے پہلے سوچ لو"۔

بیگم یوں پھٹ پڑی جیسے ڈاکٹر نے بات نہیں کی بارود کو آگ دکھادی تھی۔

"تو کیا ہمارا خاندان چماروں کا ہے"۔ وہ چمک کر بولیں۔ غصے سے ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے "یا کوئی بھیک منگے ہیں ہم"۔

ڈاکٹر متحیر سا اسے دیکھنے لگا۔

"میں کہتی ہوں آخر کس بات کی کمی ہے ہمارے خاندان میں شرافت نہیں عزت نہیں۔ پیسہ نہیں"۔

"تم تو یونہی آپے سے باہر ہو رہی ہو بیگم" وہ نرمی سے بولا "میرا مطلب تھا۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کیا مطلب تھا ذرا میں بھی تو سنوں۔" وہ ابھی تک بپھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے نادانستہ ایسا جملہ کہہ دیا تھا۔ جو اس کے خاندانی وقار پر چوٹ تھی۔ اس چوٹ سے وہ اب تک تلملا رہی تھی۔

ڈاکٹر کو دراصل یہ بات کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ناہید اور خلیق کا جوڑا اسے پسند نہ آیا تھا۔ وہ فطرتاً بے جوڑ شادیوں کا مخالف تھا۔ اسی لئے اس نے ازراہ خلوص بیگم کو یہ بات کہی تھی۔ لیکن بیگم تو جیسے پہلے سے نبرد آزمائی کے لئے تیار تھی۔

"ناہید سے پوچھے بغیر یہ بات منہ سے نکالنا کسی طرح بھی مناسب نہیں بیگم۔"

بیگم کو تو سب سے زیادہ اس شادی کے تجارتی پہلو کا خیال تھا۔ لیکن ڈاکٹر کی بات بھی ٹھیک تھی۔ ناہید کا عندیہ لینا ضروری تھا اور اسے یقین تھا کہ ناہید اس کے رشتہ سے کبھی انکار نہ کرے گی۔

"اب آئے راہ راست پر" وہ اپنے ادھیڑ سے چہرے پر جوان تبسم لاتے ہوئے بولی۔

"لیکن اس سے پوچھے گا کون" ڈاکٹر کا انداز متفکرانہ تھا۔

"یہ بھی کوئی قلعہ فتح کرنا ہے نا" وہ بولی "اپنی ناصرہ فاخرہ پوچھ لیں گی۔ باتوں ہی سے مرضی کا پتہ چل جائے گا۔ دونوں بہنیں تو فریفتہ ہیں اس پر۔ یہ بات سن کر تو پاؤں نہیں پڑے گا زمین پر"۔

اور واقعی جب دونوں بہنوں کو اپنی ماں کا خیال معلوم ہوا تو وہ خوشی سے ناچنے لگیں۔

"امی آج ہی جائیں پوچھنے" فاخرہ نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"ہشت پگلی" ماں نے پیار سے ڈانٹا "ابھی نہیں کوئی موقع تو آلینے دو"۔

موقع بھی جلد ہی آ گیا۔ خلیق ایک ہفتہ کی چھٹی پر ان کے گھر آیا تھا۔ ماں باپ تو تھے نہیں ایک یہی بڑی بہن تھی۔ چھٹیاں گزرانے وہ اکثر ڈاکٹر رحمان کے ہاں ہی آیا کرتا تھا۔ جس دن وہ آیا۔ بیگم رحمان نے ناہید کی ساری کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔ بڑی حد تک بڑھا چڑھا کر۔ خلیق نوجوان تھا۔ اس کے دل میں امنگوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور وہ ناہید کو دیکھنے کے لئے بے تاب سا ہو گیا۔

دوسرے دن بیگم رحمان نے ایک شان دار دعوت دی۔ ناصرہ نے ناہید کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں دعوت میں شرکت کی بڑی تاکید کی۔ دعوت خلیق کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ اور مہمان ناہید کو بلایا گیا تھا۔ دراصل دونوں کو متعارف کرنے کی ایک چال تھی۔ جو بیگم رحمان کے زیرک دماغ نے چلی۔

جس وقت ڈاکٹر کا نوکر رقعہ لے کر ناہید کے ہاں پہنچا وہ بر آمدے میں ایک آرام کرسی پر لیٹی اپنے بھیگے ہوئے بال سکھا رہی تھی۔

وہ اپنے گھر سے جلد ہی مانوس ہو گئی تھی۔ دو آراستہ کمرے اس کی ضرورت کے لئے کافی تھے۔ اس کی ذہنی کلفتیں بڑی حد تک مٹ گئیں۔ منصور نے اس کی رہائش کا پیچیدہ مسئلہ جس خوبی سے حل کیا تھا اس کے ذہنی

الجھاؤ کو جس خوبی سے سلجھایا تھا وہ دل ہی دل میں ان کی بلند کرداری کی معترف ہو گئی تھی۔ اس کا دل ان کے لئے بے پناہ عقیدت محسوس کرنے لگا تھا۔ عقیدت جس میں والہانہ انسیت کا رنگ تھا۔ بے لوث چاہت کی چاشنی تھی۔ اسے اکثر یوں محسوس ہوتا جیسے منصور اس کی زندگی کا محور ہیں۔ اور اس کے وجود کی تخلیق ہی محض اس محور کے گرد گھومنے کے لئے ہوئی ہے۔

آج چھٹی تھی۔ اور صبح صبح ہی وہ نہا دھو کر بر آمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر تقریباً نیم دراز اپنے بھیگے بال سکھا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ آ رہی تھی۔ ناہید اپنی مخروطی انگلیاں بالوں میں پھیر رہی تھی۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ اور انہیں سلجھاتے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے آیا کا خیال آ گیا۔ بچپن ہی سے وہ اس کے بال بڑی محبت سے سلجھایا کرتی تھی۔ وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ لیکن اب تک یہ فرض آیا ہی کے ذمے تھا۔ آیا اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے کنگھی کیا کرتی۔ اور وہ اک مسرت بخش سی غنودگی میں ڈوبتے ہوئے آیا کی جھولی میں سر رکھ دیا کرتی تھی۔

کتنی شفیق تھی۔ کتنی مہربان تھی آیا۔

آیا کے خیال کے ساتھ ہی اسے اپنی زندگی کا پچھلا دور یاد آ گیا۔ دھیان ماں کی طرف راغب ہونے لگا۔ ماں...... اس نے اپنے جذبات کا تجزیہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اسے ماں کے نام کے ساتھ اک بیزار سی محبت اک چڑچڑے سے لگاؤ کا احساس ہونے لگا۔ کاش اس کی ماں ایک مالدار طوائف کی بجائے اک غریب مگر شریف بیوہ ہوتی۔ طوائف! کتنا مکروہ لفظ تھا۔

اور طوائف کے عقب میں اسے فیروز کی دو گھورتی ہوئی آنکھوں کا خیال آ گیا۔ فیروز جو بظاہر ایک شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کی روح کی ساری خباثت اس کی چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جمع تھی۔ ان آنکھوں کو غور سے دیکھنے پر اس کی ظاہرداری کا پردہ تار تار نظر آنے لگتا تھا۔ فیروز کے خیال کے ساتھ ہی اسے اپنے فرار کی رات یاد آ گئی۔

خیالات اک تسلسل سے امنڈے چلے آ رہے تھے۔ اور وہ اپنی انگلیاں بالوں میں بے قراری سے پھیرے جا رہی تھی۔ اس تسلسل نے اسے نڈھال سا کر دیا۔ اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ سکون غائب ہو گیا۔ اور اس کے احساس پر اک خفیف سی کپکپی طاری ہو گئی۔ سر جھٹک کر اس نے ان خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سنگار میز کے بڑے آئینے میں اس نے اپنا سراپا دیکھا اپنی گہری اور نشیلی آنکھوں میں جھانکا۔ آنکھوں کی گہرائیوں میں اسے ڈوبتے پھیلتے خوف کے سائے نظر آئے۔ خوف و ہراس جس کی تہہ میں اس کے ماضی کی یادیں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس نے چاہا کہ اس کا ماضی لاشعور کی لہروں میں ڈوب جائے۔ ماضی جو حال کے سینے میں لوہے کی میخ کی طرح گڑا ہوا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ملازمہ کی آواز نے لمحہ بھر کے لئے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یہ لفافہ ہے بی بی" وہ نیلے رنگ کا لفافہ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"کون لایا ہے"

"ڈاکٹر صاحب کا نوکر دے گیا ہے۔"

اس لفافے پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ آہستگی سے چاک کیا۔ نیلے کاغذ پر اس کے نام خط لکھا تھا۔ وہ پڑھنے لگی۔ ناصرہ نے اسے دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ بڑے اصرار کے ساتھ۔ "انکار کی گنجائش نہیں۔" یہ جملہ اس نے متعدد بار لکھا تھا۔

"چلا گیا نوکر" اس نے خط ختم کر کے سنگار میز پر ہی رکھ دیا۔

"جی" نوکرانی نے جواب دیا۔ "وہ تو رقعہ دے کر ہی چلا گیا تھا۔"

"بس جاؤ۔"

نوکرانی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور ناہید سوچنے لگی۔ کہ جائے یا نہ جائے۔ دراصل آج وہ کہیں جانے کے موڈ میں نہ تھی۔ چھٹی تھی۔ اور وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ کچھ پرانی یادوں نے اسے مضمحل کر دیا تھا۔ نوکر جا چکا تھا۔ ورنہ اسی کے ہاتھ وہ معذرت کر بھیجتی۔ اب کس کے ہاتھ جواب بھیجے۔ اور بغیر جواب دیئے نہ جانا بھی خلاف تہذیب تھا۔

بڑی دیر لاحاصل سی سوچ کے بعد اس نے جانا ہی مناسب سمجھا۔ "دل ہی بہل جائے گا۔" اس خیال کے آتے ہی وہ بے دلی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اور قرینے سے رکھے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر لباس کا انتخاب کرنے لگی۔

سردی کی شدت ختم ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ نے موسم کو بڑا سہانا اور رنگین بنایا ہوا تھا۔ زرد زرد دھوپ خوشگوار حد تک بھلی لگتی تھی۔ دس بج چکے تھے۔ ناہید نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے۔ اس کا پیازی پیازی رنگ ان کپڑوں کے عکس سے گہرا ہو گیا۔ بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہلکے گلابی رنگ کے ربنوں سے باندھ کر انہیں شانوں پر چھوڑ دیا۔ کھلے بال بل کھاتی ناگنوں کی طرح مچلنے لگے۔

"گرم کپڑے کی ضرورت نہیں" اس نے کالی شال تہہ کر کے الماری میں رکھ دی۔ اور کپڑوں کے ہمرنگ باریک سا دوپٹہ اوڑھتے ہوئے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔

"آجائیں" دروازے کا پردہ ہٹائے بغیر شیریں نے اجازت چاہی۔

"آجاؤ" ناہید کے کہنے سے پہلے ہی شیریں کمرے میں آ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سنہری لفافہ تھا۔ دعوتی رقعہ معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کدھر کی چڑھائی ہو رہی ہے آج۔" شیریں ناہید کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر رحمان کے ہاں جا رہی ہوں۔" ناہید کانوں میں موتیوں کی خوب صورت بالیاں پہنتے ہوئے بولی۔

"اللہ خیر کرے مجھے تو بیچارے ڈاکٹر پر رحم آتا ہے۔ پر خیر بوڑھا ہے۔"

شیریں نے کچھ منہ اس طرح بنایا۔ کہ ناہید کو ہنسی آگئی۔

شیریں ایک سانولی سلونی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ ناہید کے ساتھ ملحقہ کمروں میں وہ رہتی تھی۔ ہائی سکول میں پڑھاتی تھی۔ والدین مر چکے تھے۔ ایک بھائی تھا۔ جو بھابی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کر بہن کو بھی بھول چکا تھا۔ حالات کی یکسانیت نے ناہید کو شیریں کے بہت قریب کر دیا تھا۔ چند دنوں ہی میں وہ بے تکلف سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اپنے اپنے کام کے بعد ان کا وقت اکثر اکٹھے ہی گزرتا۔

"یہ کیا ہے" ناہید نے شیریں کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سنہری لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں بتاتے" وہ لفافہ چھپاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی تھی اور چہرہ سنجیدہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ناہید نے لفافہ چھیننے کی نیت سے تیزی سے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"اللہ رے بے تابی۔" شیریں اس کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے بولی۔

"کیا ہے بتاتی کیوں نہیں۔" ناہید کھسیانی سی ہنسی ہنسی۔ "اللہ رے بے تابی" کہہ کر شیریں نے اس کے تجسس کو اور بڑھا دیا تھا۔

"دعوت نامہ ہے۔" شیریں دور سے لفافہ دکھاتے ہوئے بولی۔

"وہ تو نظر ہی آ رہا ہے۔ کہاں سے آیا دعوت نامہ۔" شیریں کے جواب پر ناہید خاموش ہو گئی۔ دوپٹہ درست کرتے ہوئے وہ پھر سنگار میز کے قریب پہنچ گئی۔ شیریں نے اسے ستانے کی نیت سے پھر کہا۔ "لو دیکھ لو" اس نے اک لمحہ کے لئے لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے کر کے واپس کھینچ لیا۔ ناہید نے معمولی سی بات کو طوالت نہ دینا چاہی۔ بالوں کی جھولتی ہوئی سرکش لٹوں کو کھینچ کر وہ پنوں میں جکڑنے لگی۔

"قصر رعنا سے آیا ہے دعوت نامہ۔" شیریں پھر بولی۔

ناہید کا دل ایک بار تیزی سے اچھلا۔ اس نے گھوم کر شیریں کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے لفافہ چھیننے کی خواہش محسوس کی۔ لیکن شیریں کی شرارت آمیز مسکراہٹ دیکھ کر جرأت نہ کر سکی۔

"میں حیران ہوں"۔ شیریں بڑے اطمینان سے پلنگ پر بیٹھ کر کہنے لگی۔ "دعوت نامہ تمہارے نام

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آنا چاہئے تھا۔ میرے نام کیوں آیا۔ ”

شیریں کو بلاوہ آیا تھا۔ ناہید کو نہیں۔ اس خیال سے ناہید کچھ بجھ سی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنی ملازمت کا خیال آگیا۔ وہ منصور کے پاس ملازم تھی...... اور دعوت نامہ منصور کی ستائیسویں سالگرہ کے شان دار جشن میں شرکت کا تھا۔ دفتر کی معمولی کلرک کی شرکت ایسے جشن کے لئے ضروری تھوڑا ہی تھی۔ کلرک اور ملازمت کتنے تحقیر آمیز لفظ تھے۔ وہ چپ سی ہو گئی۔

” خاموش کیوں ہو گئیں۔ ” ناہید کے کندھے پر شیریں نے ہاتھ رکھ دیا۔ ” گھبراؤ نہیں۔ میں اکیلی تھوڑا ہی جاؤں گی۔ تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ اتنے رش میں کیا پتہ چلے گا کسی کو۔ ”

شیریں کی بات پر ناہید کو غصہ آگیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن وہ خاموش ہی رہی۔ شیریں اس کے تیور دیکھ کر سمجھ گئی۔ ناہید ایک جذباتی لڑکی تھی۔ اور فوراً اسے غصہ آجاتا تھا۔ اس نے لفافہ ناہید کے ہاتھ میں دے دیا۔ بڑے سے سنہری لفافے پر مس ناہید لکھا ہوا تھا۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے تاریک گوشوں میں فروزاں شمعوں نے اجالے بکھیر دیئے ہوں۔ لفافے کو کچھ دیر وہ ہاتھ میں لئے کھڑی رہی۔

” کچھ عجیب سی بات ہے۔ ” شیریں ابھی تک شوخی سے مسکرا رہی تھی۔

” کیا ” اس نے ڈرتے ڈرتے شیریں کو دیکھا۔

” میرے اور بیگم حق کے نام بھی دعوتی کارڈ آئے ہیں۔ ”

” تو عجیب بات کیا ہوئی۔ ”

” اس سے پہلے تو کبھی ہمیں جشن میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی...... وہ ناہید کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ” تین سال سے تو میں بھی یہاں ہوں۔ اور جشن ہر سال بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ ”

ناہید خاموش رہی۔

” تمہارے طفیل ہم بھی قصر رعنا دیکھ لیں گے۔ شیریں نے اس کی آنکھوں میں بےباکی سے آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

” میرے طفیل کیوں ” وہ آہستگی سے بولی۔

” ارے بھائی۔ ہمیں کون بلاتا تھا۔ تمہیں مدعو کرنے کے لئے ساتھ میں ہمیں بھی دعوت دے دی گئی۔ ” وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ” ہمیں تو بڑی مدت سے الہام ہو چکا تھا۔ بچ کر جا بھی کہاں سکتے تھے نواب منصور...... ان زلفوں سے زنجیروں نے جکڑ ہی لیا...... ”

ناہید کا چہرہ بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو گیا...... منصور کی وہ چپکے چپکے پرستش کئے جا رہی تھی۔ چاہے جا رہی

تھی۔ لیکن شیریں کے ساتھ باوجود بے تکلف ہونے کے اس نے کبھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

” شیریں تمہارا مذاق بعض اوقات آزاد ہونے کے علاوہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔ ” اس کا لہجہ بڑا افسردہ تھا۔

” برا مان گئیں۔ ” شیریں اس کے افسردہ انداز سے بڑی متاثر ہوئی۔ بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ” معاف کر دو ناہید۔ ”

ناہید کے ہونٹوں پر اک زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

گیارہ بجے کے قریب ہسپتال کے نزدیک بس سے اتر کر وہ ڈاکٹر کے بنگلے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اب تک شیریں کے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔

” کیا میری وجہ سے واقعی انہیں بھی مدعو کیا گیا ہے۔ ” یہ خیال مسرور کن تھا۔ ” لیکن کہاں منصور اور کہاں میں۔ ” دوسرا خیال پہلے خیال کی لطافت کو تلخی میں بدل رہا تھا۔

کچھ صبح ہی ماضی کی یلغار۔ اور کچھ اس وقت کے متضاد خیالات نے اسے مضمحل سا کر دیا۔ یہاں آنے کی بجائے وہ اپنے بستر میں آرام کرنے کی خواہش محسوس کرنے لگی۔ لیکن اب آچکی تھی۔ سست قدموں سے وہ بنگلے میں داخل ہو گئی۔

ناصرہ اور فاخرہ اس کے انتظار میں چمن ہی میں ٹہل رہی تھیں۔ چھوٹے سے خوب صورت بنگلے کے سامنے مختصر سا چمن تھا۔ لیکن ایک چابک دست مالی اور ان دونوں بہنوں کے ذوق گلبانی اور شوق باغبانی نے چھوٹے سے چمن کو نظر فریب بنا دیا تھا۔

” بڑی راہ دکھائی آپ نے۔ ” دونوں بہنیں لپک کر اس کی طرف بڑھیں۔

” اپنے آپ تو آنے کی آپ نے قسم کھا رکھی ہے۔ ” ناصرہ نے شکایتاً کہا۔

” گھنٹہ بھر سے کھڑے کھڑے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ میری تو ٹانگیں بھی درد کرنے لگیں۔ ” فاخرہ بولی۔ ناہید دونوں بہنوں سے ہنستے ہوئے ملی۔ ان کے خلوص سے بڑی متاثر ہوئی۔

” آج میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ لیکن دیکھ لیں آپ نے بلایا...... اور میں آگئی۔ ”

تینوں ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ صاف ستھرا۔ ہلکے سے فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ بیگم رحمان وہیں بیٹھی تھیں۔ ناہید نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ انہیں کے قریب صوفے پر وہ بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں۔

” ہم تو ہر روز تمہاری راہ دیکھتے ہیں۔ اور تم مہینے بعد بھی نہیں آتیں۔ ” بیگم رحمان نے بھی گلہ کیا۔

” آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے خالہ جان۔ لیکن دفتر جانا ہوتا ہے۔ اتنا تھک

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جاتی ہوں کہ کہیں باہر نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ ہفتہ میں ایک چھٹی ہوتی ہے۔ "

"وہ شیریں کے ساتھ باتیں کرتے گزر جاتی ہے۔" ناصرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں جی ہم کوئی شیریں کے ساتھ تھوڑا ہی مل سکتے ہیں۔" ناصرہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"انہیں باتوں کی وجہ سے تو تم مجھے بے حد عزیز ہو۔" ناہید فاخرہ کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے بولی۔

بیگم رحمان ہنستے ہوئے اٹھی۔

"تم لڑ جھگڑ لو۔ میں ذرا باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔ مجید جانے کیا پکا رہا ہے۔ دعوت کے دن تو مرگ آجاتی ہے اسے۔"

وہ پردہ اٹھا کر باہر چلی گئی۔

"کوئی خاص تقریب ہے آج؟" ناہید نے اس کے جانے کے بعد ناصرہ سے پوچھا۔

"ہاں" فاخرہ شوخی سے ہنستے ہوئے بولی۔ ناصرہ نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ڈانٹا۔ ناہید کچھ نہ سمجھ سکی۔

"آج ہمارے ماموں جان آئے ہیں۔" ناصرہ سنجیدگی سے بولی۔ اس کے باوجود فاخرہ کے ہونٹوں پر ہنسی تھی۔

"ماموں آئے ہیں۔ تو مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ بلایا اور وہ بھی اتنے اصرار کے ساتھ۔" ناہید سوچنے لگی۔ اس کی سوچ کے زاویئے تیزی سے بدلنے لگے۔ فاخرہ نے کالج کی باتیں شروع کر دیں۔ ناصرہ ماں کا ہاتھ بٹانے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اور ناہید کا خیال بھی ہٹ گیا۔

کھانے کے میز پر اس کا خلیق سے تعارف ہوا۔ ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس خلیق اس کے عین سامنے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ عمر بھر کے ولولوں کا شوق نگاہوں میں لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ناہید دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ آج کی دعوت کا مقصد کچھ مخفی نہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اور اس کی سوچ کے دائرے الجھ رہے تھے۔

"آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔" ناصرہ نے مچھلی والی پلیٹ آگے بڑھائی۔

"بے تکلف ہو کر کھاؤ بیٹی۔" بیگم رحمان میز کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی اور مرغے کی ٹانگ سے گوشت نوچ رہی تھی۔

"شاید میری وجہ سے ہاتھ روکے ہوئے ہیں۔" خلیق مسکراتے ہوئے بولا۔

"جی نہیں" ناہید کے لہجے کی تختی کو خلیق نے محسوس کیا۔ "میری طبیعت آج ٹھیک نہیں۔"

"کیا ہو گیا" ڈاکٹر رحمان شامی کباب اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

ناہید کو اپنا یوں موضوع بن جانا کچھ پسند نہ آیا۔

"یونہی۔ طبیعت کچھ بوجھل سی محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ فاخرہ کی شوخی اور ناصرہ کی تنبیہی نظروں کا راز ناہید کے سامنے کھل گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

ناصرہ فاخرہ اور خلیق باتیں کرتے رہے۔ خلیق ان سے چند سال بڑا تھا لیکن تینوں بے تکلف تھے۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ بیگم رحمان بڑے پیار سے بھائی کو دیکھتی رہی اور ڈاکٹر رحمان سنجیدگی سے ناہید کے خاموش چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔

کھانے کے بعد ناہید ناصرہ کے کمرے میں آ گئی۔

"آپ کچھ تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیٹ جائیے۔" پلنگ پوش ہٹاتے ہوئے اس نے تکیہ درست کر کے رکھا۔

"نہیں ناصرہ۔ میں گھر جاؤں گی۔" ناہید ملول سی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔

"ابھی سے"

"ہاں"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ناصرہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ فاخرہ بھی آ گئی۔ ناہید نے جانے کے لئے اصرار کیا۔

"ابھی تو ماموں جان کے ساتھ سینما کا پروگرام ہے۔" فاخرہ ہنستے ہوئے بولی۔ اور اس ماموں جان کے بار بار تذکرے سے ناہید کو چڑ سی ہو گئی۔ اس کا ذہنی الجھاؤ تھکان کی صورت میں اس کے چہرے سے مترشح تھا۔

"میں ابھی گھر جاؤں گی۔" اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"اور سینما" فاخرہ بولی۔ "ماموں آج سینما دکھا رہے ہیں۔"

"تم چلی جانا میرا جانا ضروری تھوڑا ہی ہے۔" اس نے قدرے تلخی سے کہا۔

"آپ کے بغیر ہمیں کون لے جاتا ہے۔" فاخرہ شوخی سے ہنسی۔ "آپ ہی کے لئے تو ماموں نے پروگرام بنایا تھا۔ ورنہ توبہ کیجئے۔ خلیق ماموں اور ہمیں ساتھ لے جائیں۔"

فاخرہ نے یہ کھلم کھلا حملہ کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر رحمان کے احسانوں تلے دبی ہوئی ناہید اپنا غصہ پی گئی۔ خاموشی ہی میں مصلحت سمجھی۔ فاخرہ چھوٹی تھی۔ اپنی دانست میں بار بار خلیق کا ذکر کر کے وہ ناہید کا عندیہ لے رہی تھی۔ ناصرہ سمجھ دار تھی۔ ناہید کے اضمحلال کی وجہ سمجھ رہی تھی۔ اسی لئے فاخرہ کی اوٹ پٹانگ باتوں پر اسے گھور رہی تھی۔

فاخرہ کسی طرح خلیق اور ناہید کے ایک رشتے میں منسلک ہو جانے کے خیال کو ناہید پر ظاہر کر دینا چاہتی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ جب سے اس نے ماں سے سنا تھا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ ناہید سے اسے گہرا انس تھا۔ اسی لئے وہ اس رشتہ کی موزونیت یا ناموزونیت سے قطعاً بے پرواہ تھی۔ اسے تو اس بات کی خوشی تھی۔ کہ ناہید سے ان کی قریبی رشتہ داری ہو جائے گی۔ وہ ان کی اپنی بن جائے گی۔

"ابھی ابا جان چلے گئے ہیں۔ وہ آکر آپ کو موٹر پر چھوڑ آئیں گے۔" ناصرہ نے کہا۔ کیوں کہ ناہید کا گھر جانے کے لئے اصرار ضد کی حد تک بڑھ چکا تھا۔

"انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔" ناہید جلدی سے بولی...... "میں بس سے چلی جاؤں گی۔"

"خلیق ماموں غصے ہو جائیں گے۔" فاخرہ پھر بولی۔ آپ کے چلے جانے سے ہمارا سینما بھی رہ جائے گا۔ رک جایئے نا۔" وہ ملتجی نظروں سے ناہید کو دیکھنے لگی۔

"پھر کسی دن آجاؤں گی آج مجھے جانے دو۔ بس کا وقت ہے۔ میں جاتی ہوں۔" وہ اپنا دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

"بے چارے خلیق ماموں۔" فاخرہ بڑبڑائی۔ "کتنے شوق سے کہہ رہے تھے سینما لے جانے کو۔ آج تو آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔ لیکن جب......"

ناصرہ چیخی۔ "بڑی بدتمیز ہو فاخرہ۔ زبان تو قینچی کی طرح چل رہی ہے۔"

فاخرہ کی ادھوری بات سے پورا مطلب واضح تھا۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ منڈی میں پڑا ہوا غلے کا ایک ایسا ڈھیر ہے جس پر بولی دینے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ اپنی بے چارگی پر اسے رونا سا آگیا۔

بس سٹینڈ پر کھڑی وہ بے صبری سے بس کا انتظار کر رہی تھی۔ خلیق کی نظروں اور فاخرہ کی باتوں سے اس کا ذہن لہولہان ہو رہا تھا۔ زخمی ذہن سے رستے ہوئے خون کے یہ قطرے آنسو بن کر بہہ جانے کو تڑپ رہے تھے۔ اپنی بے قراری کو سینے سے لگائے وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ فٹ پاتھ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ قریب ہی خوانچے والا بوڑھا اسے بھوکی نظروں سے دیکھتا ہوا اپنی داڑھی کھجا رہا تھا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے پریوں کی کہانی سنتے ہوئے ناپختہ ذہن بچہ پری کو تصور میں دیکھتا ہے۔ پرلی طرف ایک نوجوان اپنی ٹائی کی گرہ کو ڈھیلا کرتے ہوئے ہلکی ہلکی کھانسی سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چوڑی سپاٹ سڑک پر کالج کے بے فکر لونڈے اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور خواہ مخواہ کی بحث کرتے ہوئے اسے بار بار دیکھ رہے تھے۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ بس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ناہید کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ اس کی بیکلی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ جلد از جلد گھر پہنچ کر بستر پر گر جائے۔ اس نے ارادہ کیا کہ تانگے پر چلی جائے۔ لیکن راستہ سنسان تھا۔ اور لوگوں کی اخلاقی پستی کا اسے کافی حد تک تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے اس ارادہ

کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکی۔

یہ سڑک کوئی شاہراہ عام نہ تھی۔ ہسپتال کی وجہ سے بس یہاں رکتی تھی۔ اور یہاں سے چڑھنے اور اترنے والی سواریاں عام طور پر زرد رُو اور دوسروں کا سہارا لئے ہوئے بیمار بیمار زندگیاں ہوتیں۔

بس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ کھمبے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ بڈھا برابر اپنی داڑھی کھجائے جا رہا تھا۔ نوجوان بدستور ٹائی پر ہاتھ رکھے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اور کالج کے لونڈے بے مقصد بحث میں الجھے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر اس طرف دیکھا جدھر سے بس آنے کی توقع تھی۔ دور سے سڑک کے صاف و شفاف سینے پر بادامی رنگ کی شورلیٹ خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ کے کنارے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اور مایوسی سے بادامی رنگ کی موٹر کو دیکھنے لگی۔

موٹر گذر گئی۔ لیکن دو چار گز کے فاصلے پر اک جھٹکے سے رک گئی۔ ناہید موٹر میں بیٹھے ہوئے منصور کو دیکھ چکی تھی۔ اس کا دل اس زور سے دھڑکا تھا۔ کہ وہ خود ہی گھبرا گئی تھی۔ منصور موٹر سے اتر کر جلدی سے اس کے پاس آئے۔

"آپ" وہ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"بس ابھی نہیں آئی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"آیئے۔ میں آپ کو پہنچا دوں گا۔" اس کا بس سٹینڈ پر یوں کھڑے ہونا انہیں ناگوار تھا۔

وہ اک جھجک کے ساتھ ان کے ساتھ چل دی۔ منصور نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ناہید نے آگے بیٹھنے پر کچھ تامل کیا۔ منصور اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ مجبوراً اسے بھی بیٹھنا پڑا۔ وہ لجاتی شرماتی سکڑ کر ایک طرف لگ کر بیٹھ گئی۔

ٹائی کو ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے وہ نوجوان حواس باختہ سا سڑک پر جاتی ہوئی موٹر کو دیکھ رہا تھا۔ کالج کے لونڈے بحث کو ختم کر کے منتشر ہو گئے تھے۔ اور بڈھا خوانچے والا یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے پریوں کے دیس کی شہزادی کو اس کا محبوب شہزادہ اڑنے والے گھوڑے پر بٹھا کر کہیں لے گیا ہو۔

اس حسین اتفاق نے دوپہر کے واقعے کی تلخی کو کسی حد تک کم کر دیا۔ ناہید کی حالت اس بچے کی سی تھی۔ جسے کڑوی دوائی کا گھونٹ پلانے کے بعد شکر کا بھرا پیالہ دے دیا جائے۔ اور شکر کی موجودگی کا احساس دوائی کی کڑواہٹ کو بھلا دے۔

وہ دل ہی دل میں خلیق کی بے باک اور گھورتی ہوئی نظروں کا موازنہ منصور کی شائستہ اور ملائم نظروں سے کر رہی تھی۔ منصور کی نگاہیں اس کے رگ وپے میں کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی سنسنی پیدا کر دیتی تھیں۔ اس کی روح لطیف سی گدگدی محسوس کرنے لگتی تھی۔ لیکن خلیق کی نظروں نے تو جیسے رگوں میں خون کی بجائے سیال

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آگ بھر دی تھی۔

موٹر پر اک جھٹکا لگا۔ خیالات میں کھوئی ہوئی ناہید کا سر منصور کے کندھے سے جا ٹکرایا۔ اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے بال منصور کے کندھے پر پھیل گئے۔ منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے تپتے ہوئے ریتلے میدان میں انہیں گھرے بادلوں کی ٹھنڈی چھاؤں میسر آ گئی ہو۔ انہوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی۔ وہ ابھی بوکھلائی ہوئی تھی۔ لطف و ندامت کے ملے جلے جذبات سے اس کا گلگوں چہرہ کچھ بھیگ سا گیا تھا۔

"بڑا خطرناک موڑ تھا" سٹیرنگ پر اطمینان سے ہاتھ رکھے منصور نچلے ہونٹ کے دائیں گوشے کو دانتوں تلے دباتے ہوئے مسکرائے۔ ناہید ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔

"بڑے پیچیدہ موڑ آئیں گے۔" وہ پھر بولے۔ ان کا چہرہ اب تک متبسم تھا۔

ناہید سمجھ نہ سکی کہ وہ کن موڑوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ سامنے موٹر کے شفاف شیشے سے سڑک نظر آ رہی تھی۔ جو حد نگاہ تک سیدھی اونچے اونچے درختوں کے درمیان کسی دوشیزہ کی مانگ کی طرح سردیوں کی دھوپ میں چمک رہی تھی...... وہ ہزاروں مرتبہ اس سڑک سے بس میں گذری تھی۔ کوئی چکر نہیں تھا۔ کوئی موڑ نہیں تھا بالکل سیدھی سپاٹ سڑک تھی۔ جس پر موٹر بڑے مزے سے رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔

"آپ اس راستے سے واقف نہیں؟" منصور نے اس سے پوچھا۔ ناہید نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں الجھی الجھی سی تھیں۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"کس راستے سے۔" وہ بمشکل کہہ سکی۔

منصور نے اک گہرا سانس لیا۔ اور سامنے شیشے پر نظریں جماتے ہوئے بولے......

"جس راستے پر ہم بڑی تیزی سے جا رہے ہیں۔ سنا ہے بڑا دشوار گذار ہے۔ منزل بڑی مشکل سے ملتی ہے۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

ناہید ان کی باتیں سمجھ گئی۔ وہ اک لطف آمیز گھبراہٹ محسوس کرنے لگی۔ منصور نے اشاروں ہی اشاروں میں دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی راستے کے مسافر تھے۔ لیکن دونوں کی منزلیں جدا تھیں۔

ناہید سوچ میں کھو گئی۔ منصور! منصور اس کے معبدِ دل کے معبود تھے۔ اور وہ عابد اور معبود کا فرق جانتی تھی۔

"آپ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔" وہ اپنی لمبی لمبی سفید انگلیوں کو مسلتے ہوئے بولی۔ "پلٹ جائیے۔"

"پلٹ جانا میری عادت نہیں۔" منصور نے گردن گھما کر غور سے اسے دیکھا۔

"راستہ چاہے کتنا کٹھن کیوں نہ ہو۔ میں منزل پا کے رہوں گا۔" ان کے لہجے سے عزم صمیم چھلک رہا

تھا۔

ناہید نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ اک بجلی کی کوند تھی جو لمحہ بھر کے لئے چمکی اور غائب ہو گئی۔ ناہید نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بے چین گردشیں کر رہی تھیں۔ اور منصور اس کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہونٹوں کی کپکپاہٹ ان کہے افسانے کہہ رہی تھی۔ آنکھوں کی بے چین گردش ان کہی کہانیاں سنا رہی تھی اور منصور کی روح جھوم رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ لیکن اس خاموشی میں فرشتوں کے مقدس گیتوں کا ترنم تھا۔ حوروں کے پاکیزہ رقص کی سرسراہٹ تھی۔

.........O.........

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

(۷)

قصرِ رعنا کو عروس نو کی طرح آراستہ کیا جا رہا تھا۔ منصور کی ستائیسویں سالگرہ قریب آ رہی تھی۔ جشن کی تیاریاں وسیع پیمانے پر ہو رہی تھیں۔ ماہر سنگ تراش مرمریں مجسموں کے حسن کو آہنی اوزاروں سے نکھارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چابک دست مالی چمنوں کو نئی وضع سے سجانے میں مصروف تھے۔ ہوشیار رنگ ساز انوکھی طرز سے دروازوں اور کھڑکیوں کی کینچلیاں بدلنے میں لگے ہوئے تھے۔ محل کا منتظم ناظم الدین مع اپنے عملہ کے بڑی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ وہ قریباً اٹھارہ سال سے اس محل کے منتظم کی حیثیت سے اپنا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ اور ان اٹھارہ طویل سالوں میں کئی جشن بڑے تزک واحتشام سے اس کے ہاتھوں انجام پائے تھے۔ لیکن اس دفعہ تو اسے منصور کی خاص ہدایات ملی تھیں۔ اس لئے کام کچھ بڑھ گیا تھا۔

جشن ہال کے سامان کی ترتیب۔ صوفوں اور پردوں کے رنگوں کی مناسبت قالینوں کا چناؤ۔ آراستگی کے سارے سامان منصور کی مرضی کے مطابق کئے جا رہے تھے۔ روشنی کا پورا پورا انتظام تھا۔ ہال کے ایک کونے میں موسیقی کا مظاہرہ کرنے والوں کے لئے دیسی اور ولایتی ساز رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف چھوٹی سی سٹیج بنائی گئی تھی۔ جس کے پس پردہ سمندری لہروں کی طرح روشنی جھلملاتی تھی۔ یہاں میڈم صوفیہ کے رقص کا مظاہرہ ہونا تھا۔

منقش چھت اور لمبے لمبے روپہلی ستونوں والا جشن ہال اپنی انوکھی سج دھج سے اک دوشیزہ کے خواب حسن کی تعبیر نظر آ رہا تھا۔ منصور دن میں کئی بار آ کر اسے مختلف زاویوں سے دیکھتے۔ اور آرائش وزیبائش کے کئی نئے نقطے ناظم الدین کو سمجھاتے۔ وہ اس آراستگی سے ابھی تک مطمئن نہیں تھے۔ سارے محل میں اک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ زندگی کروٹ لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ یاسمین اپنے لمبے چوڑے خاندان سمیت پہنچ گئی تھیں۔ کل رات نواب ذوالفقار علی خان کی آمد سے تو سرگرمیاں اور جاندار ہو گئی تھیں۔ اک شور تھا۔ ہنگامہ تھا۔ سب ہی مسرور تھے۔ زمانے بھر کی باتیں تھیں۔ اور محل کے یہ افراد...... ذوالفقار علی خان کی مضحکہ خیز باتوں پر ہنستے ہنستے

پیٹوں میں بل پڑ جاتے تھے۔ بڑے اور بچے صبح وشام انہیں گھیرے رہتے۔ اور وہ بھی بچوں بڑوں اور بوڑھوں۔ سبھی کی محفل میں ان کے ہم عمر بن جاتے۔ اسی لئے سب انہیں چاہتے تھے۔

اور انہیں گھماگھیوں میں منصور دو دن تک دفتر نہ جا سکے۔ ناہید چشم انتظار وا کئے ان کی راہ دیکھتی۔ قدموں کی آہٹ پر اسے منصور کی آمد کا گمان ہوتا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ کار کے ہارن کی آواز پر وہ خود بخود کھڑکی تک پہنچ جاتی۔ سامان سے لدی پھندی کاریں گذر جاتیں۔ اور وہ اک مضمحل اضطراب۔ اک مجبور سی بیقراری کو سینے میں چھپائے اپنی جگہ پر بیٹھ کر کاغذوں پر بلاوجہ لکیریں کھینچنے لگتی۔ اس دن منصور نے باتوں ہی باتوں میں اسے بہت بڑی بات بتا دی تھی۔ گو اس دن کے بعد ان دونوں کے درمیان پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی جو کچھ وہ سن چکی تھی وہ کچھ کم نہ تھا۔ اپنے اور منصور کے درمیان جو خلا تھا۔ وہ اس سے بے خبر نہ تھی۔ چاند کی دوری کے باوجود بچہ اسے ہمک ہمک کر پکڑنے کی خواہش کرتا ہے۔ کچھ ایسی ہی خواہش ناہید کے دل میں بھی مچل رہی تھی۔ دونوں ایک ہی دھارے پر بہتے ہوئے ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ اس علم کے باوجود وہ ان کی قربت کی خواہش ہر وقت بڑی تندی سے محسوس کرتی تھی۔ اور آج دو دن سے اس نے منصور کو نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنی زندگی اک لق ودق صحرا کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جس میں بگولے ہی بگولے اٹھ رہے ہوں۔

منصور مصروفیتوں میں کچھ اس طرح الجھے تھے۔ کہ باوجود شدت سے چاہنے کے دفتر جانے کے لئے وقت نہ نکال سکے۔ لیکن آج تو ہر مصروفیت کو بالائے طاق رکھ کر وہ دفتر جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ صبر وضبط کی تمام قوتیں بے کار سی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ زیر لب گنگناتے ہوئے آئے ابھی برآمدے کی لمبی سیڑھیاں ہی اتر رہے تھے۔ سرخ بجری والی سڑک پر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز نے انہیں متوجہ کر لیا۔

"ہلو منصور" شمسہ گھوڑے سے چھلانگ لگاتے ہوئے بولی۔ سفید بلاوز اور خاکی برجس نما پتلون میں اس کا جسم کچھ اور خوب صورت ہو گیا تھا۔ منصور جلدی سے زینے کو طے کرتے ہوئے اس کے قریب آ گئے۔

"خیریت" وہ مسکرائے۔

"شکر ہے آپ یہیں مل گئے۔ ورنہ جانے جناب کی تلاش میں قصرِ رعنا کی بھول بھلیوں میں کتنا وقت ضائع ہو جاتا۔" وہ گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑی تھی۔

"چلئے۔" اس نے منصور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں"

"رائڈنگ کے لئے"

"اس وقت۔"

"موسم خوشگوار ہو تو وقت کا تعین کچھ معنی نہیں رکھتا۔ سمجھے آپ۔" وہ ناصحانہ انداز سے بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"لیکن......

"لیکن ویکن کچھ نہیں سنوں گی۔ چلنا ہے تو چلئے۔ نہیں تو صاف کہہ دیجئے...... آپ کی کچھ عادت ہی بنتی جا رہی ہے۔ ہر بات میں آپ پس و پیش کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی تو چپ چاپ بات مان لیا کریں۔" شمسہ موسم کی رنگینی سے متاثر ہو کر انہیں لینے آئی تھی۔ منصور کی حیل و حجت سے وہ کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ منصور دفتر جانے کے لئے بے تاب تھے۔ شمسہ کی بے وقت آمد سے انہیں اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ شمسہ اس تذبذب سے برہم سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں غصے سے آنسو آ گئے۔ وہ واپس جانے کا ارادہ کرتے ہوئے گھوڑے کو زینے کے قریب لے آئی...... ازراہ اخلاق منصور کو اس کا دل رکھنے کے لئے اس کے ساتھ جانا پڑا۔

"آپ بڑی جلدی ناراض ہو جاتی ہیں۔" منصور مسکراتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ "مجھے بڑا ضروری کام تھا۔ خیر۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ لیکن زیادہ دیر کے لئے نہیں۔"

شمسہ ہنس پڑی۔ اور منصور لباس تبدیل کرنے کے لئے چلے گئے۔

رت بدل چکی تھی۔ سردیوں کی کپکپی دور ہو چکی تھی۔ بہاریں جنم لے رہی تھیں...... آسمان پر بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اور سورج کی منچلی کرنیں ان گالوں پر رقص کناں تھیں۔ ہلکی ہلکی نم آلود ہوا چل رہی تھی۔ فضا معطر تھی۔ منصور رائڈنگ کے خاکی لباس میں ملبوس باہر آ گئے...... ان کا ملازم سفید گھوڑا لے کر آ گیا۔ سہارا دے کر انہوں نے شمسہ کو سوار کرایا۔ اور پھر خود بیٹھ گئے......

ناہید کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اپنی الجھی ہوئی سوچوں کو سلجھا رہی تھی۔ وہ اس وقت بڑی شدت سے منصور کی قربت کی تمنا محسوس کر رہی تھی۔ ان سے باتیں کرنے کی تند خواہش اپنے دل میں پا رہی تھی۔ اف...... یہ تند و تیز خواہش...... انسانی زندگی کے ساتھ چمٹی ہوئی جونکیں۔ جو گندہ خون چوس لینے کے ساتھ ساتھ صاف خون بھی پی جاتی ہیں۔

شمسہ اور منصور کے ملے جلے قہقہوں نے ناہید کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ نہ جانے وہ دونوں کس بات پر جی کھول کر ہنسے تھے۔ ناہید نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دور قصر رعنا کی اندرونی سڑک پر شمسہ و منصور گھوڑوں پر بیٹھے ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ کھڑکی سے پیچھے یوں ہٹ گئی۔ جیسے کسی پھنکارتے ہوئے ناگ نے اپنی پتلی اور لمبی زبان اس کے ہاتھوں پر پھیر دی ہو۔ لحہ بھر وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ سوچنے کی ساری قوتیں منتشر ہو گئیں...... وہ لپک کر پھر کھڑکی کے قریب آئی جیسے اس نے جو کچھ دیکھا تھا۔ اس پر یقین نہ آیا تھا...... تیزی سے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں کانوں سے یوں ٹکرا رہی تھیں۔ جیسے مسلسل گولے

برس رہے ہوں۔ اور ان سے اٹھنے والی زہریلی گیس سے کمرہ بھر گیا ہو۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر گر گئی۔ اس کے ذہن میں آگ سی لگ اٹھی۔ اور اس کا کڑوا کسیلا دھواں اس کے شعور پر چھانے لگا۔ شمسہ کو اس نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ جس کے بارے میں شیریں نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔ پچھلے اتوار کی شام کو وہ شیریں کے ساتھ کپڑا خریدنے گئی تھی۔ وہاں شمسہ کو دیکھا تھا۔ اور پھر راستے میں شیریں نے اس کی ساری ہسٹری بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے گوش گذار کی تھی۔

"لوگوں کا خیال ہے نواب منصور اور شمسہ مستقبل قریب میں ایک رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔"

شیریں کی اس بات پر ناہید کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ لیکن دوپہر کو منصور کے ساتھ موٹر میں آتے ہوئے جو باتیں ہوئی تھیں۔ ان کا تاثر ابھی تک تھا۔ اسی لئے ناہید شیریں کی اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے طنزیہ ہنس پڑی تھی۔ آج وہی شمسہ منصور کے پہلو بہ پہلو جا رہی تھی۔ ہنستی ہوئی مسکراتی ہوئی۔ شیریں کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کانوں میں اتر رہے تھے۔

"مستقبل قریب میں دونوں ایک رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔"

شیریں سچ ہی کہتی تھی۔ ناہید کا جلتا ہوا دماغ سوچ رہا تھا۔ منصور کی اس دن والی باتیں۔ اشاروں اور کنایوں میں افشا کئے ہوئے راز۔ ناہید ان کی صداقت پر ایمان لا چکی تھی۔ آج یہ ایمان متزلزل ہو گیا۔ اسے ان باتوں کے پس پردہ فریب نظر آیا۔ وہ سب کچھ ایک دھنوان کا کھیل تھا۔ امارت کا غربت سے مہلک مذاق تھا۔ فاقہ زدہ آتما کو دور سے روٹی کا ٹکڑا دکھا کر اس کی تڑپ سے محظوظ ہونے کی ترکیب تھی...... وہ بڑی دیر تک بے حس و حرکت کرسی پر پڑی رہی۔ اس کا رنگ اوڑھے ہوئے دوپٹے کی طرح زرد تھا۔ طغیانیاں دریا کی پر سکون گود سے اٹھتی ہیں۔ اور پھر مہیب سی تباہی پھیلا کر اسی کی آغوش میں سو جاتی ہیں۔ منصور اور شمسہ کو اکٹھے دیکھ کر ناہید کے دل میں بھی اک طوفان اٹھا تھا۔ اور اس کی امیدوں کی ساری مشعلیں گل کر کے ختم ہو گیا تھا۔ اب اندھیرے میں وہ بھٹک رہی تھی۔ سر ٹکرا رہی تھی۔ کوئی راستہ بجھائی نہ دیتا تھا۔ "آخر تیری حیثیت ہی کیا ہے۔ شمسہ منصور کی ہم پلہ ہے اور تو تو اک طوائف کی اولاد۔" یہ خیال چبھتا ہوا اس کے دماغ میں آیا۔ اور اس کی رہی سہی امیدوں کا بھی خون کر گیا۔ طوائف! اس لفظ کے ساتھ ہی اسے سازوں کی جھنجھناہٹ میں گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔

طوائف! سوسائٹی کا ایک گندہ عنصر...... ایک کوڑھ زدہ حصہ۔ اس کے خیالات میں تلاطم بپا تھا۔ اسے فیروز کا وہ جملہ یاد آ گیا۔

"تو ایک رنڈی کی لڑکی ہے۔ رنڈی کا لفظ تمہاری پیشانی سے کوڑھ کے داغ کی طرح کبھی نہیں مٹ سکتا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ناہید کے خیالات میں پھر اک طوفان اٹھا۔ اک ریتلی آندھی چلنے لگی۔ اس کے دماغ کو جھٹکے لگنے لگے۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"منصور تجھ سے بہت دور ہیں ناہید..... تو یہ بُعد کبھی نہیں مٹا سکتی..... وہ تیری دسترس سے بہت بلند ہیں۔ تو انہیں دیکھ ضرور سکتی ہے۔ پا نہیں سکتی۔ وہ جتنی بلندی پر ہیں تو اتنی ہی پستیوں میں گری ہے۔ تیری ماں طوائف تھی۔ اور منصور ایک عالی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ دوریاں ہیں جو کبھی نہ مٹ سکیں گی......" اس کا ضمیر سلگ رہا تھا۔

اور جب وہ ذرا سنبھلی تو اس کے سوختہ دماغ میں ایک ہی بات رہ گئی تھی۔ منصور اس سے بہت دور ہیں۔ اس کے پر کاٹ لئے گئے ہیں۔ اس لئے ان بلندیوں پر پہنچنے کا خیال ہی فضول ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا دل دکھ رہا تھا۔ سینے میں اک آگ لگی ہوئی تھی۔ اس سے دفتر میں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ اور جب منصور آئے بڑی تمنا سے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ تو وہ اپنے گھر جا چکی تھی۔ اعجاز نے انہیں بتایا۔ کہ ناہید گھر چلی گئی ہیں۔

دوسرے دن جب وہ دفتر آئی۔ تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگ گئی۔ انتظار اسے آج بھی تھا۔ لیکن اپنی بے قراریوں کا اس نے گلا گھونٹ دیا تھا۔ منصور آئے۔ کام دیکھنے کی بجائے اسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے بڑے شائستہ الفاظ میں اپنی غیر حاضری کی معذرت کی۔ ناہید کاغذوں پر جھکی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کہ ان کی باتیں جن سے خلوص ٹپک رہا تھا۔ تصنع آمیز ہیں یا سچی حقیقتیں۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔ خاموش بیٹھی سوچتی رہی۔

شیریں بڑے تکلف سے تیار ہو رہی تھی۔ نئے سیاہی مائل زرد کپڑے پہنے وہ پاؤں میں آج ہی بازار سے لائی ہوئی نفیس سینڈل پہن رہی تھی۔ سینڈل پہن کر وہ ٹہلنے کے انداز سے کمرے میں چند قدم اٹھاتے ہوئے سنگار میز کے قریب آ گئی آئینے میں اپنے سانولے سلونے چہرے کا جائزہ لیا۔ بالوں کا انداز کچھ پسند نہ آیا۔ بالوں کے پن منہ میں پکڑے وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو نئے ڈھنگ سے سنوارنے لگی۔ اس کے انداز سے گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔ اتنے بڑے اجتماع میں جانے کا اس کا پہلا اتفاق تھا۔ قصر رعنا میں وہ جشن میں شرکت کے لئے ایک مہمان کی حیثیت سے جا رہی تھی۔ یہ کچھ کم اعزاز نہ تھا۔

آئینے پر آخری نظر ڈالتے ہوئے اس نے دوپٹے کی سنہری کرن کا چہرے کے گرد حلقہ بنایا۔ اپنے آپ کو ہر زاویئے سے دیکھا۔ اور پھر مطمئن ہو کر کالا چرمی بٹوا اٹھایا۔ اور بڑے محتاط قدم رکھتی ہوئی ناہید کے کمرے میں آ گئی۔

ناہید کرسی پر بیٹھی بتی کے گرد منڈلانے والے بے وقوف پروانوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی

تک صبح والے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ گود میں گر گیا تھا۔ اور بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" شیریں نے حیران ہو کر اسے گھورا۔

"اوہو" ناہید سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "کیا انداز ہیں آج۔"

شیریں اپنی تعریف پر خوش ہوئے بغیر رہ نہ سکی۔ بیگ کو ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں کہتی ہوں کب تیار ہو گی تم سات بج چکے ہیں۔ ساڑھے سات پہنچنا ہے وہاں۔ بیگم حق بھی تیار ہو چکیں۔"

ناہید ابھی تک شیریں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کپڑوں کا رنگ اس کے چہرے پر بڑا اٹھ رہا تھا۔ دوپٹے کی سنہری کرن بھی بڑی خوب صورت تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔ اٹھو بھی۔" شیریں نے اسے جھنجھوڑا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا کہا۔" شیریں نے جیسے اس کی آواز نہ سنی ہو۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ اسی طرح بولی۔

"کیوں نہیں جاؤ گی۔"

"میری مرضی۔"

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" شیریں کو غصہ آ گیا۔ "اٹھو۔ میں تمہارے کپڑے نکالتی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھو لو۔"

"نہیں شیریں۔ میں نے کہہ دیا نہیں جاؤں گی۔" وہ بڑی ملائمت سے بولی۔

وہ جانے کیا فیصلہ کر چکی تھی۔ جشن بورژوا طبقے کا اجتماع تھا۔ سرمائے کا مظاہرہ تھا۔ گھریلو اعزاز سے روشن پیشانیاں۔ نسلی تفاخر سے تنی ہوئی گردنیں۔ خاندانی وقار سے اٹھے ہوئے سر اس کی نظروں میں گھوم رہے تھے۔ اسے اپنے خاندان کی ذلت کا احساس تھا۔ اپنی کم مائیگی سے آگاہی تھی۔ اور یہ احساس یہ آگہی شمسہ اور منصور کو اس دن اکٹھا دیکھنے کے بعد بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

"شمسہ کے ہوتے ہوئے اس کی وہاں ضرورت بھی کیا تھی۔" اس خیال نے اس کے جشن کی شرکت کے ارادے کو کمزور کر دیا تھا۔ شمسہ کا خیال اذیت ناک حد تک دماغ میں کچوکے لگاتا تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"واقعی نہیں جاؤ گی۔" شیریں نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شیریں بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

....

قصرِ عنا برقی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ باغ کے ہر درخت پر بجلی کے قمقمے اندھیروں کو پاٹ رہے تھے۔ سبز سبز درختوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنیاں سرخ بجری والی سڑک پر لرز رہی تھیں۔ رات دن سے بھی زیادہ روشن تھی۔ لمبی لمبی رنگ برنگی چمکیلی موٹریں بڑے پھاٹک سے داخل ہو کر چند لمحے پورٹیکو میں رکتیں۔ مہمان اک شان سے اترتے اور خالی موٹریں آگے بڑھ جاتیں۔ دوسرے پھاٹک سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ اور سڑک پر کھڑی ہونے والی لمبی قطار میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

منصور سیاہ اچکن پہنے جشن ہال کے بڑے دروازے کے قریب کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اک شاہانہ وقار تھا۔ اور اچکن ان کے مردانہ حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔ ان کے پہلو میں یاسمین کھڑی تھی...... سفید ستاروں والے جھلملاتے لباس اور ہیروں کے خوب صورت سفید زیورات وہ ہنس ہنس کر مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ ذوالفقار علی خان اندر مہمانوں سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

مہمان آ رہے تھے۔ ہنگامہ بڑھ رہا تھا۔ قہقہے ٹکرا رہے تھے۔ ہنسیاں الجھ رہی تھیں۔ لہراتے ہوئے رنگ برنگے ریشمی آنچل۔ شانوں سے ڈھلکتی ہوئی زر تار ساڑھیاں پیروں سے الجھتے ہوئے لچکیلے غرارے ماحول کو رنگین بنا رہے تھے۔

مردوں کے قیمتی ملبوسات کی سرسراہٹیں مرصع اور طلائی زیورات کی کھنک میں مدغم ہو رہی تھیں۔ آرکسٹرا کی ہلکی دھنیں فضا میں اک مترنم شور بکھیر رہی تھیں۔ ایک لطیف سا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

مہمان آ رہے تھے۔ منصور کی بے قرار نظریں بار بار برآمدے کی سیڑھیوں سے ابھرتے ہوئے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ نگاہیں جس ہوش ربا کی منتظر تھیں۔ نظریں جس رہزن دین و ایمان کی متلاشی تھیں وہ ابھی تک نہ آئی تھی۔

شیریں اور بیگم حق کے آنے کے بعد تو اس کے آنے کا امکان ہی نہ رہا اپنی پریشانی کو مسکراہٹ میں چھپائے وہ مہمانوں سے باتیں کئے جا رہے تھے۔

”منصور“ بیگم جمشید ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ”یہ جشن اب پرانے ہوئے جا رہے ہیں۔ اب تو تمہاری شادی کا جشن ہونا چاہئے۔“

”انشاء اللہ اسی سال آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔“ یاسمین مچھلی کے کباب پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولیں۔ ”کیوں منصور“

منصور بجھی سی ہنسی ہنس دیئے۔

”واقعی؟“ مقبول حسین لقمہ نگلتے ہوئے منصور کی طرف مڑ گئے۔

”ارے بھئی منگنی ونگنی ہو گئی ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔“ زاہد احمد نے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے یاسمین سے پوچھا۔

منگنی تو نہیں ہوئی ابھی۔“ یاسمین بولیں۔ ”ہم لمبی منگنیوں کے قائل بھی نہیں۔ سب کچھ اکٹھا ہی ہو گا۔“ مقبول حسین ہنستے ہوئے بولے۔ ”اب تو ہو ہی جانی چاہئے ان کی شادی۔ اکیلے اکیلے کچھ اچھے نہیں لگتے۔“

منصور کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ واقعی اکیلے ہیں۔ اس بھری محفل میں...... اس بھری دنیا میں۔ اک سسکتی ہوئی آہ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔ اور اپنی اضطراری کیفیت کو چھپانے کے لئے وہ دوسرے مہمانوں کی طرف گھوم گئے۔

میڈم صوفیہ نے رقص کا بہترین مظاہرہ کیا۔ لوگوں کی فرمائش پر وہ کئی بار ناچ چکی تھی۔ موسم بہار کا رقص اس نے پیش کیا تھا۔ گداز جسم کی لچک مرمریں بانہوں کی حرکت اور بجلیاں گراتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر حاضرین کو نشہ سا آنے لگا تھا۔

رقص کے بعد کئی لوگوں نے گانا سنایا۔ لوگوں کے بے حد اصرار پر منصور نے بھی ایک غزل سنائی۔ ستار ان کا محبوب ساز تھا۔ ان کے گلے کا سوز کچھ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اور فضا پر اک سوگوار سی خاموشی طاری ہو گئی۔ گانا ختم ہو گیا۔ ماحول کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ لیکن شمسہ اور ذوالفقار علی خان کی مزاحیہ باتوں سے فضا جلد ہی ہموار ہو گئی۔ وہی قہقہے بکھرنے لگے۔ وہی ہنسیاں الجھنے لگیں۔

جشن بڑا کامیاب رہا۔

مہمان جا چکے تھے۔ ہنگامے سو گئے تھے۔ قصرِ عنا کے مکین کچھ تھکان اور کچھ زیادہ دیر جاگنے کی وجہ سے نیند کی آغوش میں خراٹے بھر رہے تھے۔ ایک منصور تھے جو اس دفترات گذر جانے کے باوجود تنہا باغ کی اونگھتی ہوئی فضا میں روشوں پر بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ ان کے بال الجھ کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ان کا اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخری تاریخوں کا بیمار چاند بوڑھی رات کی جھولی میں پڑا سسک رہا تھا۔ سنگ مرمر کی بنچ پر بیٹھے منصور اس بیمار چاند کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ”وہ کیوں نہیں آئیں؟“ یہ سوال بار بار ان کے دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کے بغیر آج کا جشن بے معنی سا معلوم ہو رہا تھا۔ اک فضول سا اجتماع۔ اک خواہ مخواہ کی درد سری۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کسی پل چین نہ آ رہا تھا۔ دل کا درد تھا۔ کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ناہید ان کی زندگی کا سب سے لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر زندگی زندگی نہیں۔ وہ خاموشی سے اپنے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جذبات کا تجزیہ کر رہے تھے۔ ناہید ان کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی۔ ان کے دل میں دھڑکن بن کر سمائی ہوئی تھی۔ وہ اسے اپنے دل کی تمام قوتوں سے چاہتے تھے۔ اپنی روح کی گہرائیوں سے پیار کرتے تھے۔ انہیں اپنے عشق کا پوری شدت سے احساس ہونے لگا۔

مرغ سحری نے اذان دی۔ انہوں نے گھڑی دیکھی چار بجنے والے تھے۔ فضا کی خنکی بڑھ گئی تھی۔ ان کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیئے۔

لباس تبدیل کرانے کی غرض سے آیا ہوا جانی قالین پر پڑا سو رہا تھا۔ منصور نے اسے بیدار نہ کیا۔ ڈریسنگ روم میں جا کر لباس شب خوابی پہنا۔ اور مسہری پر گر گئے۔

............O............

۸

بہار کی ایک رنگین و حسین شام تھی۔ ہلکی ہلکی فرحت بخش ہوا چل رہی تھا۔ غنچے مسکرا رہے تھے۔ کلیاں چٹک رہی تھیں۔ چمن کو رنگا رنگ پھولوں نے بوقلموں بنا رکھا تھا ہری ہری گھاس بڑی خوب صورتی سے ترشی ہوئی تھی۔ اونچے اونچے گھنے درختوں کے سایوں تلے آرام دہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی میزوں پر چائے کے برتن اور کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ بیرے بڑی احتیاط سے خالی برتن اٹھا رہے تھے۔

ذوالفقار آرام کرسی پر تقریباً لیٹے ہوئے سگار پی رہے تھے۔ ان کی نظریں سگار کے دھوئیں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ قریب ہی چھوٹی سی میز پر جھکی ہوئی یاسمین بیٹھی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں پڑے ہوئے جڑاؤ کنگنوں کو یونہی گھمائے جا رہی تھی۔ ان سے ذرا ہٹ کر چمن کی مخملیں فرش پر منصور بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھے۔ سمیرا اور فریدوں سے گیند لے کر وہ ہوا میں اچھال دیتے۔ بچے گیند کو اچھالتے لیکن ان کی زد میں آنے سے پہلے ہی گیند منصور کے ہاتھ میں آجاتی بچے شور مچاتے۔ اور منصور اس شور سے محظوظ ہوتے ہوئے گیند دور پھینک دیتے۔ بچے بڑی تیزی سے بھاگتے۔ سمیرا اور فریدو ں کی لڑائی ہوتی۔ اور گیند پھر منصور کے ہاتھ میں آجاتی۔ کافی دیر سے وہ بچوں کے ساتھ اس شغل میں مشغول تھے اس بھاگ دوڑ میں انہیں پسینہ آگیا تھا۔ اپنی سفید قمیض کے کلف شدہ کالر کھولتے ہوئے انہوں نے گیند پھر ہوا میں اچھال دی۔ اس دفعہ انہوں نے گیند پکڑی نہیں۔ اور وہ اتفاق سے فریدوں کے ہاتھ آگئی فریدوں خوشی سے ناچتے ہوئے گیند منصور کے پاس لے آیا۔

”بس بھئی...... اب کھیل ختم۔“ منصور نے بچوں سے کہا۔ ”شام ہو رہی ہے۔“

”ابھی کہاں ماموں حضور“۔ سمیرا بولی۔ ”دیکھئے نا ابھی تو سورج چمک رہا ہے۔“

سورج اپنے سفر کے آخری مراحل طے کرتے ہوئے پہاڑوں کے پیچھے سے الوداعی نظریں ڈال رہا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اونچے اونچے درختوں پر کمزور کمزور کرنیں تھرک رہی تھیں۔

"ایک دفعہ اور" فریدوں کی لجاجت پر منصور کو ہنسی آگئی۔ اس کے سرخ سرخ گالوں پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے گیند پھر اچھال دی کھیل پھر شروع ہو گیا۔

یاسمین دور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کو وہ کوئی بڑی اہم بات سوچ رہی ہیں آج ہائی سکول میں ان کے زیر صدارت جلسۂ تقسیم انعامات ہوا تھا۔ شیریں نے ناہید کو ان سے ملایا تھا وہ اس کے حسن ملائک فریب۔ اس کے سلیقۂ گفت گو۔ اس کے وقار آمیز نشت و برخاست اور اس کے ٹھہرے ہوئے خیالات سے بڑی متاثر ہوئی تھیں۔ اور آتے وقت جب اس نے قدرے جھک کر بڑی تعظیم سے ان کے ساتھ مصافحہ کیا تھا تو وہ بڑی دیر تک اس کے نرم و گداز ہاتھ کو ہاتھ میں لئے دیکھتی رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کی صحبت بڑا گہرا نقش چھوڑ گئی تھی۔ وہ اب بھی اس کی متعلق سوچ رہی تھیں تصور میں ان گہری گہری حسین آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جن میں شرم و حیا کی پرچھائیاں اتنی واضح تھی کہ یاسمین کا دل فرط عقیدت سے انہیں چوم لینے کو چاہا۔ اس وقت بھی اس کے متعلق سوچتے ہوئے وہ خیالوں کے تانے بانے سے ریشمی ریشمی ڈوریاں نکال رہی تھیں۔ ریشمی ڈوریاں جن سے منصور اور ناہید کو باندھا جا سکے لیکن منصور کی عادت سے واقف ہوتے ہوئے ابھی تک یہ ذکر نہ چھیڑ سکی تھیں شادی کا ذکر انہوں نے جب بھی چھیڑا تھا منصور بڑی شائستگی سے ٹال گئے تھے۔ بڑی خوب صورتی سے پہلو بچا گئے تھے۔

یاسمین نے میز پر ہلکا سا مکا مارا۔ جیسے وہ کسی اٹل فیصلے پر پہنچ گئی ہوں...... پھر بڑے اطمینان سے کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ مہین آسمانی رنگ کے دوپٹے پر ٹکی ہوئی سنہری سلمے کی بیل کو اپنے ہاتھوں سے سیدھا کرنے لگیں۔

"کیا بات ہے یاسمین۔" زلفی چچا نے سگار منہ سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ " کیا بات سوچ رہی ہو۔"

وہ کچھ دیر سے سگار کے دھوئیں کی آڑ سے یاسمین کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یاسمین نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔

"کیا بات ہے بھئی"۔ زلفی نے ہاتھ کو ہوا میں ہلاتے ہوئے پھر پوچھا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ "انہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"کب تک یونہی بچوں سے کھیلتے رہیں گے۔" منصور ابھی تک کھیل میں مشغول تھے۔ زلفی نے بڑے پیار سے منصور کو دیکھا۔

"ستائیس سال کے ہو گئے ابھی تک شادی کے نام سے کتراتے ہیں۔ اس دفعہ تو میں ان کا کوئی معقول بندوبست کر کے ہی جاؤں گی۔" وہ بڑے جوش سے بولیں..........

"منصور" زلفی نے آواز دی۔

کھیل رُک گیا۔ بچے چپ ہو گئے۔ منصور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے زلفی چچا کے قریب آگئے۔ اپنے بالوں کو ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے بولے۔

"آپ نے بلایا زلفی چچا۔"

"یہ یاسمین تم سے کچھ کہنے والی ہیں۔" انہوں نے شرارت سے کہا...... منصور حیران سے کبھی انہیں اور کبھی یاسمین کو دیکھنے لگے۔ جو خاموش بیٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے باجی۔" وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بچے ہاتھوں میں گیند لئے منصور کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

"بھاگو بچو آنٹی ڈی سوزا بلا رہی ہیں۔" بچے فوراً بھاگ گئے۔ منصور اب تک یاسمین کی سنجیدگی سے کوئی مطلب نہ اخذ کر سکے تھے۔ انہیں الجھن سی ہونے لگی۔

"باجی فرمائیے نا کیا بات ہے۔" وہ رومال سے اپنی پیشانی پونچھتے ہوئے بولے ......

"بھئی بات تو پرانی ہے۔ یاسمین آج اسے نئے ڈھنگ سے کرنا چاہتی ہیں۔" زلفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ منصور کچھ نہ سمجھے۔ یاسمین کو ہنسی آگئی۔

"دیکھ کیا رہے ہو۔" زلفی منصور کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "آج یاسمین کے تیور بڑے خطرناک ہیں۔ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"میں سمجھا نہیں۔" منصور حیرانگی سے بولے۔

"سمجھ جاؤ گے بھئی بیٹھو تو سہی۔" منصور بیٹھ گئے۔

"یاسمین تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ یوں سمجھ لو۔ دو چار دن کے اندر اندر یہ بوجھ سر سے اتار دیں گی۔" زلفی مسکراتے ہوئے بولے۔

"آپ کو میرا ہی فکر کیوں رہتا ہے باجی۔" منصور ہنستے ہوئے بہن کو دیکھنے لگے۔ "کبھی ان کا بھی خیال کیا کیجئے۔ مجھ سے بڑے ابھی بیٹھے ہیں۔"

زلفی منصور کی بات پر اچھل پڑے۔ وہ چالیس کے لگ بھگ تھے لیکن ابھی تک ان ازدواجی بکھیڑوں سے آزاد تھے۔

"ارے بھئی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو ہمارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں......"

زلفی کی بات پر سب ہنسنے لگے۔

"زلفی چچا بات تو منصور نے حق کی کہی ہے۔" یاسمین چہکیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"دیکھو بیٹا۔" زلفی چہرے کو جبراً سنجیدہ بناتے ہوئے بولے۔ "بزرگوں سے مذاق نہیں کیا کرتے۔"

"اور سنئے۔ منصور ہنستے ہوئے بولے۔ "اب آپ بزرگوں کی قطار میں شامل ہو گئے۔"

"ارے بھئی ہماری چھوڑو اپنی نپٹاؤ۔" زلفی بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ان کی عمر اس وقت کئی سال زیادہ لگ رہی تھی۔ ماتھے پر ہلکی ہلکی شکنیں ابھر آئیں۔ وہ کچھ مایوسانہ انداز میں پھر بولے۔

"ہاں تو یاسمین کیا کہنا تھا منصور سے۔"

منصور جانے کے ارادے سے اٹھے۔

"بیٹھو تو" یاسمین دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولیں...... "میری بات کا جواب تو دو۔"

"کس بات کا۔"

شادی کے متعلق کیا سوچا ہے۔"

"شادی ضرور کروں گا لیکن............" وہ رک گئے۔ اور یاسمین کو جیسے زندگی میں پہلی بار خوشی میسر آئی۔

"لیکن کیا" وہ جوش مسرت کو دباتے ہوئے بولیں۔ آج منصور نے پہلی بار اقرار کیا تھا۔ اقرار۔ شادی کا اقرار...... اور وہ بھی بغیر حیل وحجت کے۔

"اپنی پسند کی کروں گا شادی۔" وہ پہاڑوں کے پیچھے غروب ہونے والے سورج کو دیکھتے ہوئے بولا۔ پسند کے ساتھ یاسمین کی نظروں میں شمسہ کا چہرہ گھوم گیا۔ جو خوب صورت بھی تھی۔ سوسائٹی کی روح رواں بھی تھی۔ اور ایک سرمایہ دار باپ کی اکلوتی بیٹی بھی۔ اس کے باوجود بے باک طبیعت کی وجہ سے یاسمین کو قطعاً پسند نہ تھی۔

"شمسہ" یاسمین نے یوں کہا۔ جیسے منصور کے دل کی پہیلی بوجھی ہو۔ منصور نے جلدی سے ان کی طرف دیکھا۔

"باجی" انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یاسمین نے ان کے بلند ذوق کا مذاق اڑایا ہو۔ "شمسہ کو میں صرف ایک دوست کی حیثیت دے سکتا ہوں۔"

"تو پھر" یاسمین کریدنے لگیں۔

منصور کا جی چاہا کہ اپنے تخیل کے پردوں کو یاسمین کے سامنے پھیلا دیں۔ جن پر ناہید کا پرتو لہرا رہا تھا لیکن ابھی تک کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔ ناہید کی خاموش حرکتوں سے اس کی محبت کا اندازہ وہ کئی بار کر چکے تھے۔ لیکن ابھی تک کھل کر اس معاملے پر بات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی انہوں نے پوچھا تھا نہ ہی ناہید نے کچھ کہا تھا۔

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ آہستگی سے بولے۔

زلفی بڑے غور سے منصور کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ یاسمین تذبذب کے عالم میں بار بار اپنے رومال کو انگلی پر لپیٹ رہی تھیں۔ منصور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"بات پھر وہیں رہ گئی۔" یاسمین نے کہا۔

"دیکھئے باجی میں شادی ضرور کروں گا۔ لیکن ہو سکتا ہے میری شادی سے آپ کی خاندانی توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ پرانی روایات برقرار نہ رکھی جا سکیں......"

انہوں نے بڑی وضاحت سے کہہ دیا۔

"کیا مطلب؟" یاسمین بولیں۔

"شاید میں کسی ایسی لڑکی کو اپنا رفیقِ زندگی بنا لوں۔ جسے آپ کے دولت مند طبقہ سے کوئی مناسبت نہ ہو۔" وہ بڑے اطمینان سے بولے۔ زلفی کے ماتھے کی شکنیں اور واضح ہو گئیں۔ منصور کی باتوں سے خاندانی روائیتوں سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ یاسمین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ منصور کی باتوں پر انہیں غصہ آ رہا تھا۔ زلفی کے سگار کے دھوئیں کے پردے میں سے انہیں دیکھا۔ وہ اس وقت خاندانی آن کی ایسی محافظ سپاہی معلوم ہو رہی تھیں جس کی تلوار پر خون کی بوندیں جمی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"ہمارا خاندان صدیوں سے اک خاص عظمت کا حامل چلا آتا ہے منصور"۔ آخر یاسمین نے سکوت توڑا۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "اس عظمت کی لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"میں پرانی قدروں کا قائل نہیں"۔ منصور بڑے اطمینان سے بولے۔ "اگر میرا خاندانی وقار محض اس لئے میرے راستے کی چٹان بن جائے کہ میں ایسی لڑکی کو شریک حیات بنانا پسند کروں جو صدیوں کے روندے ہوئے سماج کے بناوٹی اصولوں کے مطابق میری ہم پلہ نہیں۔ تو میں اس چٹان سے ٹکرانے کے لئے تیار ہوں۔"

منصور نے کچھ اس انداز میں یہ بات کہی کہ یاسمین حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگیں۔ زلفی نے پھر کرسی پر پہلو بدلا۔ منصور کو دیکھ کر انہیں نہ جانے کیا یاد آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر رنجیدہ سے ہو گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے صاف وشفاف مطلع پر تباہی و بربادی کی مہیب گھٹائیں چھا رہی ہوں۔

"چٹانوں سے ٹکرانے کا فائدہ"۔ انہوں نے پہلی بار دونوں بہن بھائیوں کی بحث میں حصہ لیا۔ "خود ہی چکنا چور ہو جاؤ گے یہ دولت کی حد بندیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ یہ طبقاتی خلیجیں بڑی گہری ہیں منصور۔"

"میں یہ خلیجیں پاٹ سکتا ہوں۔" منصور کے لہجے میں عزم تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

زلفی نے غور سے منصور کے چہرے کو دیکھا۔ انہیں ان پر ترس آگیا۔

"تم ابھی انجان ہو منصور۔" زلفی نے سمجھانا چاہا۔ "بڑی گہری کھائیاں ہیں۔ یہ انسان کی مسرتوں کو ہڑپ کر جانے کے لئے منہ کھولے بیٹھی ہیں۔ انہیں عبور کرنے کے خیال سے انسان اٹھتا ہے لیکن اوندھے منہ گر جاتا ہے۔"

"زلفی چچا" منصور بڑے تحمل سے بولے۔ "ہو سکتا ہے۔ یہ کھائیاں اس وقت خطرناک ہوں۔ جس وقت انسان کی محدود عقل نے انہیں عبور کرنے کا طریقہ نہ سوچا ہو۔ آج کا انسان خلاؤں میں پرواز کرنے کی سوچ رہا ہے۔ بلندیوں پر اڑ رہا ہے۔ یہ کھائیاں یہ خلیجیں تو میرے خیال میں حیرت سے منہ کھولے انسانی ارتقاء کو دیکھ رہی ہیں۔ انسان جو عقل کی روشنی میں ان کی دسترس سے کہیں زیادہ بلند ہو چکا ہے۔"

"بہت خوب" زلفی بے ساختہ کہہ اٹھے۔ "واقعی منصور تم چٹانوں سے ٹکرا سکتے ہو۔" یاسمین چڑ سی گئیں۔ منصور خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"اپنے طبقے سے باہر کی لڑکی سے شادی کر کے تم کبھی مطمئن زندگی نہیں گزار سکو گے"۔ یاسمین نے ان کی معقول دلیل کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کا خیال ہے۔ جو طبقاتی امتیاز کی حامی ہیں۔" منصور نے ان کی طرف دیکھا۔

"ندی کے دو کنارے آپس میں کبھی نہیں مل سکتے۔" یاسمین نے دلیل دی۔

"ندی کے دو کنارے انفرادی حیثیت سے الگ ضرور ہیں۔ لیکن ندی کا پانی انہیں اک اٹوٹ بندھن میں جکڑے رکھتا ہے۔ پانی ہی سے کنارے بنتے ہیں باجی......" وہ تلخی سے مسکرائے۔ "شادی کا بندھن بھی دو......" لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی یاسمین اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کی معقول دلیلوں کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ زلفی منصور کی باتوں کو دل ہی دل میں سراہ رہے تھے۔ ان کے اٹل فیصلے کی دل ہی دل میں داد دے رہے تھے۔

"میں نے تمہارے لئے ایک درِ نایاب منتخب کیا تھا۔" یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"تمہاری مرضی جو چاہو کرو۔ ہمیں کیا حق ہے جو کچھ کہہ سکیں۔"

منصور کو یاسمین کا روکھا سا جملہ ایسے لگا جیسے یاسمین نے ان کے ساتھ سارے تعلقات توڑ لئے ہوں۔ یاسمین ان کی بہن تھیں اور ان سے انہیں قلبی محبت تھی۔ وہ اس وقت بڑی دل گرفتہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے منصور کے لئے یہ لمحات بڑے اذیت ناک تھے۔ وہ نرم نرم گھاس کو اپنے چمکتے ہوئے بوٹوں سے بے چینی سے مسل رہے تھے۔

"کہاں چلیں۔" زلفی نے یاسمین کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑیئے زلفی چچا۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے روہانسی سی ہو رہی تھیں۔

"نہیں بھئی ہم ایسے تھوڑا ہی جانے دیں گے اپنی بٹیا کو۔" زلفی چچا جبراً ہنستے ہوئے بولے۔ معاملہ الجھ گیا تھا۔ یاسمین کے یوں چلے جانے سے اور گرہیں پڑنے کی توقع تھی۔ اسی لئے زلفی نے انہیں روکا۔ اور میٹھی میٹھی باتوں سے منانے لگے۔ منصور بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔

"بھئی ہم نے مذاق کیا اور تم دونوں سچ مچ لڑنے لگے۔ بری بات ہے یہ......" وہ مسکرائے۔

"لڑائی کیسی۔" یاسمین رکھائی سے بولیں۔ اس وقت انہیں بڑا صدمہ پہنچا تھا ایک ہی ایک بھائی تھے جن کی شادی کا انہیں بڑا ارمان تھا۔ گو ان کے خاندان کو کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی پھر بھی وہ منصور بھائی کی شادی کسی ایسے خاندان میں کرنا چاہتی تھیں جن سے ان کے عالی اور بڑے خاندان کا نام سربلند ہو۔ منصور کی باتوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ کسی غریب یا اوسط درجے کی لڑکی کو منتخب کر چکے ہیں۔ یہ بات ان کے باوقار خاندان کی سراسر توہین تھی۔ ایسی توہین پرانی روائیتوں کی قدر دان یاسمین کی برداشت سے باہر تھی۔

زلفی نے یاسمین کو پھر سے کرسی پر بٹھا لیا۔

"ہم اپنی بٹیا کو ناراض نہیں ہونے دیں گے۔ ہاں تو کس درِ نایاب کا ذکر کر رہی تھیں تم۔"

"کسی کا بھی نہیں۔" وہ جل کر بولیں۔

"اوہو۔ معاملے کی بات کرو نا یاسمین۔ ہو سکتا ہے۔ تمہاری پرکھ ہی غلط ہو۔ چمکتے ہوئے موتی کو تم ہیرا بنا دو تمہارا کیا ہے۔" زلفی مذاق کرنے لگے۔

"ہیرے کو پرکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی آب و تاب سے ہی پہچانا جاتا ہے۔" یاسمین بڑے وثوق سے بولیں۔

"نہیں بھئی۔" زلفی بولے۔ "انسان دھوکہ بھی کھا جاتا ہے۔ وہ درِ نایاب ہمیں بھی دکھاؤ۔ ہم دیکھ کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ کیوں منصور۔"

منصور بڑی خاموشی سے پاؤں سے مسلی ہوئی گھاس کو دیکھ رہے تھے۔ جس ہیرے نے ان کی راہوں کو منور کر رکھا تھا۔ اس سے بڑھ کر کون سا ہیرا آب دار ہو سکتا تھا وہ چپ رہے اور ان کی خاموشی کو یاسمین نے نارضامندی پر محمول کیا۔

یاسمین کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اور وہ جانے کے ارادے سے اٹھیں۔ زلفی بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں کہہ بھی دو منصور۔ ان کا انتخاب بھی دیکھ لو۔" زلفی نے آنکھ کے اشارے سے منصور کو یاسمین کی طرف متوجہ کیا جو آنکھوں میں امنڈے ہوئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"لیکن ایک بات ہے یاسمین۔ منصور تمہارے کسی فیصلے کے پابند نہیں ہوں گے۔ " زلفی نے کہا۔

یاسمین کو ہنسی آگئی۔ جب منصور کسی فیصلے کے پابند نہیں ہوں گے۔ زلفی نے کہا۔ تو پھر انہیں اپنی پسند کی ہوئی لڑکی دکھانے سے کیا فائدہ۔ زلفی چچا تو اسے یوں بہلا رہے تھے جیسے وہ کوئی کم سن بچہ تھیں۔

آخر بڑی چکنی چپڑی باتوں کے بعد زلفی چچا نے یاسمین کو رضامند کر ہی لیا۔ منصور نے ان کی بحث میں کوئی حصہ نہ لیا۔ یاسمین نے اس امید پر لڑکی کو دکھانے کی حامی بھر لی کہ شاید ناہید کی من موہنی صورت دیکھ کر منصور اپنا ارادہ بدل دیں۔

اور اسی مقصد کے لئے یاسمین نے دوسرے ہفتے اپنی قریبی سہیلیوں کو چائے پر مدعو کیا ناہید اور شیریں کو بھی بلایا۔

قصر رعنا کے وسیع ڈائننگ ہال میں چائے کا دور چل رہا تھا۔ بڑی بڑی بیضوی میزوں پر چائے کا سامان بڑے قرینے سے چنا ہوا تھا شیشے اور چاندی کے نفیس برتنوں سے میزیں جگ مگا رہی تھیں۔ بلند کھڑکیوں پر موسم کی مناسبت سے مہین پردے ڈال دیئے گئے تھے۔

خواتین چائے پینے میں مصروف تھیں دل چسپ باتیں ہو رہی تھیں۔ گنتی کی چند عورتیں زمانے بھر کے موضوعات زیر بحث لا رہی تھیں۔ بحث برائے بحث ہو رہی تھی اور کچھ مقصد نہ تھا۔

ناہید سفید ریشمی لباس میں کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ کانوں میں سفید موتیوں کی بالیاں لرز رہی تھیں اور اس کے گھنگھریالے بال ان بالیوں سے بار بار الجھ رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی۔ نڈھال سورج کے لانبے لانبے سائے اس کے چہرے پر پڑ رہے تھے۔ جس سے اس کا چہرہ کچھ اور روشن ہو رہا تھا۔ آج یاسمین نے کچھ اس اصرار سے بلایا تھا کہ وہ انکار نہ کر سکی تھی۔ وہ خود بھی یاسمین کے لئے اپنے دل میں عجیب سی کشش محسوس کرتی تھی۔ اس دن سکول میں ان سے متعارف ہونے کے بعد دوبارہ ملنے کی تڑپ اس نے بڑی شدت سے محسوس کی تھی اور آج ان کا مشفقانہ سلوک اسے بڑا متاثر کر رہا تھا۔

"تکلف نہ کرو ناہید" یاسمین نے بڑے پیار سے کہا۔

"شکریہ" وہ جواب میں مسکرا دی۔ یاسمین دوسری طرف گھوم گئیں۔ چائے کے دوران وہ کئی بار ناہید کے پاس آچکی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد شیریں نے ناہید کے پہلو میں چٹکی لی۔ ناہید اچھل پڑی۔

"بڑی خاطر مدارات ہو رہی ہیں۔ خدا خیر کرے" شیریں پلیٹ میں سموسہ رکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ناہید نے مڑ کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں شرارتیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔

"کہاں ہم اور کہاں قصر رعنا میں دعوتیں" وہ پھر چپکے سے بولی "دعا دیتے ہیں تمہارے دم کو" یاسمین ناہید کے قریب آرہی تھیں۔ شیریں اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"تم کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔ میں جب سے تمہیں دیکھ رہی ہوں" یاسمین بڑے پیار سے ناہید کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"میں نے تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھا لیا ہے"۔ ناہید نے جواب دیا۔ شیریں کی جھکی ہوئی نظریں بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ ناہید نے جان بوجھ کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ پھر کوئی نیا شگوفہ چھوڑے گی۔ اس لئے ناہید نے اپنی توجہ پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی طرف مبذول کر دی۔

"کچھ جادو کر دیا ہے ان پر" شیریں آہستگی سے بولی۔

"کن پر" ساتھ بیٹھی ہوئی مسز ناصر بول اٹھیں۔ وہ بڑی پر اشتیاق نظروں سے ناہید کو دیکھ رہی تھیں۔ ناہید نے گھبرا کر دیکھا۔ شیریں مسکرا رہی تھی۔

"یہ بہت بڑی جادوگر ہیں بچ کے رہیئے گا"۔ وہ ہنستے ہوئے مسز ناصر سے مخاطب تھی۔

"واقعی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو چائے بھی بھول گئی۔ انہیں ہی دیکھے جانے کو جی چاہ رہا ہے"۔ مسز ناصر نے ہنستے ہوئے کہا ان کی باتیں سن کر یاسمین بھی آگئیں۔

"یاسمین" مسز ناصر بولیں "تم نے ہمارا تعارف تو کرایا نہیں"۔

"" آپ دیر سے پہنچیں تھیں" یاسمین نے کہا "یہ ہماری نئی دوست ہیں مس ناہید"۔

"ماشاء اللہ کیا پیاری پیاری صورت پائی ہے" مسز ناصر تعریف کرنے لگیں۔ اور ناہید کے چہرے پر شفق کی سرخیاں لہرانے لگیں۔

"سیرت صورت سے بھی زیادہ حسین ہے" یاسمین اس کے بالوں میں ڈھیلے ڈھالے ربن سے کھیلتے ہوئے بولیں۔ شیریں نے چبھتی ہوئی شریر نظروں سے اسے دیکھا ناہید کا رنگ سرخ ہو گیا۔

چائے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں آگئے۔ مخملیں صوفوں پر نرم نرم کشن بیٹھنے والے کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آغوش تعیش میں دھنسا جا رہا ہو۔ کمرہ دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ ناہید، شیریں اور مسز ناصر ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عورتوں کی اکثریت ناہید کے حسن سے متاثر تھی اور بار بار اسی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اس تذکرے سے ناہید بڑی گھبرا رہی تھی۔

"آپ یہیں رہتی ہیں" مسز ناصر نے ناہید سے پوچھا "پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا"۔

ناہید اب تک اسی حملے سے ڈر رہی تھی۔ بغل میں بیٹھی ہوئی مسز ناصر نے چپکے سے وار کر ہی دیا آخر وہ اس سوال کا کیسے جواب دے۔ وہ سوچنے لگی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اور کچھ مضطربانہ اس نے شیریں کی طرف دیکھا۔ بیگم ناصر اپنے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

"آپ یہاں نووارد معلوم ہوتی ہیں"۔ انہوں نے پھر کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"جی" یہ اس کا مختصر سا جواب تھا۔

"آپ کے والدین"

"وہ فوت ہو چکے ہیں" ناہید جلد از جلد اس موضوع کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ مسز ناصر ایک سوال کے بعد دوسری سوال کرنے لگیں۔ یاسمین آ گئیں۔ ناہید انکی طرف متوجہ ہو گئی۔ مسز ناصر کی باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"ناہید گانا سنائیں گی"۔ شیریں نے یاسمین سے کہا۔

"سچ" وہ فرط مسرت سے جھوم اٹھیں۔ ناہید نے شیریں کو گھورا۔ لیکن یاسمین مصر تھیں۔ اور مسز ناصر تو جیسے اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔

"ضرور سنیں گے"۔

گانے کا سن کر دوسرے صوفوں پر بیٹھی ہوئی خواتین بھی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگیں۔

شیریں بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ناہید کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ آداب محفل کا خیال تھا۔ ورنہ وہ اس سے ضرور لڑ پڑتی۔

"سنائیے ناں" پروین صوفے کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ "کوئی پھڑکتی ہوئی غزل ہو جائے۔ لطف آ جائے گا"۔

"میں ستار کے بغیر نہیں گا سکتی"۔ ناہید نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا پروین کچھ مایوس سی ہو گئی۔

"ستار ابھی آ جاتی ہے"۔ یاسمین بولیں "منصور کو بھی ستار کا بڑا شوق ہے"۔

یاسمین اٹھ کر چلی گئیں۔ شیریں نے ناہید کے پہلو میں پھر ہلکی سی چٹکی لی۔ وہ خاموش رہی۔ ستار آ گئی۔ ناہید اٹھی۔ اک جھجک کے ساتھ ستار لے لی۔ ستار پر جھکی ہوئی وہ ایک فن کار کی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ اک ماہر فن کی طرح اس نے تاروں کو دیکھا اور مضراب کی ہلکی سی ضرب سے تار جھنجھنا اٹھے۔ اس کی مخروطی انگلیاں تاروں پر رقص کر رہی تھیں اور آہنی تاروں کے ٹھنڈے ٹھنڈے ہونٹوں سے درد یلے گیت پھوٹ رہے تھے۔ کچھ دیر وہ خالی ستار بجاتی رہی۔ خواتین کی باتیں ختم ہو گئیں۔ مباحثے ٹھنڈے پڑ گئے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ گا رہی تھی۔ نغمہ ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز ستار کے مدھر اور یاس انگیز سروں میں مل کر فضا کے چھائے ہوئے سکوت کا سینہ چیر رہی تھی۔ اس کی آواز کا قدرتی سوز اس کے گلے کا زیر و بم اور المیہ غزل کے جانگداز اشعار نے ماحول کو افسردہ بنا دیا۔

ڈرائینگ روم کی پچھلی کھڑکیاں گول باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ اس باغ میں ایک بوڑھے درخت سے ٹیک لگائے منصور مایوس سے کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں مرمریں حوض میں نصب شدہ نسوانی مجسمے پر جمی ہوئی تھیں

جس کی آنکھوں سے پانی آنسوؤں کے قطروں کی طرح نکلتا تھا اور حوض میں گرتا تھا۔ فن کار نے اپنے فن کو عروج پر پہنچایا تھا۔ سورج کی بیمار کرنیں حوض کے پانی پر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ سگرٹ کا ادھ جلا ٹکڑا ہاتھ میں لئے منصور یوں تو بڑے انہماک سے اس مجسمے کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کی نگاہوں کا جمود بتا رہا تھا کہ وہ کچھ اور ہی بات سوچ رہے ہیں۔

آج جس مقصد کے لئے یاسمین نے یہ چائے دی تھی۔ وہ مقصد انہیں بے مقصد نظر آ رہا تھا۔ یاسمین کی ضد پوری کرنے کے لئے زلفی چچا نے فیصلہ دے دیا تھا منصور کو بھی ان کا دل رکھنے کی خاطر خاموش رہنا پڑا تھا۔ لیکن اس کا انجام...... وہ بھیانک انجام کا تصور کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ کاش وہ اپنے دل کی وسعتوں کو یاسمین کے سامنے پھیلا سکتے۔

منصور دل گرفتہ ہو رہے تھے۔ اپنی محبت کی مختصر سی زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح نظروں میں گھوم رہے تھے۔ ناہید نے پہلی نظر میں ہی ان کی نظروں میں جو مقام حاصل کر لیا تھا وہ اپنی جگہ اٹل تھا۔ منصور راستے کی ہر دشواری کو کچل سکتے تھے۔ اور وہ پہلے ہی سے ان دشوار گزار راہوں کو طے کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کے راستے میں یاسمین نے معاشرے کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ یہ دیوار وہ ایک ٹھوکر سے گرا سکتے تھے۔ لیکن اس کی زد میں یاسمین آ جاتی تھیں۔ یاسمین جوان کی ایک ہی ایک بہن تھی جو مونس و غمگسار ہوتے ہوئے بھی دولت کی حد بندیوں کی قائل تھیں۔ منصور ان کا دل توڑتے ہوئے بھی گھبرا رہے تھے۔ اس وقت وہ ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے۔ سوچتے سوچتے ان کا دماغ تھک چکا تھا۔ سگرٹ زیادہ پینے کی وجہ سے ان کا حلق سوکھ رہا تھا۔

نیلگوں آسمان رات کی آمد سے سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے بے مقصد گھوم پھر رہے تھے۔ دھند لکے چھا جانے کو مچل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ منصور نے سگرٹ پھینک دیا وہ ابھی تک سلگ رہا تھا پیر بڑھا کر انہوں نے سگرٹ کو کچل ڈالا دھواں اٹھنا بند ہو گیا۔ سگرٹ بجھ گیا۔ کچھ دیر تک مسلے ہوئے سگرٹ کو دیکھتے رہے۔ انہیں اس وقت یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ سگرٹ کی طرح سلگ رہے ہیں۔ سلگتے رہیں گے۔ تا وقتیکہ موت کا قدم ان کی ہستی کو کچل دے۔ وہ عشق کی ٹھنڈی آگ میں سلگتے رہیں گے۔ اور دھواں اٹھتا ہی رہے گا۔

انہوں نے ایک گہری آہ بھری حسرت آمیز نظروں سے آسمان کو دیکھا۔ بادلوں کو دیکھ کر انہیں اس دن والی بارش یاد آ گئی۔ وہ ناہید کے پاس بیٹھے تھے۔ میز پر کاغذات بکھرے تھے۔ ناہید پن کے سرے سے حسب سابق کھیل رہی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج خوف ناک ہوتی جا رہی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے پھوار اندر آ رہی تھی۔ ناہید نے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف کر دیئے۔ میز پر رکھا ہوا خوب

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

صورت ٹیبل لیمپ پھوار کی زد میں تھا۔ ناہید نے اٹھ کر لیمپ کونے والی میز پر رکھ دیا اور اس کا پلگ اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ وہ کچھ اتنا سخت تھا کہ باوجود کوشش کے وہ نہ نکال سکی۔ وہ کچھ خفیف سی ہو کر منصور کی طرف دیکھنے لگی۔

بھیگے ہوئے موسم اور ناہید کی موجودگی ان کے جذبات میں ہلچل مچائے ہوئے تھی۔ گہرے فاختی کپڑوں میں وہ بادلوں کا ایک جزو ہی معلوم ہو رہی تھی۔ بادل جو بجلیوں سے بھرپور تھا۔

"بس اتنی ہمت" منصور ہنستے ہوئے اٹھے پلگ واقعی سخت تھا زور دار جھٹکے سے انہوں نے کھینچا وہ تو نکل آیا اس کے ساتھ ہی بجلی کا شعلہ سا پیدا ہوا نیلا شعلہ ناہید کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا" منصور نے پاس کھڑی ہوئی ناہید کو دیکھا۔

"میں سمجھی" وہ لکنت زدہ سی آواز میں بولی "آپ کا ہاتھ چھو گیا ہے"۔

منصور مسکرا دیئے اور ناہید کو بغور دیکھنے لگے۔

"اگر چھو بھی جاتا تو کیا ہوتا"۔

"تو.........تو" وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اپنی بے ساختہ چیخ پر اسے ندامت سی ہو رہی تھی۔ اس نے مجوب سی نظروں سے منصور کو دیکھا اور انہیں اس کی آنکھوں میں محبت کا بحرِ ذخار ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آیا۔ جذبات کی ہلچل دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی۔ ناہید جلدی سے اپنی سیٹ پر جا بیٹھی اور منصور کے جنوں کو ہوش آ گیا۔

ناہید کی گہری گہری آنکھوں میں وہ اس سے پہلے بھی لہراتے ہوئے طوفان دیکھ چکے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں شعلہ بلند ہوا تھا۔ اور دونوں نے اپنا اپنا دامن اس کی لپیٹ سے بچانے کی بجائے اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ آگ تیزی سے جل رہی تھی اور اس کی تپش دونوں کو جھلس رہی تھی۔

منصور خیالات میں کھوئے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے کے خیال سے قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائینگ روم کے پیچھے سے گزرے۔ فضا مرتعش تھی۔ نغمہ ہوا کی لہروں میں تھرتھراہٹ پیدا کر رہا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر کھڑکی کے قریب رک گئے۔ وہ سننے لگے۔ آواز ان کی روح کی گہرائیوں میں اترنے لگی۔ اک یاس انگیز موسیقی اک مایوس ترنم جیسے کوئی دکھی روح اکیلی ویرانوں میں بھٹک رہی تھی بند راستوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا ماتھا پھوڑ رہی ہو۔ تار چیخ رہے تھے۔ نغمہ پکار بنتا جا رہا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ان کا دل کوئی برمے سے چھید رہا ہو۔ کوئی ان کے کچے زخموں میں نشتر چبھو رہا ہو۔ وہ مضطرب ہو گئے۔ آنکھیں بند کئے دیوار سے ٹیک لگائے وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ نغمہ رک گیا۔ چیخ مدھم پڑ گئی۔ پکار خاموشیوں میں ڈوب گئی۔

منصور نڈھال سی چال چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔

یاسمین نے پروگرام کے مطابق ناہید کو رات کے کھانے پر روک لیا۔ اس نے بہتیرا چاہا چلی جائے۔ لیکن یاسمین کے محبت آمیز اصرار کے سامنے اسے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ اس کی تھکی ماندی روح بھی کسی ایسی ہی شفقت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے ستانے کا آسرا ڈھونڈ رہی تھی۔ سب مہمان چلے گئے۔ مسز ناصر ناہید کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتی گئی۔ اور شیریں اسے چبھتی ہوئی شریر نظروں میں بہت کچھ کہتی ہوئی چلی گئی......

یاسمین منصور اور ناہید کا تعارف جلد از جلد کروانا چاہتی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لئے باہر گئیں۔ منصور کو ڈرائنگ روم میں آنے کا کہہ کر واپس آ گئیں۔ ناہید کھڑکی کے قریب کھڑی سوچ میں مستغرق تھی۔ یاسمین اس کے قریب آ گئیں۔ انہیں اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ انہوں نے بانہیں پھیلا دیں۔ اور وہ ان سے یوں لپٹ گئی جیسے ان سے مدتوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں خواہش مچلنے لگی کہ کاش یہ لمحات ابدی ہو جائیں۔ وقت پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کی طرح منجمد ہو جائے اور وہ اپنی بھوکی پیاسی روح کو لئے اسی سینہ سے چمٹی رہے۔ جس میں محبت کی گرمی اور پیار کی ٹھنڈک تھی۔

برآمدے میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ ناہید سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی روح ابھی تک کیف آمیز سرور محسوس کر رہی تھی۔ تیز برقی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اور وہ عقیدت بھری نظروں سے یاسمین کو دیکھ رہی تھی۔ ادھر منصور دروازے کے عین وسط میں کھڑے بڑی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے آنکھوں کو کچھ اس انداز سے جھپکا جیسے اپنی بصارت پر یقین نہ ہو۔

"آؤ منصور" یاسمین نے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

ناہید نے چونک کر دیکھا۔ وہی اپالو کا مجسمہ۔ وہی انسان کا روپ دھارے ہوئے کوئی دیوتا۔ لانبا قد۔ تابناک چہرہ۔ روشن آنکھیں۔

منصور جو اس کے دل کی دھڑکن بن چکے تھے۔ جو اس کے معبدِ دل کے معبود تھے۔ جن کی پرستش وہ چپکے چپکے کئے جا رہی تھی۔

منصور کی آنکھوں میں چاندنی راتوں کا عکس لہرانے لگا۔ وہ اک مستانہ چال چلتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔

"ہماری دوست ناہید سے ملو منصور"۔ یاسمین ان کی آنکھوں میں اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے بولیں۔ "اور ناہید یہ میرے بھائی منصور ہیں......"

منصور کو اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے تپتے ہوئے صحراؤں کی جلتی ہوئی ریت کو ابرِ رحمت نے سرد کر دیا ہو۔ آتشیں بگولے فردوسی ہواؤں میں بدل گئے ہوں۔ کائنات مسکرا اٹھی ہو۔ اور یاسمین کی لاعلمی پر ناہید گھبرا گئی۔ منصور نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے۔ ناہید سٹپٹا گئی۔ آدابِ محفل کا خیال رکھتے بڑے تامل کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ منصور نے اس کا ہاتھ زور سے دبا کر چھوڑ دیا۔ ان کی آنکھوں میں شرارت خوشیوں کے ہم آہنگ ہو کر ناچ رہی تھی۔ ناہید کو پسینہ آگیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ کا دباؤ وہ ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اور آنکھوں کے گوشے بھیگ سے گئے تھے۔ منصور کا یہ ڈرامائی انداز مسرت بخش بھی تھا۔ اور تکلیف دہ بھی۔

یاسمین دونوں کی کیفیت سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ منصور کی کشادہ آنکھوں میں انگڑائیاں لیتا ہوا خمار اور ناہید کے سراپا پر چھائی ہوئی گھبراہٹ کی کپکپی ان کی جیت کا کھلم کھلا اعلان تھی۔ انہیں اس وقت ایسے خوشی ہو رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑی مہم سر کر لی ہو۔ کوئی میدان مار لیا ہو۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ صوفے پر ناہید یاسمین کے پہلو سے چپکی لگی بیٹھی تھی۔ منصور کھڑکی کے قریب کھڑے چشمِ شوق سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"باجی آپ کی دوست گونگی ہیں۔" انہوں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ناہید جب سے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ یاسمین ہنسنے لگیں۔

"بڑے شریر ہو۔" انہوں نے بھائی کو بڑے پیار سے ڈانٹا۔ "بھاگو یہاں سے" اور ناہید کا دل ہول کھا رہا تھا۔ وہ عجب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یاسمین کو اس کے بارے میں شیریں سے صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ لیکن اس کے اوصافِ حمیدہ۔ اس کے لباس کی نفاست۔ اور ہاتھ میں پڑی ہوئی بڑے سے ہیرے کی انگوٹھی سے انہوں نے اس کے بہت معزز اور پرشکوہ خاندان کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ناہید کی لحظہ بہ لحظہ پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ ان کے بھائی کے دفتر کی معمولی کلرک تھی۔ اور اس کا خاندان رسوائیوں کا پلندہ تھا۔

کھانے کی میز تنوعات سے پُر تھی۔ بیرے سفید وردیوں پر سنہری پٹیاں لگائے بڑے ادب سے کھڑے تھے۔ لذیذ کھانوں سے اٹھتی ہوئی خوشبوئیں اشتہا کو اور بڑھا رہی تھیں۔ زلفی چچا کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ صبح سے دولت آباد گئے ہوئے تھے۔ منصور انہیں دو دفعہ فون کر چکے تھے۔ لیکن ابھی ابھی انہوں نے اطلاع دی کہ وہ رات نہ آسکیں گے۔ انتظار بے کار تھا۔ یاسمین ناہید کے مقابل چوڑی میز کے دوسری طرف بیٹھی تھیں۔ ان کے دائیں طرف میڈیم ڈی سوزا مشرقی حسن کے اس لاجواب پیکر کو دیکھ رہی تھی۔ محل کے سب افراد کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ منصور کی دور پار کی بیوہ خالائیں اپنی معمر آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ حسنہ کی والدہ کی عینک ناک پر آگئی تھی۔ اور وہ عینک کے شیشوں کے اوپر سے بار بار آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ یاسمین نے بڑے فخر سے اپنی اس دوست کا تعارف کرایا تھا۔ ناہید بڑی جھجک محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس وقت اک سربلند

خاندان کے سرفراز افراد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اور اسے اپنی نسبی پستی کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔

"زلفی چچا آج رات نہ آسکیں گے۔" منصور نے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بات کچھ بڑھ گئی ہے۔"

"تو پھر شروع کیا جائے کھانا۔" یاسمین بولیں۔ منصور بڑھ کر ناہید کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ جو یاسمین نے دانستہ ان کے لئے خالی رکھی تھی۔ ناہید اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میڈیم ڈی سوزا کے لئے اس کا انتخاب تعجب کن تھا۔ یاسمین نے جان بوجھ کر آج حرم سرا کے ڈائننگ ہال میں کھانے کا بندوبست کروایا تھا۔ وہ اپنی حسین دریافت کو سب سے متعارف کروانا چاہتی تھیں۔

ناہید کو بالکل بھوک نہ تھی۔ کچھ منصور کے ساتھ بیٹھ جانے سے رہی سہی بھوک بھی اڑ گئی۔

"شرماؤ نہیں ناہید۔" یاسمین بار بار اس سے کہہ رہی تھیں۔ ناہید کی نظروں سے بے چین سی گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔ یہ گھبراہٹ اس کے حسن کا اک لازمی جزو بن چکی تھی۔

سب کھانے میں مشغول تھے۔ ناہید بھی سست رفتاری سے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ کھانے سے زیادہ وہ چاندی کے چھری کانٹے سے کھیل سے تھی۔

"یہ کھیل کب تک جاری رہے گا۔" منصور معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں بولے۔ مچھلی کے کبابوں کی پلیٹ اس کی جانب بڑھا کر وہ اپنی پلیٹ پر یوں جھک گئے۔ جیسے کچھ کہا ہی نہیں۔ ناہید کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا۔ اور منصور نیچی نظروں سے اس کے خوب صورت ہاتھوں کو دیکھنے لگے۔ جن کے لمس نے ان کی رومانی دنیا میں قیامت مچا رکھی تھی۔

منصور کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ اور ناہید سوچ رہی تھی کہ کھیل ہی تو کھیلا جا رہا ہے۔ تحت الشعور میں چھپی ہوئی شمسہ طنز بھری آنکھوں سے گھورتی ہوئی ابھرنے لگی۔ سب کھیل ہی تو ہے۔ ناہید دل میں کہہ رہی تھی۔ منصور۔ شمسہ۔ منصور ذہن میں دو نام گھوم رہے تھے۔ یہ اک دھنوان کا کھیل ہے۔ اک دولت مند کا مذاق ہے شمسہ کی چبھتی ہوئی نظریں کہہ رہی تھیں۔ اور ناہید کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ منچلے رئیس ایسے کھیل کھیلا ہی کرتے ہیں۔ اور جانے کہاں سے تخیل کے پردوں کو چیرتی ہوئی اسے اپنی ماں کی شکل نظر آئی...... ماں... اس کے ساتھ بھی کسی ایسے ہی دھنوان نے کھیل کھیلا تھا۔ اس کی ماں نے بازی ہار دی تھی۔ اور اس ہار نے آندھی کی طرح اسے اپنے نسوانیت کے بلند مقام سے اڑا کر رذالت کی پستیوں میں پھینک دیا تھا۔ اس کی ماں...... اک طوائف تھی۔ ناہید کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ وہ ایک رنڈی کی لڑکی ہے۔ اسے اپنے آپ سے کراہت محسوس ہونے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ گندگی کے ڈھیر تلے دبی ہے۔ اس سے تعفن آرہی ہے۔ سڑاند اٹھ رہی ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ماں کی طوائفیت اس کی زندگی پر خونی دھبہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس دھبے کو اس نے اپنے تیز ناخنوں سے کھرچ ڈالنا چاہا تھا۔ وہ دھبہ نہ اترا۔ ناخنوں کی کھرچ سے اک زخم بن گیا۔ ایسا زخم جو دن بدن گہرا ہوتا گیا۔ اور ہوتے ہوتے اس کی روح کا شگاف بن کر رہ گیا۔

اس نے ماضی کے خوف ناک مردہ چہرے پر چادر ڈال دی تھی...... اپنی ماں کی حیثیت کسی کو نہ بتائی تھی۔ لیکن اس کا زندہ ضمیر پہلو میں نشتر چبھوتا تھا۔ اور مردہ ماضی کا چہرہ چادر کے پیچھے سے اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے اسے برابر گھور رہا تھا۔ واقعات کی لپیٹ میں چھپایا ہوا یہ کریہہ چہرہ اپنے خوف ناک اتار چڑھاؤ سے اسے ڈراراہا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ سہمی ہوئی تھی۔ خوف کھا رہی تھی۔

کھانے کے بعد یاسمین ناہید کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد منصور بھی آ گئے۔ دونوں بہن بھائی مسرور تھے۔ یاسمین اصلیت سے آگاہ نہ تھیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ ناہید کے بے پناہ حسن کے سامنے منصور نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ یہی ان کی خواہش تھی۔ یہی تمنا تھی۔ اور جب خواہش پوری ہو جائے تمنا بھر آئے۔ خوشی کسے نہیں ہوتی۔

ناہید کو خیالات کی تند و تیز یورش نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ نڈھال سی ہو گئی۔ منصور کو اپنی طرف بغور دیکھتے دیکھ کر وہ اور بھی گھبرا گئی۔

"کہیں میرے خیالات کا عکس میرے چہرے پر تو نہیں پڑھ رہا۔ میری پیشانی پر کوڑھ کے داغ کی طرح ان مٹ رنڈی کا لفظ تو انہیں نظر نہیں آ رہا۔" ناہید کے دل میں اس خیال پر اک ابال سا اٹھا۔ دماغ میں لال لال ٹمیالی ٹمیالی آندھیاں چلنے لگیں۔ کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے سر صوفے کے بازو پر لٹکا دیا اور اس کے حواس پر غنودگی سی چھا گئی۔

"باجی ان کی طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے شاید۔" منصور نے یاسمین سے کہا۔ وہ دیر سے اس کے چہرے پر کشمکش کی پھیلتی سکڑتی لہروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ یاسمین اس کے پاس آئیں۔

"ناہید" انہوں نے اس کے شانے کو تھپتھپایا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ منصور جلدی سے اٹھ کر یاسمین کے قریب آ گئے۔ یاسمین نے دو تین دفعہ اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ پا کر انہوں نے بڑی محبت سے اس کا سر اٹھایا۔ پیشانی کو چھوا۔ وہ پسینے سے تر تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔

"یہ تو بے ہوش ہو گئیں ہیں منصور"

دونوں بہن بھائی بے حد گھبرا گئے۔

"پانی لاؤں چھینٹے دینے سے شاید ہوش میں آ جائیں۔" یاسمین اسے صوفے پر لٹاتے ہوئے بولیں۔

"شام جب گانا سنایا اسی وقت سے بڑی اداس تھیں۔" انہوں نے مزید کہا۔ گانا ناہید گا رہی تھی۔ یہ انکشاف منصور کے لئے اگر انوکھا نہیں تو کیف زا ضرور تھا۔

"پانی لاؤں۔" انہوں نے پھر کہا۔ "یا ڈاکٹر کو فون کروں۔"

وہ گھبرائی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

منصور صوفے کے قریب گھٹنے ٹیکے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ اس کی ٹھنڈی پیشانی پر تھا۔ اور دوسرا اس کی نبض پر۔ ان کا گرم تنفس ناہید کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمبے سانسوں سے الجھ رہا تھا۔ وہ بڑے غور سے بڑے انہماک سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اڑی ہوئی رنگت۔ بند آنکھوں پر پلکوں کی نوکیلی جھالریں۔ اس کا سویا ہوا حسن ہزاروں فتنے جگا رہا تھا۔ منصور چاہ رہے تھے۔ یہ لمحات اتنے طویل ہو جائیں کہ سرخ و سیاہ صدیوں کے سینے پر پھیل جائیں۔ ان کا سلسلہ ابد سے جا ملے۔ وقت تھم جائے۔ فضا ساکن ہو جائے۔ اور وہ یونہی اس کی نبض پر ہاتھ رکھے اس کے اوپر جھکے رہیں۔

رک رک کر چلتی ہوئی سانسیں اعتدال پر آنے لگیں۔ ہموار ہونے لگیں۔ چہرے پر زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ناہید نے آنکھیں کھول دیں۔

منصور کی مدہوش کیفیت کا خمار آلود تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گئے ناہید نظر جھکائے بغیر انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی خالی خالی نظروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی۔

"آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔" منصور نے اسے بتلایا۔ سارا واقعہ ناہید کی نظروں میں گھوم گیا۔ اس نے اٹھنا چاہا۔

"لیٹی رہیئے" منصور بولے۔ "ابھی ڈاکٹر آ رہا ہے۔"

"ڈاکٹر؟" وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"بے ہوش جو ہو گئی تھیں آپ۔" انہوں نے اس کی حیرانگی دور کرنے کے لئے پھر کہا۔

منع کرنے کے باوجود وہ صوفے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی تھکان محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں شل سی ہو رہی تھیں۔ اس کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔

منصور اس کے قریب دبیز قالین پر اس طرح دو زانو بیٹھے تھے۔ جیسے کسی دیوی کے حضور میں عقیدت مند پجاری نذرانہ پیش کر رہا ہو۔ اور ناہید یوں بیٹھی تھی۔ جیسے نذرانہ لینے میں کچھ پس و پیش کر رہی ہو۔ شرف قبولیت بخشتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔

........○........

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۹

"کہاں جارہی ہیں امی۔" فاخرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ بیگم رحمان ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

"ذرا ناہید کو دیکھنے جارہی ہوں۔ کئی دنوں سے وہ آئی نہیں......" کنگھی میں لپٹے ہوئے بالوں کو نکالتے ہوئے بولی۔

"میں بھی جاؤں گی۔"

"نہیں بیٹی تمہاری پڑھائی کا ہرج ہوگا۔"

فاخرہ ساتھ جانے کے لئے مچل گئی۔ وہ بار بار جانے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر خلیق اور ناصرہ بھی کمرے میں آگئے۔ ناصرہ کے ہاتھ میں موٹی سی کورس کی کتاب تھی۔ آج چھٹی تھی۔ اور وہ صبح ہی صبح کتابیں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ سالانہ امتحان قریب تھا۔

"کہاں سیر کو جانے کے لئے تڑپ رہی ہے بی بنو۔" ناصرہ نے کہا۔ "سالانہ امتحان سر پر آرہا ہے۔ اور جناب کو جیسے ہوش ہی نہیں۔"

"سیر کو تھوڑا ہی جارہی ہیں امی۔" فاخرہ نے جواب دیا۔ ماں اسے دیکھ کر ہنس دی۔

"ذرا میرے بال تو باندھ دو ناصرہ۔" اس نے کہا۔ ناصرہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔ اور ماں کے پیچھے کھڑی ہو کر بال باندھنے لگی۔

"کہاں جائیں گی امی۔"

"ذرا ناہید کے ہاں جارہی ہوں۔" ماں نے جواب دیا۔

"امی میں بھی چلوں۔" ناصرہ نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"اب تو پڑھائی کا ہرج نہ ہوگا۔ امتحان تو سر پر نہ آرہا ہوگا۔" فاخرہ منہ بسورے میز پر بیٹھی تھی۔ میں

نے طنزاً کہا۔

"اوروں کو نصیحت خود میاں فضیحت۔" خلیق نے فاخرہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"دل تو آپ کا بھی جانے کو چاہ رہا ہوگا خلیق ماموں۔" ناصرہ نے چوٹ کی۔ خلیق شرما گیا۔

وہ ناہید کی زلف پیچاں میں الجھ گیا تھا۔ اتنا کامل حسن دیکھنے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اور وہ بھی یوں کہ بیگم رحمان نے اس کے ساتھ اک سنہری سی داستاں چسپاں کر دی تھی۔ اور اس کا حصول بھی بڑا سہل بتایا تھا۔ وہ اس کا متوالا ہو گیا تھا اور باوجود ناہید کے اس دن کے سرد رویے کے اس نے اسے حاصل کرنے کو تن من کی بازی لگا دی تھی۔ چند دنوں کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ لیکن جانے کو جی نہ چاہا...... چھٹی بڑھانے کی درخواست بھیج کر وہ یہیں رک گیا تھا۔

بیگم رحمان کی جہاندیدہ نظریں اس کی طبیعت کے رجحان کو پرکھ رہی تھیں۔ اس دن جب انہیں ناہید کے چلے جانے کا پتہ چلا تھا۔ تو انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ اسے اس کے فطری شرم وحیا پر محمول کیا تھا۔

"امی ہو جاؤں میں بھی تیار۔" ناصرہ نے پھر پوچھا۔

"میں بھی جاؤں گی۔" فاخرہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"امی اسے ساتھ نہ لے جائیں۔ یہ ان سے بے ہودہ مذاق کرتی ہے۔ وہ خفا ہو جاتی ہیں۔" ناصرہ نے ماں سے شکایت کی۔

"کیا بے ہودہ مذاق کیا میں نے۔" وہ تیز آواز سے بولی۔

"اس دن کیا بکواس کر رہی تھیں۔" اس نے بھی غراتے ہوئے کہا۔

دونوں بہنیں الجھ پڑیں۔ خلیق اور بیگم رحمان ہنسنے لگے۔

"آج تم دونوں نہیں جاسکتیں۔" ماں نے بڑے پیار سے کہا۔ دو ہی بیٹیاں تھیں۔ لاڈ پیار میں رہتی تھیں۔ فاخرہ تو بعض اوقات بدتمیزی پر بھی اتر آتی تھی۔

"آج مجھے اس سے کچھ ضروری کام ہے۔" بیگم رحمان خلیق کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑی۔ خلیق کے چہرے کا سانولا رنگ اور گہرا ہو گیا۔

دونوں بہنوں کو جھگڑتا چھوڑ کر وہ باہر آگئی۔

"خلیق" اس نے بھائی کو آواز دی۔ جو دونوں بہنوں میں مصالحت کروا رہا تھا۔

"آیا"

"ذرا دیکھو تو ڈرائیور ہے۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خلیق تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔ ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی نکالنے کو کہتا آیا۔

"آج پورا پورا بندوبست کر کے آؤں گی۔"

چھوٹی سی کالی موٹر میں داخل ہونے سے پہلے بیگم رحمان نے خلیق کے کان میں کہا۔ اس کی نظروں میں ناہید کا چہرہ گھوم گیا۔ حسین چہرہ جس پر جنتی رعنائیوں کے پرتو پڑ رہے تھے......

موٹر چلی گئی۔ اور وہ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ ناہید کا خیال کر کے اسے بے پئے نشہ آ رہا تھا۔

ناہید ابھی تک اپنے بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ چھٹی کے دن ویسے بھی دیر سے اٹھنے کی عادی تھی۔ لیکن آج تو دس بجنے والے تھے وہ ابھی تک نہ اٹھی تھی۔ ملازمہ کئی مرتبہ آ کر ناشتے کا پوچھ چکی تھی۔

نرم نرم تکیئے میں منہ چھپائے دونوں بازوؤں کا حلقہ سا کئے وہ الٹی لیٹی ہوئی تھی۔ منصور کا ہلکے سبز رنگ کا نرم اور قیمتی کمبل ابھی تک اس کے شانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے لہردار بال اس کی پشت اور تکیئے پر پھیلے ہوئے تھے۔

رات کے واقعے کی تلخی و تلطف نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس کی خلط ملط سی سوچ نے اسے مضمحل کر دیا تھا۔ رات کا ایک ایک واقعہ متحرک تصویروں کی طرح اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ وہ کبھی تو دہکتے ہوئے کوئلوں کی تپش محسوس کر رہی تھی کبھی نرم جسم برسنے والی کالی گھٹاؤں کی بوندوں کی ٹھنڈک۔ کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ چاندی کی کشتی میں سوار ہلکی ہلکی نرم چاندنی کی لہروں کے سینے پر خراماں خراماں چلی جا رہی ہے اور کبھی یوں لگتا جیسے اس کی اکیلی کشتی گردابوں میں پھنس کر ہچکولے کھا رہی ہے۔ طوفانی بھنوروں میں چکر کھا رہی ہے۔ ان متضاد خیالوں نے اس کے دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ صبح سے اس نے چائے تک نہ پی تھی۔ ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا لیکن اس کی دی ہوئی دوائی جوں کی توں میز پر پڑی تھی۔ قصر رعنا سے دو دفعہ ملازم اس کی خبر پوچھنے آ چکا تھا۔

تکیئے پر سر رکھے آنکھیں بند کئے۔ وہ تخیل کے پردوں سے منصور کو صوفے کے قریب دوزانو بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ سہارا دے کر موٹر میں سوار کراتے ہوئے اس کے گرد کمبل لپیٹے ہوئے۔ بڑی شائستگی سے بستر پر لٹا کر اپنا سبز کمبل اس پر ڈالتے ہوئے منصور کو وہ تصور کی آنکھوں سے چوری چوری دیکھ رہی تھی۔ اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن ان مسرت افزا لمحات کو ایک جانگسل خیال مجروح کر رہا تھا۔ اپنی بے ہوشی کی اصل وجہ کا خیال...... ماں...... ماں کی ذات اس کی ساری مسرتوں پر آتش گیر مادے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

موٹر کے ہارن کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ "شاید منصور آ گئے۔" اس خیال پر اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بالوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کیا۔ بستر سے اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ

بیگم رحمان دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر آ گئی۔ ناہید کا دل بجھ گیا۔ اس کا جی چاہا۔ اسی طرح بستر پر گر جائے۔ جس طرح بڑی دیر سے پڑی تھی۔

"خیر تو ہے۔" وہ بڑی اپنائیت سے ناہید کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "ابھی تک بستر میں ہو۔"

ناہید نے اسے سلام کیا۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"کچھ طبیعت خراب ہے آج؟"

"موسم کی تبدیلی کا اثر ہو گا۔ کوئی دوائی لی ہوتی۔"

ناہید نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر دوائی کی شیشی پڑی ہوئی تھی۔

ناہید کو بیٹھے دیکھ کر ملازمہ چائے لے آئی۔ ناہید ہاتھ منہ دھو کر آ گئی۔ اور پھر بستر پر بیٹھ گئی۔ صرف ایک پیالی چائے لے کر پینے لگی۔ بیگم رحمان نے بڑے اصرار سے اسے ساتھ کچھ کھلانا چاہا۔ وہ کچھ بھی نہ کھا سکی۔

چائے پیتے ہوئے بیگم رحمان ادھر ادھر کی فضول سی باتیں کر رہی تھی۔ ہر بات ہر پھر کر خلیق پر آ کر ختم ہوتی۔ ناہید کے لئے اس کا ذکر سننا تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ لیکن خاموش تھی۔ کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر رحمان کے احسانات اس کا منہ روکے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ سختی سے اسے منع کر دیتی۔

وہ گھنٹہ بھر اس کا دماغ چاٹتی رہی۔ ناہید کا تھکا ہوا دماغ چڑ رہا تھا۔

"ایک اکیلی اور پھر بیمار بھی چند دنوں کے لئے ہمارے ہاں ہی چلی چلو۔" اس نے کسی خوش کن خیال سے مغلوب ہوتے ہوئے پیش کش کی۔

"شکریہ۔" ناہید نے کہا۔ "معمولی طور پر طبیعت خراب ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"شام کو ناصرہ فاخرہ کو بھیجوں گی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "ذرا امتحانوں کی تیاری میں مشغول ہیں۔"

"ان کا حرج ہو گا۔" ناہید نے کہا۔

"نہیں حرج کیسا۔ تم سے ہمیں عزیز کیا ہے بیٹی۔ شام کو خلیق کے ساتھ بھیجوں گی انہیں۔"

خلیق کے بار بار ذکر سے وہ پہلے ہی چڑ گئی تھی۔ اب شام کو اسے یہاں بھیجے گی۔ ناہید کا دماغ استکراہ کا ثقل محسوس کرنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں اب تو۔" ناہید نے نرم انداز میں اسے منع کرنا چاہا۔ "ناصرہ، فاخرہ کو تکلیف نہ دیجئے۔ خود کسی دن آ جاؤں گی۔ ان کا امتحان ہے نا۔"

"تکلیف کا ہے کی۔" بیگم رحمان نے جواباً کہا۔ "تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ خدا کرے یہ تھوڑی بہت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

غیریت جو تم محسوس کرتی ہو۔ وہ بھی جلدی مٹ جائے۔ خدا وہ دن بھی کبھی لائے گا ہی۔ "

بیگم رحمان کے الفاظ ناہید کے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ وہ آئی تو اس کا عندیہ لینے تھی۔ لیکن جانے کیوں صاف صاف بات کرتے ہوئے ہچکچائی۔ اشاروں کنایوں میں ہی بات کر کے چلی گئی۔

ناہید کو دعائیں دیتے ہوئے وہ اٹھی۔ اور شام کو دونوں بہنوں کو خلیق کے ساتھ بھیجنے کا کہتے ہوئے بیگم رحمان چلی گئی۔ دروازے کا پردہ ابھی تک ہل رہا تھا اور ناہید آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

بیگم رحمان کمرے سے نکلی تو برآمدے میں شیریں مل گئی۔ وہ دو تین بار صبح سے ناہید کے کمرے میں جھانک گئی تھی۔ رات اس نے منصور اور ناہید کو موٹر سے اترتے دیکھا تھا۔ اور پھر جاتے ہوئے منصور ناہید کی ملازمہ کو بار بار اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہے تھے۔ اسے آرام سے پڑا رہنے دینے کا کہہ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھ نہ سکی تھی۔ کہ اسے کیا ہوا ہے۔ لیکن جس طرح دونوں سرشار سے موٹر سے اتر کر کمرے کی طرف بڑھے تھے۔ اس کی تیز نظریں بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔

منصور کے بائیں ہاتھ پر کمبل تھا۔ اور دائیں ہاتھ سے ناہید کو سہارا دیئے تھے۔ شیریں 'ناہید کو چھیڑنے' ستانے اور لطف اٹھانے کے ارادے سے صبح سے دو تین بار اس کے کمرے کی طرف آچکی تھی۔ اب آئی تو بیگم رحمان کا سامنا ہو گیا۔ ناہید کے ساتھ وہ دو چار مرتبہ ان کے ہاں جا چکی تھی۔ بیگم رحمان اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ برآمدے ہی میں دونوں کھڑی ہو گئیں۔

"آیئے اب میری طرف چلئے۔ " شیریں نے کہا۔

بیگم رحمان رک نہ سکتی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اپنے آنے کا منشا بیان کیا۔ جو بات کھلے لفظوں میں ناہید سے نہ کہہ سکی تھی۔ شیریں سے کہی۔ وہ جانتی تھی کہ شیریں ناہید کی ہمدم و ہمراز ہے۔ خلیق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ مستقبل میں ناہید کے آرام و آسائش سے پُر زندگی کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا...... کہ شیریں کو ہنسی آگئی۔ وہ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔

اس کے جانے کے بعد شیریں ہنستی ہوئی پردہ اٹھا کر ناہید کے کمرے میں آگئی۔ ناہید بستر پر ہی بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں نرم نرم تکیہ پڑا تھا۔ جس پر دونوں کہنیاں ٹکائے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ تھامے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"سنا ہے آج شام خلیق صاحب منگنی کی رسم ادا کرنے آرہے ہیں۔ " شیریں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لعنت ایسی دوستی پر۔ چپکے چپکے سارا معاملہ طے کر لیا۔ ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں۔ کہنے کو دوست بنا رکھا ہے مجھے۔ "

"کیا کہہ رہی ہو شیریں...... " ناہید پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جو تم سن رہی ہو۔ " شیریں کو معلوم تھا۔ کہ ناہید خلیق کے نام سے چڑ جاتی ہے اس دن دعوت والا قصہ ناہید نے شیریں کو سنایا تھا۔ اور صاف لفظوں میں اسے بتایا تھا۔ کہ اسے یہ بات قطعاً ناپسند ہے۔

"ابھی ابھی بیگم رحمان گئی ہیں نا۔ " وہ ناہید کے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "برآمدے میں مجھے مل گئیں۔ کہنے لگیں۔ آج شام خلیق ناہید کو نشانی کے طور پر انگوٹھی پہنانے آئیں گے۔ "

"شیریں" ناہید زور سے چیخی۔

"کیا تکلیف ہو رہی ہے۔ " وہ بے ساختہ ہنس دی۔ "یونہی بیٹھی رہو گی کیا۔ اچھا خاصہ لڑکا ہے۔ جوان خوب صورت کماؤ۔ اور پھر تمہارا دیوانہ۔ "

"اف بند کرو یہ باتیں۔ " ناہید نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"ارے بھئی اس بے چارے کا قصور بھی کیا ہے۔ تمہیں دیکھ کر کون ہوش و حواس میں رہتا ہے۔ " وہ شرارت سے ہنسی۔ "اللہ قسم میں لڑکا ہوتی تو اب تک تمہارا اغوا بھی کر لیا ہوتا۔ "

ناہید شیریں کی بات پر ہنس نہ سکی۔ اس کے لب پھڑپھڑائے۔ نتھنے پھڑکے اور آنکھیں آنسوؤں سے جھلملانے لگیں۔ شیریں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی روشن آنکھیں ایسے معلوم ہو رہی تھیں۔ جیسے کشتیاں زیر آب آگئی ہوں۔ پانیوں میں ڈوب رہی ہوں۔ وہ بے تاب ہو گئی۔ اور اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"اللہ...... کتنی جلدی رو دیتی ہو تم۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

ناہید کو تو جیسے دل کا غبار دھونے کا بہانہ مل گیا تھا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ شیریں اپنے مذاق پر نادم اسے چپ کرانے کی کوشش میں خود بھی دل گرفتہ ہو گئی۔

"دیکھو ناہید تم چپ نہ ہوئیں۔ تو میں بھی روؤں گی۔ " اس نے اس کا بھیگا ہوا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ لیکن وہ ہنس پڑی۔ اس نے ناہید کو بتایا۔ کہ اس نے بیگم رحمان کو کیسے ٹالا۔ اب خلیق شام کو اپنی بھانجیوں کے ساتھ کبھی نہ آئے گا۔

"جب میں نے کہا کہ ناہید کی منگنی ہو چکی ہے۔ تو اللہ قسم بیگم رحمان کا سانس اوپر کا اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔ " شیریں ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ ناہید بھی مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں ابھی تک آنسوؤں کی نمی تھی۔

"کہنے لگیں ناہید نے تو کبھی تذکرہ ہی نہیں کیا تھا۔ " شیریں کہے جا رہی تھی۔ "میں نے کہا آپ بھی کمال کرتی ہیں خالہ جان۔ ناہید کی عادت سے واقف ہوتے ہوئے آپ اس بات کی امید رکھ سکتی ہیں۔ کہ وہ اپنی منگنی کا قصہ آپ کے سامنے کرتی۔ وہ تو مجھے بھی اتفاقاً ہی پتہ چل گیا۔ میں نے خوب کریدا تو اسے بتاتے ہی بنی۔ لڑکا تعلیم کے لئے انگلینڈ گیا ہوا ہے۔ بس آنے ہی والا ہے اب تو۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

”حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔ “ شیریں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔” ناہید کی خط و کتابت ہے اس سے۔ “ میں نے جواب دیا پہلے تو نہیں تھی۔ لیکن جن حالات میں وہ سلطان پور پہنچی ضروری تھا۔ کہ وہ اسے اپنے حالات سے مطلع کرتی اور تو مونس و غمگسار کوئی تھا نہیں۔ رشتہ دار پہلے ہی جان کے لاگو ہو رہے تھے۔ وہی ایک تھا۔ جس سے ہمدردی کی توقع تھی۔ اور پھر وہ کوئی غیر تو ہے نہیں۔ اس کے مرحوم چچا کا ایک ہی ایک بیٹا ہے وہ۔ اللہ قسم مجھے بیگم رحمان کا مایوس چہرہ دیکھ کر ترس آ گیا۔ تمہارے جیسی شکل و صورت پائی ہوتی۔ تو خلیق بے چارے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیتی۔ “

شیریں نے کچھ ایسی مضحکہ خیز شکل بنائی۔ کہ ناہید کو ہنسی آ گئی۔

شیریں مزے لے لے کر ساری باتیں جو اس نے بیگم رحمان کو ٹالنے کے لئے کہی تھیں۔ ناہید کو سناتی رہی۔ ناہید مطمئن ہو گئی۔ شیریں نے اک بڑا بوجھ اس کے دل و دماغ سے اتار دیا تھا۔ وہ بڑی محبت سے اپنی پیاری سی سانولی سلونی دوست کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ کمبل کہاں سے مارا۔ “ شیریں کے دل میں رات والی بات کئی بل کھا رہی تھی۔ اور وہ ناہید کو ستانے کے لئے آخر بول ہی اٹھی۔ ناہید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ وہ ملائم کمبل پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”رات کھانے کے بعد اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ واپسی پر سردی تھی۔ یہ کمبل......“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”یہ بات ہے۔ “ شیریں آنکھوں کو نچاتے ہوئے بولی۔ ”جبھی رات نواب صاحب چھوڑنے آئے تھے۔ “

”تم......“ ناہید کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔

”میں سونے کے لئے پلنگ پر لیٹی تھی۔ کہ مجھے الہام ہوا۔ دل نے کہا اٹھو۔ اور دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے۔ چک کے پیچھے سے جھانکا۔ “ شیریں آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے بولی۔ ”ایک شہزادہ اور ایک شہزادی ایک دوسرے کی بانہوں کے سہارے جھومتے جھامتے چلے آ رہے تھے۔ “

ناہید شرما گئی۔ اس نے کمبل منہ تک کھینچ لیا۔ شیریں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اسے حجاب آ رہا تھا۔ ”اب سارا دن اس کمبل ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہو گی۔ دوپہر ہونے کو آئی اٹھو گی یا نہیں۔ “ شیریں نے اسے گدگدایا۔

”اللہ قسم شیریں بڑی نیند آ رہی ہے سونے دو۔ “

اس کا دل واقعی سونے کو چاہ رہا تھا۔ رات بھر وہ چین سے نہ سو سکی تھی۔ شیریں کے جاتے ہی وہ

بے خبری کی نیند سو گئی۔ ملازمہ نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔ رات منصور نے اسے اس کے آرام کا خاص خیال رکھنے کی بڑی سختی سے تاکید کی تھی۔

............○............

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۱۰

یاسمین نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ دوپہر کو زلفی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے منصور کو بلا بھیجا تھا۔ وہ اتنی عجلت میں تھے۔ کہ جاتے ہوئے یاسمین سے مل کر نہ جا سکے تھے۔ صبح سے دو دفعہ فون کر چکی تھی۔ منصور یا زلفی دونوں نہ ملے تھے۔ داروغہ نے ہی جواب دیا تھا۔ اب رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ لوٹا تھا۔ زلفی کا تو انہیں انتظار نہیں تھا۔ منصور کا وہ بے صبری سے انتظار کر رہی تھیں۔ وہ رات کے معاملے پر ان سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتی تھیں۔ ناہید ان کی منتخب شدہ لڑکی تھی۔ زلفی کی ایما پر انہوں نے منصور سے کا تعارف کروایا تھا۔ گو منصور کی والہانہ حرکتوں سے انہیں اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے بارے میں وہ ان کے منہ سے آخری فیصلہ سننے کی متمنی تھیں۔

ناہید کے بارے میں انہیں شیریں سے باتوں باتوں میں صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ عاصم آباد کی رہنے والی ہے۔ اور اس کے والدین حیات نہیں۔ انہوں نے قیافہ شناسی سے کام لیتے ہوئے اسے ایک ذی وقار اور عالی خاندان سے منسوب کر لیا تھا۔ اس کی طبعی شرافت اس کے قیامت خیز حسن اور اس کے شائستہ اطوار سے انہوں نے سب اندازہ لگایا تھا۔

سرراہ پڑی ہوئی کسی دلفریب تصویر کے گرد سنہری سنہری حاشئے بڑھا دیئے جائیں۔ اسے خوش نما فریم میں لگا دیا جائے تو یہ زیادتی نہیں۔ کوئی غلطی نہیں بلکہ جاذب النظر تصویر کا حق ہے۔ جو ادا کیا جائے۔

آٹھ بج چکے تھے۔ یاسمین برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔ منصور ابھی تک نہیں آئے تھے۔ یاسمین فون کرنے کے ارادے سے پھر گیلری کی طرف آئیں۔ نمبر ملایا زلفی بول رہے تھے۔

"آج آپ سارا دن کہاں غائب رہے۔ تیسری دفعہ فون کر رہی ہوں" یاسمین نے گلے کے انداز میں کہا۔

"بس کام ہی کچھ ایسا تھا۔ آ کے بتائیں گے۔" زلفی نے جواب دیا۔

"آئیں گے کب"

"صبح"

"اور منصور"

"وہ روانہ ہو چکے ہیں۔"

"آپ بھی آجاتے۔ پھر چلے جاتے"

"کام ہی کچھ اس نوعیت کا ہے۔ آج رات پھر رکنا پڑے گا۔ کل رات کا تو مجھے افسوس ہی رہا۔ بھئی تمہارا دربایاب نہ دیکھ سکا۔ ساتھ ہی ان کی ہنسی کی آواز آئی......

"منصور نے آپ سے کچھ کہا" یاسمین نے شوق سے پوچھا۔

"داد دے رہے تھے تمہاری پسند کی"

یاسمین کو اتنی خوشی ہوئی جیسے کسی نے ہفت اقلیم کی بادشاہی دے دی ہو۔

"مان لیا نا پھر ہمیں زلفی چچا" وہ اتراتے ہوئے بولیں۔

"مان لیا جی مان لیا" ان کے ہنسنے کی تیز آواز آئی۔

کچھ دیر وہ ان سے ناہید کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔

"شاید منصور آگئے خدا حافظ" کہتے ہوئے انہوں نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی طرف آگئیں۔ منصور انہیں وہیں مل گئے۔

کھانے کے بعد دونوں ڈرائینگ روم میں آگئے۔ یاسمین اصل موضوع چھیڑنے کا سوچ رہی تھیں۔ اور منصور لمبے دریچے کا پردہ ہٹاتے سگریٹ پیتے ہوئے باغ کی او نگھتی ہوئی فضا سے حظ اٹھا رہے تھے۔ یاسمین دیکھ رہی تھیں کہ آج منصور ضرورت سے زیادہ چہک رہے تھے۔ بات بات پر دل کھول کر قہقہے لگا رہے تھے۔ بڑے دنوں کے بعد انہوں نے ان کے چہرے پر اتنی جاندار بشاشت دیکھی تھی۔ آخر انہوں نے ناہید کا ذکر چھیڑ ہی دیا۔

"منصور تم نے ان کا گانا نہیں سنا۔ رات وہ بے ہوش ہی ہو گئیں۔ ورنہ میں ضرور سنواتی تمہیں" وہ ناہید کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے بولیں۔ منصور نے چاہا۔ کہہ دیں باجی میں ان کے گانے کے ہوش ربا طلسم سے آگاہ ہوں۔ لیکن چپ رہے۔ یاسمیں اٹھ کر ان کے قریب کھڑکی میں کھڑی ہو گئیں۔ منصور نے سگریٹ راکھ دان میں رکھ دیا۔

"باجی آپ ان کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے مسلے ہوئے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"ابھی تو کچھ زیادہ نہیں جانتی۔ اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ عاصم آباد کی رہنے والی ہیں۔ اور ان کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ماں باپ مر چکے ہیں" یاسمین نے جواب دیا۔

"آپ نے کیونکر کہا تھا۔ کہ وہ کسی باعظمت خاندان کی چشم و چراغ ہیں" منصور آہستگی سے بولے۔

"یہ تو میں نے محض قیافے سے کہا تھا۔"

"قیافہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ناممکن" وہ بڑے وثوق سے بولیں "گو میں اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں جانتی۔ لیکن میرا قیافہ غلط نہیں ہو گا۔ میں سب کچھ معلوم کر لوں گی۔ یہ مشکل کام تھوڑا ہی ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں باجی" منصور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ یاسمین کا دل اچھلا۔ پاس پڑی ہوئی کرسی کی پشت کے سہارے یوں کھڑی تھیں۔ جیسے اپنے آپ کو گرنے سے بچا رہی ہوں۔ ان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

"میں انہیں جانتا ہوں" منصور پھر بولے۔

"تم اسے جانتے ہو" یاسمین خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ لیکن منصور کے بجھے ہوئے لہجے سے ان کی خوشی دیرپا نہ ہو سکی۔

"وہ میرے دفتر میں ملازم ہیں" منصور نے اسی لہجے میں کہا۔ یاسمین حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگیں۔ ناہید ملازمت پیشہ لڑکی ہے۔ اپنی سماعت پر انہیں یقین نہ آیا وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جیسے کھڑے رہنا دشوار تھا۔ چند لمحے وہ ساکت صامت بیٹھی رہیں۔ منصور ان کے چہرے کا گہری نظروں سے مطالعہ کر رہے تھے۔ یاسمین کے رویئے سے انہیں روحانی اذیت ہو رہی تھی۔ اور یاسمین کو منصور کے بیان سے ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔

"وہ دنیا میں یکہ و تنہا ہیں" منصور یاسمین کو دیکھ کر تلخی سے مسکرائے "تھرڈ ایر میں پڑھ رہی تھیں۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی" اور پھر انہوں نے مختصر لفظوں میں ناہید کی روداد ان کے گوش گزار کر دی۔

یاسمین نے مضطربانہ پہلو بدلا وہ ابھی تک خاموش بیٹھی تھیں۔ منصور کی بتائی ہوئی باتوں کو جھٹلانا چاہتی تھیں لیکن زندہ حقیقت سے انحراف کیسے کرتیں۔

"تمہیں ناہید نے سب کچھ بتایا ہو گا۔" آخر وہ بولیں۔

"نہیں منصور کو ہنسی آ رہی تھی۔ یاسمین کا جوش دودھ کے ابال کی طرح ختم ہو گیا تھا۔

"تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوگئیں یہ باتیں"

"ڈاکٹر حمان نے بتایا تھا۔

"ان کا بیان مستند تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔" یاسمین کو اپنے قیافے کی شکست پر ندامت سی ہو رہی تھی۔

"میں کل خود ناہید سے مل کر سب باتیں پوچھوں گی۔"

"آپ تو انہیں پسند کر چکی ہیں۔" منصور کھڑکی کے ریشمی لہراتے ہوئے پردے کو قابو میں کرتے ہوئے بولے۔ "آپ کا صدیوں کی عظمت کا حامل خاندان اپنے دامن میں ایسی لڑکی کو پناہ دے سکتا ہے۔ جس کے خاندان کا آپ کو کوئی علم نہیں جسے اپنی روزی کمانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔"

یاسمین ایک دم کوئی جواب نہ دے سکیں۔

"ہو سکتا ہے وہ ملازمت مجبوری کی بنا پر کر رہی ہو۔ اس سے یہ ثابت تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ کہ اس کی خاندانی حیثیت کچھ بھی نہیں۔" یاسمین کی نظروں میں ناہید کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ اداس اور مغموم چہرہ۔

"میں سب کچھ معلوم کر لوں گی۔"

"تو گویا پسند کو مسترد بھی کیا جا سکتا ہے۔" منصور بے تاب ہو کر بول اٹھے پردہ انہوں نے سختی سے پکڑ رکھا تھا۔

"کیا مطلب" وہ چیں بچیں ہو کر بولیں۔

"آپ ان کے بارے میں جاننے کی خواہش مند ہیں۔ بالفرض وہ آپ کے قائم کردہ معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس صورت میں آپ کا عملی قدم کہاں پڑے گا باجی۔"

منصور نے کچھ اس مایوسی سے کہا۔ کہ یاسمین تڑپ اٹھیں۔ ناہید جو بھی تھی۔ جیسی بھی تھی۔ وہ اسے قبول کر چکی تھیں۔ اس کے غیر تسلی بخش حالات سن کر ان کے قدم ڈگمگائے ضرور تھے۔ لیکن دل اس کا فریفتہ ہو چکا تھا۔ اور کچھ اپنے الفاظ کا پاس تھا۔ وہ کرسی سے اٹھیں۔ منصور کے قریب آ کر غور سے ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"تمہارا ناہید کے متعلق کیا خیال ہے منصور۔"

انہوں نے چاہا۔ کہ دل چیر کر یاسمین کو دکھا دیں۔ ناہید ان کے تخیلات کی پرواز تھی۔ ان کے افکار کی بلندی تھی۔ ان کی روح کی لطافت تھی۔ ان کی زندگی بن چکی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے ان کے متعلق۔" منصور نے الٹا انہیں سے پوچھا۔

"میں" یاسمین بولیں۔ "میں تو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں منصور۔ جانے کیوں۔ پہلی نظر ہی میں وہ مجھے اتنی پسند آ گئی۔ جیسے وہ میری اپنی بہن ہو۔"

منصور کا چہرہ چمک اٹھا۔ آنکھیں جوش مسرت سے کچھ سرخ ہو گئیں۔

"باجی" ۔ وہ چہکے۔ "شکر ہے میری اور آپ کی پسند کی ٹکر نہیں ہوئی۔ ورنہ جانے کیا ہوتا۔"

پھانس کے نکل جانے پر چبھن تو نہیں رہتی کسک ضرور رہتی ہے۔ یاسمین کو بھی ناہید کے خاندانی حالات

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معلوم کر کے کچھ ایسی ہی کسک ہو رہی تھی۔ لیکن ناہید کو وہ دل و جان سے پسند کر چکی تھیں۔ اور جب انہیں پتہ چلا کہ منصور بھی اس کے گھائل ہیں تو وہ دونوں کو شادی کے بندھنوں میں جکڑنے پر رضامند ہو گئیں۔ لیکن کوئی رسمی کارروائی کرنے سے پہلے ہی انہیں واپس جانا پڑا۔ اور اپنی دوبارہ آمد تک اس فرض سے سبکدوش ہونے کو ملتوی کرنا پڑا۔ زلفی بھی ایک ماہ کا دورہ ختم کر کے واپس ہو گئے۔

منصور کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ خاندانی جاہ و حشم کی سنگلاخ چٹانیں پگھل گئی تھیں۔ معاشرے کی کھڑی کی ہوئی دیواریں موم ہو گئی تھیں۔ راستہ ہموار تھا۔ اور منزل قریب دکھائی دے رہی تھی۔ اتنی قریب کہ وہ جب چاہتے ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتے تھے۔ وہ شاداں و خراماں بڑھتے گئے۔ ناہید اور ان کے ملاپ کے مسدود راستے کھل چکے تھے۔ ان کی زندگی میں بہاریں جنم لے رہی تھیں۔

بہاریں جاودانی نہیں ہوتیں۔ خزائیں انہیں روندہی جاتی ہیں۔ پھر بھی جانے کیوں پگلا خود فریب انسان جاودانی بہاروں ہی کا متمنی رہتا ہے۔

منصور کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے پیرس گئے تھے۔ ان کا دورہ دو ہفتے کا تھا۔ ناہید اپنے کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کہ یہ پندرہ طویل دن کیسے گذریں گے۔ دفتر کی خشک زندگی کا اسے آج پہلی دفعہ تجربہ ہوا تھا۔ فائل کھلے پڑے تھے اور کاغذات بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے کاغذات تہہ کئے۔ فائل بند کر کے دراز میں رکھے۔ اس سے دفتر میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ گھر جانا چاہتی تھی۔ اس ارادے سے اٹھی۔ کہ شمو نے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت مانگی۔

"آجاؤ۔" وہ میز کے پاس کھڑی تھی۔ شمو نے بڑے ادب سے ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کس نے دیا۔" وہ لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"سرکار دے گئے تھے۔" شمو منصور کا ذاتی ملازم تھا۔

"کب دیا۔"

"جانے سے پہلے۔"

"اور تم اب لائے ہو۔"

"سرکار نے کہا تھا۔"

ناہید چند لمحے حیرت سے کبھی لفافے کو اور کبھی شمو کو دیکھتی رہی۔

"جاؤ۔" شمو چلا گیا۔ لفافہ ہاتھ میں لئے وہ سوچتی رہی۔ کہ اس میں کیا لکھا ہو گا۔ منصور صبح جانے سے پہلے کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ اس لفافے کے متعلق تو انہوں نے کچھ اشارہ بھی نہ کیا تھا۔

جانے کیوں وہ ایک دم لفافہ نہ کھول سکی۔ لفافہ بٹوے میں رکھ لیا اور اعجاز کے کمرے میں آ گئی۔

"اعجاز صاحب میں گھر جا رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ اعجاز اسے شوق بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی چبھتی ہوئی نظروں سے بچنے کے لئے وہ جلدی سے واپس مڑی۔ "شاید میں کل بھی نہ آؤں۔" کہتے ہوئے وہ پردہ اٹھا کر باہر آ گئی۔ اعجاز دیکھتا ہی رہ گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے لفافہ کھولا۔ منصور کا خط تھا۔ وہ خط پڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ کبھی اس کا منہ سرخ ہو جاتا۔ اور کبھی زردی کھنڈ جاتی۔ پلنگ کے تکئے کے سہارے کھڑی وہ خط پڑھ رہی تھی۔ اس نے یہ مختصر سا خط کئی دفعہ پڑھا۔ اور ہر دفعہ اس طرح پڑھا جیسے پچھلی دفعہ عبارت سمجھ میں نہ آئی ہو۔

گو خط کی تحریر بڑی شستہ اور مختصر تھی۔ لیکن ایک ایک لفظ میں کئی جہاں آباد تھے۔ کئی دنیائیں بس رہی تھیں۔ امنگوں اور آرزوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے بڑی تمنا سے بڑی چاہت سے انہوں نے شادی کی پیشکش کی تھی۔

"کیا امید رکھوں کہ واپسی پر ہماری امیدیں مسرت بکنار ہوں گی۔" خط کے خاتمے پر انہوں نے بڑے ارمان سے لکھا تھا۔

شادی۔

تشنہ امنگوں کی سیرابی۔ تکمیل انسانی۔ دو روحوں کا حسین ملاپ۔ ربط باہم کی ابدیت۔ لیکن ناہید خط پڑھ کر مسرور نہ ہو سکی۔ وہ اس وقت کچھ سوچ نہ سکی...... اس کا دماغ جیسے جم گیا تھا۔ منصور کا طیارہ فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ اور ناہید کے دماغ پر ایک ہی خیال غالب آ رہا تھا۔ کہ وہ اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور وقت انہیں اور دور لے جا رہا ہے۔

لفافے کو مٹھی میں لئے وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ منصور کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اور مسلسل کئی دنوں سے وہ ایک ہی بات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک ہی مسئلہ تھا۔ جو دقیق سے دقیق تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہر وقت کی سوچ نے اسے چڑچڑا سا بنا دیا تھا۔ وہ امید و بیم کے بھنوروں میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ شادمانیوں اور ناکامیوں کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف سہانا مستقبل تھا۔ اور دوسری طرف گھناؤنا ماضی۔ جو دن بدن پھیلتا جا رہا تھا۔ اور اس کے پھیلاؤ میں اس کا حال اور مستقبل آتے جا رہے تھے۔

منصور کے بغیر زندگی تاریک غاروں میں چنگھاڑنے والے بھوتوں کے آگے ڈال دینے کے مترادف تھی۔ لیکن وہ ایک رنڈی کی لڑکی تھی۔ ایک بیسوا کی اولاد تھی۔ رنڈی جو سماج کے سینے کا گہرا گھاؤ ہے۔ بیسوا جو اس کی چھاتی کا رستہ ہوا ناسور ہے۔ کیا منصور اس گھاؤ کے فاسد مادے کو قبول کر لیں گے۔ اس رستے ہوئے ناسور کے مواد کو اپنا سکیں گے۔ بہ رضا و رغبت قبول کر لیں گے۔ نہیں...... ان کے دل میں ارض و سما کی وسعتیں سما

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جائیں۔ ان کے نظریات میں فلک کی بلندیاں سمو جائیں۔ پھر بھی وہ ایک رنڈی کی لڑکی کو نہ اپنا سکیں گے۔ وہ جانے اسے کیا سمجھ رہے ہیں۔ اس کی اصلیت سے آگاہ ہوتے ہی وہ کراہت سے منہ پھیر لیں گے۔ ان کی محبت دودھ کے ابال کی طرح ختم ہو جائے گی۔ یہ خیال سوہان روح تھا۔ وہ منصور کا تنفر کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔ جن نظروں میں وہ حوروں کا تقدس پا چکی تھی۔ ان سے گرنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ انکار کر دے گی۔ وہ اپنے بارے میں منصور کو کچھ نہ بتائے گی۔ یہ اس کی تفحیک تھی تذلیل تھی۔ جو اسے گوارہ نہ تھی۔ انکار......اس خیال سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ لفافہ ابھی تک اپنی تقدیر کی طرح اس کی مٹھی میں تھا۔

دینے والے نے تو اسے کچھ اس فیاضی سے دینا چاہا تھا۔ کہ اسے شکوہ کرنا ہی داماں ہو جاتا۔ لیکن اس کے دامن کی فرسودگی اتنی وزنی دین کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے اپنا دامن پھیلانے کی بجائے سمیٹ لے۔ یہی وہ کر سکتی تھی۔ یہی مناسب تھا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ کوئی مضطرب حرکت نہ کر رہی تھی۔ لیکن اس خاموشی میں ہزاروں طوفان تھے۔ کالی کالی خوف ناک آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔

اس کا ماضی مرا نہیں تھا۔ اک خوفناک بدروح بن کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔ خونخوار بدروح۔ جو اس کے مستقبل کو کھا گئی۔ اس کی ساری مسرتوں کو ہڑپ کر گئی۔ اس کے راستے میں سماج کی چنی ہوئی دیواریں حائل نہ تھیں معاشرے کی لگائی ہوئی قیود نہ تھیں۔ طبقاتی خلیجیں راستہ روکے ہوئے نہیں تھیں۔ لیسے تو اس کے ماضی نے مارا تھا۔ ماضی جس سے بدبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ تعفن آ رہی تھی۔

منصور کا پندرہ روزہ دورہ ختم ہو گیا۔ وہ زلفی کے پاس بھی دو دن کے لئے گئے تھے۔ زلفی نے یاسمین کے بچوں کے لئے کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔ منصور خود بھی بچوں کے لئے بیش قیمت تحائف لائے تھے۔ اس لئے وہ سیدھے ناظم پور ہی اترے۔

بچے ان کی آمد پر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ان کے لئے خوبصورت کھلونے لائے تھے۔ سمیرا اور فریدوں چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ یاسمین بڑے فخر سے ساری چیزیں اپنی ساس کو دکھا رہی تھیں۔ ماس ہر چیز کے ساتھ لمبی چوڑی دعائیں دے رہی تھیں۔ وہ ان کے رشتہ کی پھوپھی تھیں۔ لیکن انہیں اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھیں۔

"وہ بھی دکھائیں نا ماموں حضور۔" سمیرا ان کے کپڑوں کی تہہ میں پڑی ہوئی چھوٹی سی سفید ڈبیہ کے لئے مچلی۔

"وہ کچھ نہیں۔" منصور نے جلدی سے ڈبیہ کپڑوں کے نیچے کر دی۔

ڈبی میں پلاٹینم کی بڑے سے ہیرے والی خوبصورت انگوٹھی تھی سفید انگوٹھی ان کی امیدوں کی طرح چمک

رہی تھی۔

فریدوں بھی سمیرا کے ساتھ وہ ڈبی ڈھونڈنے لگا یاسمین نے بچوں کو جھڑکا۔ وہ سہم گئے۔ آخر بڑی مشکل سے منصور نے بچوں کو بہلایا پھسلایا۔ انہوں نے انگوٹھی یاسمین کو بھی نہ دکھائی تھی۔ وہ یہ تحفہ ناہید کے لئے لائے تھے۔ اپنی منگنی کی نشانی کے طور پر اس کی سفید سفید نرم و گداز انگلی میں پہنانے کے کیف آگیں تصور سے جھوم رہے تھے۔

شام کو انہوں نے سلطان پور جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یاسمین۔ نواب صدیق اور ان کی والدہ سبھی ان کے پیچھے پڑ گئے وہ جتنا جلدی وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ یہاں اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ آخر سب کے اصرار پر انہیں رکنا ہی پڑا۔ صبح پر روانگی ملتوی کر دی۔

رات کو فریدوں اور سمیرا ان سے بڑے مزے مزے کی باتیں سن رہے تھے دونوں بچے ان کے بستر ہی میں آگھسے تھے۔ منصور کے لئے وقت گزارنے کا یہی بہترین مشغلہ تھا۔ وہ بچوں کو اپنے سفر اور پیرس کے دوران قیام کی دلچسپ باتیں سنا رہے تھے۔

"ماموں حضور" فریدوں اکتا کر بولا۔ "پریوں کی کہانی سنایئے۔"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا فریدوں۔" سمیرا نے تائید کی۔

اور منصور کو ناہید کی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ فریدوں نے اسے پریوں کی شہزادی کہا تھا۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ اور وہ اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔

"سنایئے نا۔" بچے بولے۔

"کیا۔"

"پریوں کی کہانی۔"

"فریدوں تم نے ایک دفعہ ہمارے ہاں پریوں کی شہزادی دیکھی تھی نا۔"

"کہاں ماموں حضور۔" فریدوں کے ذہن سے بات نکل گئی تھی۔ منصور نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں ہاں۔" وہ کچھ یاد آتے ہی چلایا۔ "دیکھی تھی۔"

"جھوٹ" سمیرا نے اس کی بات جھٹلانے کی کوشش کی۔

"ماموں حضور میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے۔"

"نہیں بھئی سمیرا۔ فریدوں نے جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے پریوں کی شہزادی دیکھی تھی۔"

"بس۔" فریدوں نے سمیرا کا منہ چڑایا۔

"بس لڑو نہیں۔" منصور نے انہیں پیار سے ڈانٹا۔ "ہاں تو فریدوں اگر ہم اس پریوں کی شہزادی کو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اپنے گھر لے آئیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

فریدوں حیرانگی سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"لیکن ماموں حضور۔" سمیرا بولی۔ "پریوں کی شہزادیاں تو جنوں کے دیس میں رہتی ہیں۔ گھروں میں کہاں رہ سکتی ہیں۔" سمیرا نے اپنی دانست میں بڑی عاقلانہ دلیل دی تھی۔ منصور کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چبھو دی۔

"نہیں سمیرا۔ جب کوئی شہزادہ جاتا ہے۔ تو انہیں جنوں کے پنجے سے چھڑا لاتا ہے۔ پھر وہ گھروں میں ہی رہنے لگتی ہیں۔"

سمیرا کو ان کی باتوں پر جیسے یقین نہ آیا۔ وہ بے اعتباری سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ فریدوں اونگھنے لگا تھا۔ اور منصور کا دل بلاوجہ اضطراب سے گھبرا رہا تھا۔

ناہید نے چاہا۔ کہ منصور کے خط کا جواب لکھ کر بھیج دے۔ انکار...... اپنی نارضامندی کا اظہار لکھ کر دے۔ لیکن جب بھی قلم اٹھایا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ قلم سے کاغذ پر لکھنا نہیں چاہتی۔ بلکہ کسی بے گناہ کی گردن پر چھری چلانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ کئی دفعہ کی کوشش جب ناکام ہوئی تو اس نے لکھ کر انکار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

منصور آ گئے۔ وہ آمنا سامنا کرتے ہوئے گھبرائی۔ لیکن انہوں نے اس خط کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ ناہید کو کچھ حوصلہ ہوا۔ لیکن معاملہ کب تک التوا میں ڈالا جا سکتا تھا۔

منصور کو آئے دوسرا دن تھا۔ پہلے دن کی طرح یہ دوسرا دن بھی بخریت گذر گیا تھا۔ صرف ایک دفعہ منصور نے ناہید سے پوچھا تھا۔

"آج شام کو آپ کہیں جا تو نہیں رہیں۔"

"نہیں۔" اس نے ان کے سوال کی نوعیت کو سمجھے بغیر جواب دیا تھا۔

اور اب شام کی چائے پینے کے بعد اپنے کمرے کے سامنے بر آمدے میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز اسی سوال پر غور کر رہی تھی۔ موسم بے حد رنگین تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تیز ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر گہرے گہرے بادل فیل مست کی طرح جھومتے چلے آ رہے تھے۔ دور کسی نگر پر بجلی چمک رہی تھی۔ بادل پھیلتے جا رہے تھے۔ اور ان کے سینے میں بجلیاں کہیں گرنے کو تڑپ رہی تھیں۔ فضا رومان انگیز تھی۔ وہ اس وقت سرمئی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ قمیض کے سرمئی رنگ پر سرخ سرخ پھول تھے۔ جو موسم کی مناسبت سے بڑے بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ بالوں کو نیم دائرے کی شکل کے جوڑے میں باندھ کر سرخ ربن ڈالا ہوا تھا۔ اس کی سفید براق گردن پر یہ جوڑا بے حد بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ ملازمہ چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔

چھوٹی سی میز پر کین کی خوب صورت ٹوکری میں سلائی کی چیزیں پڑی تھیں۔ ساتھ والی بڑی میز پر اخبار کھلا پڑا تھا۔ لیکن وہ کسی طرف دھیان دیئے بغیر خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

چوکیدار کی آواز نے اس کے خیالات کو درہم برہم کر دیا۔

"کیا سینو۔" اس نے پوچھا۔

"نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔"

"چوکیدار کے الفاظ پر وہ اچھل پڑی۔

"کون" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"سرکار۔" چوکیدار نے سامنے گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... "آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ناہید نے گردن گھما کر دیکھا۔ منصور اپنی شاندار رولس رائس کے پاس کھڑے تھے۔ ایک پاؤں پائیدان پر رکھے وہ ہوا میں کوئی چیز اچھال رہے تھے۔ گرے پتلون اور سفید بش شرٹ پہنے تھے۔ اور ان کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

"مجھے بلایا ہے۔" اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں۔"

منصور سامنے کھڑے تھے۔ ناہید کوئی بہانہ بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ اٹھی...... اور اک باوقار چال چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔ منصور نے اسے آتے دیکھ کر چھوٹی سی ڈبیہ پتلون کی جیب میں ڈال دی۔ مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔ چشمہ اتار کر سیٹ پر رکھ دیا۔ ان کی آنکھوں میں خمار انگڑائیاں لے رہا تھا۔ مستیاں جھوم رہی تھیں۔ بڑھ کر انہوں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ناہید کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ باہر کھڑی رہی۔

منصور نے "آیئے بھی۔" التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ناہید اس "آیئے بھی" کی نوعیت کو سمجھ گئی۔ منصور سامنے کھڑے تھے۔ اس کا جی چاہا۔ بھاگ جائے۔ اس کا ٹھوس ارادہ انہیں دیکھ کر متزلزل ہونے لگا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ کہ اس کا انکار صرف اس پر ہی نہیں بلکہ منصور پر بھی اک ناروا ظلم ہو گا۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری کام ہے۔" ان کی نگاہوں میں بجلیوں کی کوند تھی۔ جس نے ناہید کا خرمن صبر و قرار بھسم کر ڈالا۔ وہ کبھی بھی انکار نہ کر سکے گی۔ وہ اپنی زندگی کی بہاروں کو خزاں بن کر کبھی کچل نہ سکے گی۔ اس کا جی چاہا۔ اپنے ماضی کو منصور سے اسی طرح چھپائے رکھے۔ جس طرح ابھی تک ان کی نظروں سے مستور تھا۔ اسے یہاں کون جانتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ضمیر دل کی اس جھوٹی آواز پر ملامت کر رہا تھا۔ دھوکہ اور وہ بھی منصور سے دھوکہ اس خیال ہی سے وہ کانپ گئی۔ تو پھر...... پھر اسے چلا جانا چاہئے۔ ان کے ساتھ۔ وہ اپنے خط کا جواب مانگیں گے۔ وہ انکار کر دے گی...... بلاوجہ انکار کر دے گی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معاملہ التوا میں نہ ڈالا جاسکتا تھا۔ جتنی جلدی فیصلہ ہو جائے بہتر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنی ہمت ٹوٹتی نظر آئی۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور وہ بارادہ یا بلاارادہ موٹر کی سپرنگ دار سیٹ میں دھنس سی گئی۔ اس کے اور منصور کے درمیان صرف سیاہ چشمہ اور ایک قیمتی کیمرہ پڑا تھا۔

شاندار موٹر بڑی تیزی سے صاف و شفاف سڑک پر پھسلتی چلی جارہی تھی۔ منصور آنے والے دور کے کیف و سرور سے جھوم سے رہے تھے۔ اور ناہید سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ اور ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ اور منصور بار بار اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت تو خراب نہیں۔" انہوں نے اس کی سنجیدگی سے متاثر ہو کر پوچھا......

"نہیں۔" مختصر سا جواب دے کر وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

"کہیں پھر بے ہوش ہونے کا پروگرام تو نہیں بن رہا۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ ناہید کسمسا کر رہ گئی۔

ہوا تیز ہوتی جارہی تھی۔ اور افق کے سینے سے کالے کالے بادل دھوئیں کی طرح اٹھ رہے تھے۔ جو بڑھتے جارہے تھے، پھیلتے جارہے تھے۔ اور ان کالے کالے گہرے گہرے بادلوں میں بجلیاں کہیں گرنے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ منصور نے دو چار بار قریب بیٹھی ہوئی ناہید سے بات چیت کرنا چاہی۔ لیکن اس نے ہر بات کا اختصار سے جواب دے کر بات کی طوالت کو ختم کر دیا۔

"آپ جا کہاں رہے ہیں۔" ناہید نے سنسان سڑک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر موٹر بھاگی جارہی تھی۔

"جہاں سے واپس آنے کی تمنا نہ کی جاسکے۔" منصور نے شوخ سنجیدگی سے جواب دیا۔ منصور کے اس بے ساختہ جواب سے اس کی روح تھرا اٹھی۔ وہ نہ تو ان کی طرف دیکھ سکی۔ نہ ہی کوئی لفظ منہ سے نکال سکی۔ منصور نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کی خاموشی کو اس کے شرم و حیا پر محمول کرنا چاہا۔ لیکن نہ تو اس کے چہرے پر شرم کی سرخیاں لہرا رہی تھیں۔ نہ ہی کسی لطیف احساس کی چھیڑ چھاڑ تھی۔ وہاں تو اک ویران چپ تھی۔ اک دہشت زدہ خاموشی تھی۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ یوں بیٹھی تھی جیسے کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہی ہو۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ منصور کچھ بجھ سے گئے۔

"واپس چلئے۔" ناہید نے مضطربانہ ان کی طرف دیکھا۔

"اگر میں انکار کر دوں تو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرائے۔ ناہید نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔

موٹر اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ سڑک سنسان تھی۔ فضا رومان انگیز تھی۔ سلطان پور کا حسن اپنے جوبن پر

تھا۔ سڑک کے ایک طرف سبز گل پوش پہاڑیوں کے لامتناہی سلسلے تھے۔ اور دوسری طرف سبز سبز گھاس کے قدرتی فرش سے مزین میدان۔ دور چاندی کی لکیر کی طرح سطلیج چمک رہا تھا۔

"واپس چلئے نا۔" ناہید نے پھر کہا۔ موٹر اک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ منصور اترے اور بڑھ کر اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

"تشریف لے جائیے۔" وہ سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے بولے...... ان کی آنکھوں میں معصوم شرارت کی چمک تھی۔ ناہید نے حیرانگی سے پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ وہ موٹر کا کھلا ہوا دروازہ پکڑے کھڑے تھے۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟ اب آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔" وہ قدرے جھک کر اسے مخاطب کر رہے تھے۔

"کہاں جاؤں۔" وہ حیرت زدہ سی بولی۔

"یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں آپ نے واپس جانے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں آپ کو روکتا نہیں۔"

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولے۔ ناہید کا پریشان حسین چہرہ ان کے جذبات میں تلاطم برپا کر رہا تھا۔

"میں...... اکیلی کیسے جاؤں۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

"میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" وہ ناہید کی بات پر بے ساختہ ہنس دیئے۔ "واپس جانا ہے۔ تو اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ اور اگر میرا ساتھ چاہتی ہیں...... تو میں۔" وہ قدرے توقف کے بعد بڑی ہی سنجیدگی سے بولے۔ "میں تو بڑھتا ہی جاؤں گا پلٹوں گا نہیں۔"

ناہید کے پاس اب کوئی جواب نہ تھا۔ منصور نے دروازہ بند کر دیا۔ اور اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ اس نے ان کی شرارت پر کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ ہی داد دیتی نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔ وہ تو اپنی انگلیوں کو مسلے جارہی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی۔ کہ منصور کی اتنی جوان جوان امنگوں کا۔ اتنی تومند مسرتوں کا ان کمزور انگلیوں سے گلا بھی گھونٹ سکے گی یا نہیں۔

منصور نے اسے غور سے دیکھا۔ ان کی خوشیوں کے دل ڈوبنے لگے۔ ان کی مستیوں کو اونگھ سی آنے لگی۔ ان کا دل بجھ گیا۔ اور جب وہ ناہید کے ساتھ سلطان پور کی سب سے حسین جگہ پر پہنچے جہاں گھنے درختوں کے دامن تلے دریائے سطلیج نغمے گنگناتا ہوا کی لہروں سے بل کھاتا رینگتا چلا جارہا تھا۔ تو ان کی طبیعت کی ساری جولانی۔ ساری شوخی کافور ہو چکی تھی۔ کسی آنے والے خطرے سے ان کا دل مضطرب ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

ناہید ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی دریا کی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ جن میں ہوا کے زور سے تلاطم پیدا ہو رہا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ وہ اس پتھر کی طرح ہی کچھ بے حس سی بیٹھی ہوئی تھی۔ منصور اس کے سامنے کھڑے درخت کی جھولتی ہوئی شاخوں سے سبز سبز پتیاں نوچ رہے تھے۔

"واپس چلئے۔" ناہید نے منصور کی طرف نگاہ اٹھائی۔ جو بڑی محویت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا۔" انہوں نے ناہید کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

ناہید کوئی جواب نہ دے سکی۔ اسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ عالم نزع میں ہو۔

"میرا خط ملا تھا۔" انہوں نے پھر پوچھا۔

"جی۔" وہ بمشکل کہہ سکی۔ منصور کی گرفت درخت کی لچکیلی شاخوں پر اور سخت ہو گئی۔ ناہید کا عزم ایک بار پھر ڈگمگایا۔ اس کا دل چاہا۔ کہ منصور کی پیشکش کو قبول کر لے۔ ان کے بغیر وہ شاید ایک سانس بھی نہ لے سکے گی۔ لیکن دماغ نے اپنی استدلال پیش کر دیں۔ دل اور دماغ اس طرح الجھے ہوئے تھے۔ جس طرح نزع کے وقت موت وحیات۔

"کیا فیصلہ کیا آپ نے۔" انہوں نے بڑی بے دلی سے پوچھا۔ ناہید خاموش تھی۔ اور اس کی خاموشی سے جواب اخذ کرنا کچھ مشکل نہ رہا تھا۔

"میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں۔ حلق میں کانٹے پڑے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" منصور کو اپنی ناکامی کا یقین ہو چلا تھا۔ ان کے چہرے پر بھوری بھوری چٹانوں کی سختی ابھر رہی تھی۔ ناہید بے جان مورتی کی طرح کھڑی تھی۔

"ناہید" منصور نے اس کے قریب آتے ہوئے بڑی اپنائیت سے اسے پکارا۔ ان کی آنکھوں میں اجڑے دیار کی ویرانیاں تھیں۔ چہرے پر نامعلوم سی زردی پھیل گئی تھی۔ "میں نے اب تک جو کچھ سمجھا وہ غلط تھا کیا۔"

"آپ غلطی بھی تو کھا سکتے ہیں۔" ناہید نے بڑی ہمت سے جواب دیا۔ لیکن اس کی آواز کانپ گئی۔

"کیا...... کیا......" وہ کچھ نہ سوچ سکے۔ الفاظ ان کے گلے میں اٹک گئے اپنے خالی ہاتھوں کو بے چینی سے ملتے ہوئے وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ناہید سے کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹ تک سفید پڑ چکے تھے۔ سڑک پر کھڑی ہوئی موٹر کی طرف جانے کے ارادے سے قدم اٹھائے۔ منصور کچھ دیوانگی کے انداز میں اس کی طرف بڑھے۔ اسے سختی سے شانوں سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف گھما لیا۔

"آپ نے انکار کر دیا۔" وہ جانی ہوئی بات کو جاننے کے لئے کہہ رہے تھے۔

ناہید کی خاموشی میں طوفانوں کی ہلچل تھی۔

"آپ بولتی کیوں نہیں۔ جواب دیجئے۔" منصور نے اسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو میری تجویز سے اختلاف ہے۔"

"جی۔" جانے کیسے اس کے لبوں سے آواز نکلی۔ اور اس "جی" نے منصور کی تمام رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ ان کے ہاتھ ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح اس کے شانوں پر سے گر گئے۔ ناہید تیز قدم اٹھاتی ہوئی موٹر کی طرف چل دی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ دماغ سنسنا رہا تھا۔ اس نے جیتی جاگتی زندگی کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔

منصور چند لمحے وہیں کھڑے رہے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہو گیا ہے بادل زور سے گرجا۔ بجلی بے تابی سے تڑپی اور منصور تیزی سے بڑھے۔ ناہید کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں ہاتھ گرے پتلون کی جیبوں میں ڈالے تھے۔ پلاٹینم کی انگوٹھی کی چھوٹی سی ڈبی جیب میں پڑی ہوئی ہاتھ کو بچھو کی طرح ڈنک مار رہی تھی۔

"میں اس انکار کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" انہوں نے اک طویل لمبی سانس لی۔ اور بے چین آہ نے ان کے ہونٹوں پر دم توڑ دیا۔

ناہید کے قدموں میں پھر آزمائش لپٹ رہی تھی۔ لیکن اس نے اسے سختی سے جھٹک دیا۔ وہ بظاہر بڑے مطمئن انداز میں بولی۔

"ایسا سوال کرنے کا نہ آپ کو کوئی حق ہے۔ اور نہ میں جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔"

یہ ناہید کے الفاظ نہ تھے۔ گرم گرم ریت تھی۔ جو منصور کی آنکھوں میں ڈال دی گئی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کہیں قریب ہی بم پھٹا ہو۔ اور ان کا دل و دماغ اس سے مجروح ہو گئے ہوں۔ ان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ ریزے ریزے ہو گئے ہوں۔ اس وقت منصور کو دل و دماغ کے ان زخموں سے بہتا ہوا چمکیلا خون نظر آ رہا تھا۔ سرخ سرخ گرم گرم خون۔ جوان جوان امنگوں کا خون تھا جو پھیلتا جا رہا تھا۔ سبز سبز گھاس پر ہرے بھرے درختوں پر۔ لہراتی بل کھاتی دریائے سطیر کی لہروں پر۔ سیاہ بادلوں کے تاریک سینے پر انہیں اس خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے موٹر کی جانب بڑھے۔ انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ننگے پاؤں نوکیلے کانٹوں پر چل رہے ہوں۔ قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ ناہید موٹر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ منصور نے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

آج تک منصور کے ساتھ جتنی بار بھی ناہید کو آنے جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہمیشہ انہوں نے اس کے لئے اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر ہی جگہ دی تھی۔ آج پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ کہ یہی اس کی صحیح جگہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اب تک وہ غلط جگہ پر بیٹھتی چلی آئی تھی۔ لیکن جانے کیوں اسے اس بات کا بڑا دکھ ہوا تھا۔ اس کا زخمی دل تڑپ اٹھا تھا۔ وہ اپنے دوپٹے کے کونے کو دانتوں تلے دبائے بیٹھی تھی۔ کہ کہیں سینے میں تڑپتے ہوئے جذبات چیخ بن کر نہ نکل جائیں۔ منصور سٹیرنگ پر جھکے ہوئے بڑی تیزی سے موٹر چلا رہے تھے۔ دونوں قریب تھے۔ لیکن ان کے درمیان جیسے صدیوں کا فاصلہ آچکا تھا۔

گیٹ کے باہر اترتے وقت ناہید نے آخری نگاہ منصور پر ڈالی۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور چہرے پر کچھ زردی سی پھیل گئی تھی۔ ناہید کانپ گئی۔ بھکے بھکے قدم اٹھاتی جانے وہ کس طرح اپنے پلنگ تک پہنچ گئی۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ اور وہ اسی انداز سے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری خوشیاں۔ ساری تمنائیں۔ ساری آرزوئیں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہی تھیں۔ اور آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے ظلم کی شدت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ کوئی تقدیر کی بھول نہ تھی۔ اس نے تو کند چھری سے ان جیتی جاگتی خوشیوں کا گلا خود کاٹا تھا۔ اس نے پانی کے ہوتے ہوئے اپنی امنگوں کو ترسا ترسا کر مارا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ دماغ میں اک قیامت مچی ہوئی تھی۔ ذہن میں شور اٹھ رہا تھا۔ جیسے کہیں ماتم ہو رہا ہو۔ کسی جواں مرگ کی میت پر سینہ کوبی ہو رہی ہو۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور بستر پر گر گئی۔ خشک آنکھیں تر ہو گئیں۔ اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیگ گیا۔

وہ دیر تک روتی رہی۔ آج سب سے زیادہ غصہ اسے اپنی ماں پر آرہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ اس کی نعش قبر سے اکھاڑ لائے۔ اور اس سے پوچھے۔ کہ تو ماں ہے یا ڈائین۔ تو نے مجھے جنم کیوں دیا تھا۔ پیدا ہوتے ہی گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ حلق میں زہر کیوں نہ ٹپکا دیا تھا۔ تم نے سب کچھ جانتے ہوئے اسے زندہ رکھ کر کیوں ظلم کیا تھا۔ اسے ایسے معلوم ہوا جیسے اس کی ماں سچ مچ اس کے سامنے کھڑی ہو۔

"ماں" اس نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا۔ "تو بڑی ظالم ہے ماں۔ تو نے تانبے کی سرخی کو ملمع سے چھپانا چاہا۔ لیکن یہ نہ دیکھا کہ ملمع تانبے پر کتنی دیر ٹھہر سکے گا۔ تو طوائف تھی۔ اپنی بیٹی کو شرافت کے لبادے میں چھپا دیا۔ لیکن یہ لبادہ کب تک اوڑھا جا سکتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا۔ تو نے کیچڑ پر اس خیال سے سفید چادر ڈال دی۔ کہ کیچڑ نظر نہ آئے اتنا بھی نہ خیال کیا۔ کہ اجلی اجلی چادر پر کیچڑ کے نمایاں دھبے کتنے برے معلوم ہوں گے۔ چھپائے نہ چھپ سکیں گے۔ ماں تو جب تک زندہ تھی۔ میرے لئے اک جیتا جاگتا عذاب تھی۔ مر کر بھی تو نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ تو میری خوشیوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئی۔"

آنسو اب بھی روانی کے ساتھ اس کی خوب صورت آنکھوں سے بہہ رہے تھے اس کا تکیہ بھیگ چکا تھا۔ اس کی روح جذبات کے شکنجے پر چڑھی ہوئی تھی۔ منصور کے بغیر زندگی ویران تھی۔ اجیرن تھی۔ یہی سوچ سوچ کر

اس کا دماغ تپ رہا تھا۔

اسے ماں کی شادی کا قصہ فرضی معلوم ہونے لگا۔ فیروز کے جملے کانوں میں گونجنے لگے۔

"تو رنڈی کی لڑکی ہے۔ تو گناہ کی تخلیق ہے۔"

ماں نے واقعی اک کہانی گھڑی تھی۔ اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے۔ اس کی ذہنی تسکین کے لئے۔ اس کا کوئی باپ نہیں تھا۔ اس کی ماں رنڈی تھی۔ اور وہ اس رنڈی کے گناہ کا ثمر۔ سوچتے سوچتے وہ رونے کو بھول گئی۔ اور اسے کچھ یونہی سا صبر آگیا جو میت کے اٹھ جانے کے بعد پسماندگان کو آجاتا ہے۔

...........○...........

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۱۱

"کیوں تنگ کرتے ہو شمو"۔ منصور نحیف آواز میں بولے۔ وہ آنکھیں بند کئے۔ مسہری پر چت پڑے تھے۔

"سرکار" شمو ڈرتے ڈرتے بولا "جوتوں کے تسمے کھول رہا ہوں"۔

وہ مسہری پر بوٹوں سمیت پڑے تھے۔ بڑی حیرانگی سے انہوں نے پہلے شمو کو اور پھر اپنے پیروں کو دیکھا۔

"شمو میں سو گیا تھا کیا"۔ وہ آہستگی سے بولے۔

"شاید سوئے ہوئے ہی تھے سرکار"۔ وہ مودبانہ بولا" گھنٹہ بھر سے آپ کو یونہی پڑے دیکھا میں نے سمجھا۔ آپ سوئے ہوئے ہیں۔ سرکار اس لئے جوتے نہ اتارے کہ کہیں نیند خراب نہ ہو"۔

منصور کو جیسے کوئی ڈراؤنا خواب یاد آ گیا ہو۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا چھا رہا تھا۔ بادل برس کر مطلع صاف ہو چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے خنکی بڑھ گئی۔ بھیگی ہوئی ہوائیں۔ کچھ معطر سی تھیں۔ منصور نے کروٹ بدلنا چاہی۔ سارا جسم شل تھا۔ انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اور ٹھنڈک کے باوجود سارے کپڑے پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ انہیں اتنا یاد تھا۔ کہ ناہید کو گھر پہنچانے کے بعد وہ قصر رعنا کے پورچ میں کار ٹھہرا کر اندر آئے تھے۔ مسہری پر کس وقت گرے۔ یہ انہیں ہوش نہ تھا۔

"میں سویا ہوا تھا شمو"۔ انہوں نے شمو کو گھور کر دیکھا۔ شمو سہم کر کھڑا ہو گیا۔

"شائد سرکار"۔

"شاید کیا۔ بتاتا کیوں نہیں"۔ وہ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شمو ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"آپ لمبے لمبے سانس لے رہے تھے سرکار بڑے بڑے گہرے سانس" وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔ منصور

کے اندر سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اپنے آقا کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر وہ سہم گیا تھا۔

"میں کیا پوچھ رہا تھا"۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا سرکار"۔

"سرکار کے بچے"۔ وہ گرجدار آواز میں بولے "تو کیوں تنگ کرتا ہے۔ کیوں ستاتا ہے مجھے میں تجھے مار ڈالوں گا"۔

شمو خوف سے کانپنے لگا۔ آج آقا کو کیا ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا "پھر ستائے گا"۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے پیشانی پر پڑے تھے۔ انہوں نے شمو کا گریبان پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔

شمو دوڑ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ منصور نے اک زوردار قہقہہ لگایا۔ لیکن اس قہقہے سے دیوانگی مترشح تھی۔ شمو حیرت ڈر اور پشیمانی کے ملے جلے جذبات سے ہانپ رہا تھا۔

"بزدل ڈر گیا"۔ منصور زور سے ہنسے "ادھر آ"۔

وہ ڈرتا ڈرتا قریب آ گیا۔

"کیوں بھاگا تھا بتا"۔ منصور نے شمو کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھا۔ منصور کا ذاتی ملازم تھا۔ اور قریباً پانچ سال سے وہ ان کی خدمت کر رہا تھا۔ اس کا فرض منصور کا لباس تبدیل کروانا۔ اور ان کے ڈریسنگ روم کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اسے اپنے آقا سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ قریباً انہی کا ہم عمر تھا اور اسی قصر رعنا کی بلند چھتوں تلے اس کا بچپن گزرا تھا۔ جوانی آئی تھی۔ اس کا باپ دادا اس خاندان کی خدمت کرتے آئے تھے۔

"بتا کیوں بھاگا تھا"۔ منصور نے اسے جھنجھوڑا۔

"سرکار" وہ سہم کر انہیں دیکھنے لگا۔

"تو مجھے جلاد سمجھتا ہے"۔

"نہیں سرکار"۔

"میں ظالم ہوں"۔

"نہیں سرکار"۔

"مجھ میں بڑی برائیاں ہیں"۔

"نہیں سرکار"۔

"تو پھر تو کیوں بھاگتا ہے۔ مجھ سے کیوں کتراتا ہے۔ بول" منصور نے اسے پھر جھنجھوڑ ڈالا۔ شمو ہاتھ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

باندھے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کیا ہو گیا آقا کو۔ اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ان کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔

"جاؤ" منصور نے اسے چھوڑ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ انہیں چکر سا آگیا۔ شمو انہیں سہارا دینے کے لئے جلدی سے بڑھا۔

"چلے جاؤ" منصور تلخی سے چیخے۔ کھڑے رہنا دشوار تھا۔ مسہری کے تکیہ کا سہارا لیا۔ شمو خواب گاہ سے نکل گیا۔ لیکن پردے کی اوٹ سے دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا۔ کہیں سرکار گر نہ جائیں۔

منصور بڑی دیر تک کھڑے رہے۔ پھر بے تابی سے ٹہلنے لگے۔ کسی پہلو قرار نہ آیا۔ کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی آبنوسی میز پر قیمتی گلدان میں رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ پڑا ہوا تھا۔ وہ بے خیالی میں پھولوں کی پتیاں نوچتے رہے۔ ان کی آنکھوں کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ بال ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

بڑی تمنا سے خریدی ہوئی انگوٹھی جس کا سفید رنگ امیدوں کی طرح چمک رہا تھا۔ ان کی پتلون کی جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے جیب سے انگوٹھی نکالی۔ سفید ڈبی میز پر رکھ دی۔ اور انگوٹھی کو چند ثانیئے دیکھتے رہے۔ ہیرا جگمگا رہا تھا۔ ان پر پھر اک مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو گئی۔ غصے سے انگوٹھی کو دیوار پر دے مارا۔ انگوٹھی دیوار سے ٹکرائی۔ اک مدھم سی صدا بلند ہوئی۔ اور وہ اچھل کر ان کے قدموں میں آگری۔ انہوں نے پیر انگوٹھی پر رکھ دیا۔ اور پوری طاقت سے اسے کچلا۔ وہ موٹے قالین میں دھنس گئی۔ انہوں نے پیر ہٹایا۔ چمکتے ہوئے ہیرے والی انگوٹھی قالین کے نرم نرم بالوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اور ہیرا شرارت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں انہیں انگوٹھی پر پیار آگیا۔ وہ ان کی مقدس محبت کی یادگار تھی۔ وہ ناہید کی امانت تھی۔ اور اسے پاؤں تلے روند کر انہوں نے بڑا ظلم کیا تھا۔ جھک کر انہوں نے بڑی چاہت سے انگوٹھی اٹھا لی۔ ڈبیہ میں بند کی۔ اور الماری میں رکھ دی۔ اپنی حماقت پر انہیں رنج ہو رہا تھا۔ دماغ پہلے ہی تھک چکا تھا۔ وہ بستر پر یوں گر گئے۔ جیسے زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار دی ہو۔ اور واقعی انہوں نے آج زندگی کی سب سے بڑی بازی ہاری تھی۔

وہ پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ وہ درندوں کے شکاری تھے۔ کسی میدان میں انہیں شکست نہ ملی تھی۔ لیکن آج زندگی کے میدان میں وہ ایک کمزور سی لڑکی سے ایسی مات کھا کر آئے تھے۔ کہ دنیا ما فیہا کی ہوش ہی نہ رہی تھی۔

رات انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔ شمو کو سختی سے ہدایت کی۔ کہ کوئی ان کے کمرے میں آنے کی جرأت نہ کرے۔ شمو نے جو کچھ ان کی حالت دیکھی تھی۔ محل کے سب نوکروں کو کہہ سنائی۔ نوکر اور دیگر افراد دو دو چار

چار کھڑے سر جوڑے چہ مے گوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی بھی ان کے جنون کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ اور نہ ہی کسی کو ان کے پاس جانے کی جرأت ہو سکی۔

رات گزر رہی تھی۔ آج رات بھی ان کے مقدر ہی کی طرح سیاہ تھی۔ خواب گاہ کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہلکے سبز رنگ کے مہین پردے ابھی تک لہرا رہے تھے رات کو موٹے پردے بھی گرا دیئے جاتے تھے۔ لیکن آج کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور نہ ہی منصور کو انہیں گرانے کا ہوش تھا۔ وہ ناہید کے انکار کے اچانک اور جانگسل صدمے سے پاگل سے ہو رہے تھے۔

انکار کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

"طبقاتی خلیجیں" انہوں نے سوچا "لیکن انہیں پاٹا جا سکتا تھا۔ یہ تو اتنی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر کیا وہ کسی اور کو" لیکن اس خیال کے ساتھ ہی ان کا دل چیخ اٹھا...... "نہیں ایسا ہرگز نہیں ۔ جھوٹے مکار دغا باز دل۔ تو نے ہی مجھے ڈبویا" ۔ منصور سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے " تو اتنا جھک گیا۔ کہ تجھے پاؤں تلے روند ڈالا گیا۔ تیری وقعت خاک میں ملا دی گئی۔ تجھے حقیر ذرے کی طرح مسل ڈالا گیا" ۔

بھکے بھکے خیالات نے منصور کی پریشانی جنون کی حدوں تک پہنچا دی۔ ان کی حالت مخدوش ہو گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ شمو دو ایک بار کچھ کھلانے کیلئے بڑی ہمت کر کے ان کے پاس گیا۔ لیکن انہوں نے بھری ٹرے الٹ دی۔ برتن چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئے۔ اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کو دیکھ کر انہیں اپنا دل یاد آیا۔ جو ان سے کہیں زیادہ چور چور تھا۔

ان کی حالت سنبھلنے کی بجائے گرتی گئی۔

اور اس گرتی ہوئی حالت کو شمسہ نے سنبھالا دیا۔ وہ نوکروں کے منع کرنے کے باوجود ان کے پاس گئی۔ ان کی حالت دیکھ کر اسے دلی صدمہ ہوا۔ رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ بال پیشانی پر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ ہونٹوں پر خشک پیڑیاں جمی تھیں۔ اور روشن اور کشادہ آنکھوں میں چمک کی جگہ ایک خوف ناک ٹھہراؤ تھا۔ اس نے بڑے حوصلے سے بڑے پیار سے انہیں بہلایا۔ بڑی دیر تک ان کی خوشامدیں کرتی رہی۔ چائے منگوائی زبردستی انہیں پلائی جانے کیا جادو تھا۔ شمسہ کی باتوں میں..... کہ منصور بھولے بھالے بچے کی طرح اس کی باتیں مانتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ انہیں تیار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔

منصور دو دن بعد اپنی خواب گاہ سے باہر نکلے۔ محل کے دیرینہ خدام کے لٹکے ہوئے چہروں پر بشاشت آ گئی۔ اپنے محبوب آقا کی پریشانیوں سے وہ سب پریشان تھے۔ گو ان کے پاس ان پریشانیوں کا مداوا نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ کوئی وجہ جانتے تھے۔ پھر بھی یہ ان کی عقیدت مندی تھی۔

پھر شمسہ نے معمول ہی بنا لیا۔ وہ ہر روز چار بجے شام آتی۔ منصور تیار ہوتے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جاتی۔ کبھی آبشار پر کبھی دریائے سطیر کے کنارے کبھی کسی پر رونق ہوٹل میں کبھی کلب۔ شمسہ کی کوششوں سے منصور کے ہونٹوں کی چھینی ہوئی مسکراہٹ تو نہ لوٹ سکی۔ ان کی آنکھوں کی لازوال چمک تو نہ عود کر آسکی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا۔ کہ جذبات کا تلاطم کسی حد تک تھم گیا۔ شمسہ نے ان کے احساس کو جگایا۔ اور وہ اس پر خار راستے پر پھر سے گامزن ہو گئے۔ بے دلی کے ساتھ۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اب انہوں نے نوکروں پر بلاوجہ برسنا چھوڑ دیا۔ اور ان کی مجنونانہ حرکتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور بظاہر بڑے پرسکون نظر آنے لگے۔

اور بڑے دنوں بعد ناہید دفتر آئی۔ وہ دفتر آنے پر مجبور تھی۔ یہاں وہ کسی اور کو نہ جانتی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے اسے جدوجہد کرنا ہی تھی۔ اس دوران میں اس نے کئی بار کام چھوڑ دینے کے متعلق سوچا تھا۔ لیکن یہی ایک محفوظ جگہ تھی۔ جہاں وہ اپنی عزت چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کا قیامت خیز حسن۔ اور اس کی بھرپور جوانی اس کے لئے اک مستقل خطرہ تھی۔ جب سے شیریں نے بیگم رحمان کے سامنے ناہید کی منگنی کا جھوٹ موٹ قصہ گھڑا تھا۔ اس کا التفات بھی محض رسمی ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اب ڈاکٹر کے گھر کا سہارا بھی جاتا رہا تھا۔ ان سارے حالات کے پیش نظر وہ یہیں نوکری کرنے پر مجبور تھی۔

تقریباً دو ہفتے کی غیر حاضری کے بعد آج وہ دفتر آئی۔ یہ عرصہ اس نے جس کش مکش اور ذہنی خلجان میں گزارا یہ کچھ وہی جانتی تھی۔

محل کی بالائی بالکنی میں منصور جیسے کوئی بڑا ہی دقیق مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں ستون کا سہارا لئے کھڑے تھے۔ اور قصر رعنا کے پھاٹک کے قریب انہیں ناہید کا سایہ نظر آیا۔ ناہید آرہی تھی۔ سرخ بجری والی سڑک پر بڑے محتاط قدم رکھتے ہوئے آرہی تھی۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ بالوں کی آوارہ لٹیں حسب سابق نورانی پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ دھوپ تو اتنی نہیں تھی۔ شاید آنکھوں کی سوزش کو چھپانے کیلئے اس نے چشمہ لگا رکھا تھا ہاتھ میں چرمی سیاہ بیگ تھا۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی چلی آرہی تھی۔

منصور نے اسے دیکھا۔ جمع کی ہوئی صبر کی ساری قوتیں منتشر ہو گئیں۔ زبردستی مسلط کیا ہوا سکون تباہ ہو گیا۔ ان کا سر چکرانے لگا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ طوفان ایک دفعہ پھر اٹھ رہا تھا۔ آندھیاں پھر امنڈ رہی تھیں۔ زلزلے پھر جھٹکا دے رہے تھے۔ شمسہ کی بڑی محنت سے کھڑی کی ہوئی دیواریں دھڑا دھڑ گر رہی تھیں۔

ناہید نے دفتر پہنچ کر پچھلا کام نکالا۔ وہ کام دیکھ رہی تھی۔ اور اعجاز اس کے پاس بیٹھا ہوا باتیں کئے جا رہا تھا۔

"کیا بتاؤں مس ناہید...... آپ تو اتنے دن غیر حاضر رہیں۔ نواب صاحب کی حالت بڑی مخدوش ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں بھلے چنگے اس دن سیر سے لوٹے ہیں۔ پھر جانے کیا ہو گیا۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ نوکروں کو یونہی ڈانٹنے لگے۔ جس دن بارش ہوئی اس دن کی بات ہے یہ"۔

اعجاز کی باتیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہی تھیں۔ وہ بظاہر کاغذوں کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ لیکن اس کا سکون تہس نہس ہو کر رہ گیا تھا۔

"اس دن مجھے بلا بھیجا۔ جب میں گیا۔ تو غصے میں آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں بولے۔ کس نے بلایا ہے تمہیں میں چپ چاپ واپس پلٹنے لگا۔ تو اور بھی غصہ آگیا۔ انہیں کہنے لگے۔ اب جا کیوں رہے ہو۔ عجیب حالت تھی ان کی جانے کیا ہوا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بھی نہیں آنے دیتے تھے۔ بڑی مخدوش حالت رہی چند دن انہیں دیکھ کر دل پھٹا جاتا تھا"

"مجھے بڑا کام کرنا ہے اعجاز صاحب" وہ بڑی رکھائی سے بولی۔ اعجاز خفیف سا ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اس کی باتیں شعور میں زہریلے کیڑوں کی طرح ڈنک مار رہی تھیں۔ وہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ منصور کی اس حالت کی وہی تو ذمہ دار تھی۔ اپنے عیب دار ماضی کو چھپانے کیلئے اپنی ماں کی طوائفیت کے گھناؤنے چہرے کو چھپانے کیلئے اس نے منصور کو لوٹ لیا تھا۔ تباہ کر دیا تھا۔ کچل ڈالا تھا۔ وہ اتنی انجان نہ تھی۔ کہ منصور کی اس حالت کو کسی اور بات پر یا حادثے پر محمول کرتی۔ وہ مجرم تھی۔ اور اب اسے احساس جرم بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔ اور پھر چند دن جو اس نے گزارے تھے۔ ان کی خلش اور اضطراب اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ منصور' وہ ان کے بغیر زندہ رہنا تو درکنار مر بھی نہ سکتی تھی۔ اس نے انکار کر کے صرف اپنے آپ پر ہی نہیں منصور پر بھی ایسا ظلم کیا تھا۔ جسے خدا بھی معاف نہیں کرتا۔

"میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی"۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا "میں اپنے ماضی کو ان کے سامنے ننگا کر دونگی۔ اپنی نسبی پستی کو ان کے سامنے برہنہ کر دوں گی۔ پھر فیصلہ وہ خود کریں گے۔ چاہے تو اس بے نقاب ماضی کے گھناؤنے اور مکروہ چہرے کو دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ حسب نسب کی برہنگی کو حقارت سے ٹھوکر مار دیں۔ اور چاہے بڑے احترام سے ان کی ستر پوشی کیلئے اپنا وسیع دامن پھیلا دیں۔ نتیجہ محرومی ہو یا کامرانی۔ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی"۔ وہ اس فیصلے سے مطمئن ہو کر کام میں لگ گئی۔

شام کے چار بجنے والے تھے۔ وہ ابھی تک اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اک نگاہ گھڑی پر ڈالی۔ اور اک عزم صمیم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ لمحے یونہی کھڑی رہی۔ اور پھر جلدی سے پردہ اٹھا کر باہر برآمدے میں آگئی۔ سامنے کے کمرے سے ہوتی ہوئی وہ پچھلے برآمدے میں نکل گئی۔ اور بڑی تیزی سے بل کھاتے ہوئے سنہری ریلنگ والے زینے کی طرف بڑھی یہی جگہ تھی۔ جہاں اس کی محبت نے جنم لیا تھا۔ جہاں اس کا سادہ اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معصوم دل محبت کی کش مکش سے آگاہ ہوا تھا۔ وہ چند سیکنڈ زینے کے پاس ٹھہری اور تخیل کے پردوں پر زینے پر کھڑے ہوئے اپالو کے مجسّمے کو دیکھتی رہی۔ قدم اٹھے۔ زینہ طے کر کے وہ چوڑی گیلری میں پہنچ گئی۔

خواب گاہ کے باہر شمو پہرے دار کی طرح کھڑا تھا۔ اس نے منصور کے بارے میں شمو سے پوچھا۔

"سرکار اندر ہیں"۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں آہستگی سے بولا۔

"میرے آنے کی اطلاع کر دو"۔ وہ اپنے سیاہ چشمے کو چھوٹے سے ریشمی رومال سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"لیکن مس صاحبہ"۔ شمو خوف زدہ سا تھا۔

"لیکن کیا"۔ اس نے شمو کے سراپا کو گھورا۔

"آج سرکار کو پھر دورہ پڑا ہے کسی سے نہیں ملتے۔ طبیعت بڑی خراب ہے ان کی"۔ شمو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ مجھے ان سے ضروری ملنا ہے"۔ ناہید نے تحکمانہ انداز سے کہا شمو ڈرتے ڈرتے خواب گاہ کے دروازے کی طرف گیا۔ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ ناہید دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اس کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔ اس کا جی چاہا۔ کہ بھاگ جائے۔ وہ منصور کے سامنے کچھ نہ کہہ سکے گی۔ ایک لفظ نہ کہہ سکے گی۔ واپس چلی جائے۔ وہ ابھی ارادہ کر رہی تھی۔ کہ منصور کی گرجدار آواز آئی۔

"ان سے کہہ دو چلی جائیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا"۔

ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے آسمان کی بلندیوں سے اٹھا کر تاریک غاروں میں پھینک دیا ہو جہاں صاف ہوا کی پہنچ نہ ہو۔ جہاں زندگی نے کبھی جھانکا نہ ہو ٹھنڈی ٹھنڈی زہریلی گیس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ وہ بے حس و حرکت چند لمحے کھڑی رہی۔ احساسِ ندامت و شکست نے اسے جھنجھوڑا۔ شمو منہ لٹکائے باہر آ گیا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ناہید گیلری پار کر کے زینے پر پہنچ گئی اس کی دنیا تہ و بالا ہو چکی تھی۔ گرتی ہوئی عمارتوں کے ملبے سے اٹھتی ہوئی دھول سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

جانے کیوں منصور کو اپنے وحشیانہ سلوک پر ندامت سی ہوئی شمسہ کے خلوص نے انہیں سنبھالا دیا تھا۔ اپنا وقت ضائع کر کے وہ ہر روز ان کے پاس آتی تھی۔ انہیں سیر کے لئے لے جاتی تھی۔ ان کی دلچسپی کیلئے نئے نئے راستے تلاش کرتی تھی۔ اور آج انہوں نے اسے اس بری طرح جھڑک دیا تھا۔ یہ نسوانیت کی توہین تھی۔ دوستی کا اپمان تھا"۔ ابھی یہیں ہوگی۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ جلدی سے اٹھے۔ بکھرے بالوں کو درست کیا۔ جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ اور کوئی پانچ منٹ بعد وہ تیزی سے چکر کھاتے ہوئے زینے سے اتر رہے تھے۔ شمسہ

زینے پر کھڑی تھی۔ اس کی سفید موٹر پورچ میں تھی۔

بغیر کوئی بات کے منصور خفیف سے اس کے ساتھ چل دیئے شمسہ کو برآمدے میں بیٹھے ہوئے ملازم سے معلوم ہوا تھا کہ آج ان کی طبیعت پھر خراب ہے۔ اس لئے اس نے بھی کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھی ان کے ساتھ ہی وہ چپ چاپ واپس اتر آئی۔ دونوں خاموشی سے موٹر میں بیٹھ گئے۔ موٹر جب قصرِ رعنا کے پھاٹک کے قریب پہنچی تو ناہید ایک درخت کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ منصور شمسہ کے پہلو میں بیٹھے تھے شمسہ موٹر ڈرائیو کر رہی تھی۔ موٹر تیزی سے گزر گئی۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے موٹر سڑک پر سے نہیں اس کے دل پر سے گزر گئی ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے نے کئی حقیقتوں کے چہرے روشن کر دیئے۔

شمسہ و منصور منصور و شمسہ دو نام بڑی تیزی سے گردش کر رہے تھے چکی کے دو پاٹ تھے یہ دو نام جن میں ناہید پسی جا رہی تھی۔

راستہ بھر منصور شمسہ کی دریا دلی پر غور کرتے رہے۔ آج وہ انہیں سلطان پور کی حسین آبشار پر لے گئی۔ قدرت کا حسن بھی منصور کو اتنا متاثر نہ کر سکا۔ جتنا شمسہ کے کردار نے کیا تھا۔ رات کا کھانا بیچ ہوٹل میں کھایا اور تقریباً بارہ بجے وہ انہیں خواب گاہ تک پہنچا کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

منصور اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ اور کئی گھنٹے اس کی قربت میں رہے تھے۔ لیکن ان کا دل ابھی تک اک گراں بار بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ ضمیر کی چبھن تھی۔ جو چین نہ لینے دے رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے شمو نے انہیں کچھ بتایا ہی نہ ہو"۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے شمو کو آواز دی۔ وہ مستعد سپاہی کی طرح دروازے کے باہر ان کے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

"سرکار نے یاد فرمایا"۔

"ہاں"۔ منصور نے سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا "شمو شام تم نے میرا جواب مس صاحب کو پہنچایا تھا"۔

"نہیں سرکار......وہ...... "شمو خاموش ہو گیا۔

"وہ کیا" انہوں نے لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو خود ہی باہر کھڑی تھیں۔ سرکار انہوں نے خود ہی جواب سن لیا تھا"۔

"کہاں کھڑی تھیں"۔ انہوں نے پھر پوچھا۔ شمسہ ان کی نظر میں بلندیوں پر اڑ رہی تھی۔ وہ اس کے اخلاق کے مداح ہو گئے۔ جس نے اتنی تلخی کو اپنی شیریں مسکراہٹوں میں ڈبو دیا تھا۔

"سرکار دروازے کے قریب ہی کھڑی تھیں۔ جب میں باہر نکلا۔ تو وہ تیزی سے زینے کی طرف چل دیں۔ سرکار ان کا رنگ خوف ناک طور پر زرد تھا۔ وہ کانپ رہی تھیں۔ ستون کو پکڑ لیا تھا۔ ورنہ گر جاتیں"۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شمو کہے جا رہا تھا۔ اور منصور سوچ رہے تھے۔ کہ شمسہ نے اپنی بگڑی ہوئی حالت پر اتنی جلدی کیسے قابو پا لیا تھا۔

"لیکن انہوں نے مجھ سے تو کوئی ذکر نہیں کیا"۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولے

"آپ ان سے ملے تھے سرکار" شمو بڑی حیرت سے بولا۔ منصور کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔

"ابھی تو تمہارے سامنے گئی ہیں"۔ منصور نے اس کی حیرانگی دور کرنے کیلئے کہا۔

"وہ............ یہ" .... اس کی زبان لکنت کھا گئی۔ منصور کے ذہن کو اک جھٹکا سا لگا۔

"کیا بات ہے شمو"۔

"وہ یہ تو نہیں تھیں سرکار۔ وہ تو دفتر والی مس صاحبہ تھیں۔ جنہیں میں اس دن آپ کا خط دینے گیا تھا"۔

"ناہید تھیں"۔ سگریٹ ان کے ہاتھ سے چھٹ گیا۔

"جی سرکار"۔ جھک کر جلا ہوا سگریٹ اٹھاتے ہوئے شمو بولا۔

"تم نے پہلے کیوں نہ بتایا شمو"۔ انہوں نے چیخ کر کہا "اف"۔

شمو ڈر کر باہر نکل گیا۔ وہ سمجھا شاید آقا کو پھر دورہ پڑا ہے۔ اور اتنے دنوں سے وہ سمجھ گیا تھا۔ کہ تنہائی ان کے دورے کا سب سے بڑا علاج ہے۔

منصور کو کچھ نہ سمجھ آ رہا تھا۔ کہ کیا کریں۔ شمسہ ہر روز چار بجے شام انہیں لینے آیا کرتی تھی۔ اور آج بھی انہوں نے شمسہ ہی سمجھ کر ترش کلامی سے کام لیا تھا۔ شمو کے انکشاف سے وہ ششدر رہ گئے۔ سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں بے کار ہو رہی تھیں انہیں صرف یہی احساس تھا۔ کہ وہ کسی معصوم کے جذبات کے قاتل ہیں۔ کسی بے گناہ کے خلوص کے غاصب ہیں۔ وہ دیر تک کمرے کے وسط میں کھڑے بے مقصد خالی ہاتھوں کو ملتے رہے۔ وہ نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے دبائے ہوئے تھے۔

"وہ آئی تھیں۔ کیوں آئی تھیں"۔ ان کے شعور میں ان سوالوں سے گرہیں پڑ رہی تھیں۔

"شاید تجدید محبت کیلئے"۔ یہ خیال جانفزا تھا۔ لیکن ان پر اپنے بہیمانہ سلوک کا خیال کر کے لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ گھنٹہ بھر تذبذب کے عالم میں کھڑے اپنے ہاتھوں کو مسلتے رہے۔ پھر تیزی سے خواب گاہ سے باہر نکل گئے۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ وہ اس وقت منصور کو آسمان کے دل کا گہرا گھاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ ننھے ننھے چمکتے ہوئے ستارے فلک کی چھاتی کے بے شمار زخم معلوم ہو رہے تھے۔ اور خنک چاندنی بلند و پست پر بیوگی کی سفید چادر کی طرح پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہ جلدی سے گیرج کی طرف گئے۔ موٹر نکالی۔ قصر رعنا کے پھاٹک تک گئے موٹر جھٹکے کے ساتھ روک

لی۔ گھڑی دیکھی ڈیڑھ بج رہا تھا۔ رات کے تاریک سمے میں ایک نوجوان اور اکیلی لڑکی کے پاس جانا دنیا والوں کی نظروں میں معیوب تھا۔ وہ ناہید کے لئے چبھن ہوئی نظروں اور طنزیہ باتوں کا سامان پیدا کرنا نہ چاہتے تھے۔

وہ بے قراری سے قصر رعنا کے چمنوں میں ٹہلنے لگے۔ ان کا زخم خوردہ دل اس ناگہانی صدمے سے تڑپ اٹھا تھا۔ ان کی پژمردہ روح اس عظیم بوجھ تلے دبی ہوئی کراہ رہی تھی۔ ان کے دماغ سے دھوئیں اٹھ رہے تھے۔ وہ اپنے سر کو بار بار جھٹک رہے تھے۔ اپنے وحشیانہ سلوک پر انہیں پچھتاوا آ رہا تھا۔ وحشیانہ سلوک اور وہ بھی ناہید کے ساتھ۔

رات انہوں نے سرو و شمشاد کے بلند و بالا درختوں تلے کھڑے۔ او نگھتی ہوئی روشوں پر پھرتے۔ فواروں کے گرد چکر کاٹتے اور سنگ مرمر کے بے جان مجسموں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے گزاری۔ دل کا درد برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ اور اس کے کچو کے بیکل کئے ہوئے تھے۔ پانچ بجنے والے تھے سپیدی سحر پھوٹ رہی تھی۔ چاندنی کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ شفق اور چاندنی ایک دوسرے میں حلول کر گئی تھی۔ منصور قصر رعنا سے باہر آ گئے۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر ان کے قدم ہوسٹل کی جانب اٹھنے لگے۔ وہ غیر اختیاری طور پر در حبیب کی جانب چل دیئے۔ ناہید سے مل کر وہ جلد از جلد اس نئی غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ ناہید کے کمرے کی بتی روشن تھی۔ منصور بے تابی سے پھاٹک کے سامنے کی سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ زندگی اک کانٹا بنی ہوئی تھی۔ جو ہر پہلو سے مسلسل چبھے جا رہی تھی۔

موسم کچھ گرم تھا۔ یا سینے کی جلتی ہوئی بھٹی کی تپش ناہید کو کمرے میں حبس معلوم ہوا وہ باہر چمن میں نکل آئی۔ وہ رات بھر بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اور ان میں جلتی ہوئی چنگاریوں کی چمک تھی۔ رات بھر کی بے داری نے آنکھوں کی جلن کو اذیت ناک بنا دیا تھا۔ منصور کے الفاظ لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح اس کے دل و دماغ کو داغ رہے تھے۔ اس کے دل میں ابل رہے تھے۔

وہ ان کے غیر شائستہ اور تباہ کن رویئے پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ اپنی محبت کو کچل دینا چاہتی تھی۔ اپنے عشق کو غارت کر دینا چاہتی تھی۔ اس محبت نے اس عشق نے آج اسے اس قدر ذلیل کیا تھا۔ اتنا رسوا کیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کھلی ہوا میں ٹہلتی رہی۔ پھر جانے کیا خیال آ گیا۔ وہ نل پر بیٹھ کر وضو کرنے لگی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی اور کھلی ہوا نے خاطر خواہ اثر کیا۔ ہلکے نیلے ریشمی گھیر دار فراک اور اس کی ہم رنگ شلوار اور دوپٹے میں وہ آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی۔ کالا ریشمی باریک سکارف اس کے بالوں میں بندھا ہوا تھا۔

وہ بڑی عقیدت سے سبز گھاس پر بارگاہ ایزدی میں جھک گئی۔ اس کی آنکھوں کے خشک سوتے اس بارگاہ عالی میں ابل پڑے۔ وہ سجدے میں سر رکھے بڑی دیر تک روتی رہی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھمنے میں نہ آتا تھا۔ وہ اس ذات بابرکات کے حضور میں اپنے دل کا سارا درد اپنی ہستی کی ساری جلن آنسوؤں سے مٹا رہی تھی۔ رونے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے اس کے دل کو کچھ قرار آ گیا۔ ہاتھ پھیلا کر اس نے بڑے خضوع و خشوع سے اپنے ربِ حقیقی سے دعا مانگی۔ رات بھر کی ذہنی جنگ سے بھی وہ منصور کے خیال پر غالب نہ آ سکی تھی۔ اس وقت اس نے اپنے اللہ سے امداد مانگی۔ "یا خدا منصور کی یاد میرے دل سے اسی طرح نکال دے جس طرح میری ان کے دل سے نکالی ہے۔" یہی اس کی دعا کا مفہوم تھا۔ وہ شاید مستجاب ہو گئی۔ کیوں کہ وہ منصور کا خیال دل سے نہ بھلا سکی۔ ان کی یاد دل کے ہر گوشے سے اسی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ جس طرح وہ منصور کے ہر حواس پر۔ نہ وہ اسے محو کر سکے تھے۔ نہ وہ کر سکی۔

پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی نظریں منصور کی نظروں سے ملیں۔ وہ اک پرانے درخت کے تنے کے ساتھ لگے بڑے محویت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ناہید گم سم سی دو زانو بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ انہیں اپنے تخیل کا کرشمہ سمجھی۔ لیکن وہ زندہ حقیقت کی طرح سامنے کھڑے تھے۔ ناہید کو اٹھتا دیکھ کر وہ اس کے قریب آ گئے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ کشادہ پیشانی بوجھل تھی۔ روشن آنکھیں سرخ تھیں۔ اور ان میں اک جما ہوا آزار تھا۔ وہ بار بار اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھیر رہے تھے۔

منصور اتنے قریب تھے۔ کہ ان کی موجودگی کا احساس تشبہ نہیں رہا تھا۔

"ناہید۔" انہوں نے اسے یوں پکارا۔ جیسے اکتا دینے والی غیریت۔ اور تھکا دینے والی بیگانگی کو ختم کر دینا چاہتے ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل ہو چکی ہے۔ جسے گرا دینے کا خیال بھی مضحکہ خیز تھا۔

ناہید چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح تلملا اٹھی۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔

"کل آپ میرے پاس آئی تھیں۔" منصور کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"جی ہاں۔" اس نے ان پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی۔ اور اس کے لہجے کی تلخی کو منصور نے شدت سے محسوس کیا۔

"میں اپنے بہیمانہ سلوک پر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ دراصل میں نے آپ کو شمسہ سمجھا......" الفاظ ان کے حلق میں اٹک گئے۔ اور وہ متاسف سے کھڑے اپنے بوٹوں سے گھاس کو کچلتے رہے۔

"شمسہ......" ناہید نے طنزیہ کہا۔

"یقین مانئے۔ میں نے آپ کو شمسہ سمجھ کر۔"

منصور کے الفاظ نے جیسے جوالا مکھی کا منہ کھول دیا۔ بارود کو آگ دکھا دی۔ ناہید کا تھکا ہوا دماغ پھٹنے لگا۔ وہ بصد مشکل اپنے آپ کو قابو میں رکھ رہی تھی۔ اس کے گال تمتما اٹھے تھے۔ اور آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

شمسہ کے پہلو میں منصور کو بیٹھے دیکھ لینے کے بعد ان کی بات کی صداقت پر یقین کرنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

"یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں تھی۔ نواب صاحب۔ جس کے لئے آپ کو معافی مانگنا پڑے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ اور جانے کے ارادے سے قدم اٹھائے۔

"میں اپنی خطا کی کافی سے زیادہ سزا بھگت چکا ہوں۔" انہوں نے بڑھ کر ناہید کا راستہ روک لیا۔ "جب تک اس غلط فہمی کا ازالہ نہ ہو جائے میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔"

"غلط فہمی۔" ناہید کا جی چاہا۔ کہ اک فلک شگاف قہقہہ لگائے۔ اس نے اپنے کو بمشکل روکا۔ پھر بھی بے قابو ہنسی اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ منصور کا دل اچھلا۔ وہ سمجھے ناہید نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ وہ بے اختیارانہ اس کی جانب بڑھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یوں پیچھے ہٹ گئے۔ جیسے شعلوں نے ان کا منہ جھلس دیا ہو۔ ناہید کے لبوں پر ہنسی تھی۔ جس میں دنیا بھر کا سمیٹا ہوا زہر تھا۔ جوالا مکھی کی کھولتی ہوئی آگ تھی۔

"آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔" منصور بے چارگی سے بولے۔

"معافی مانگ کر آپ اپنی جلیل القدر شخصیت کی توہین کر رہے ہیں نواب صاحب۔ آپ نے اپنے حق کا جائز استعمال کیا۔" وہ ان کی طرف بے باکانہ دیکھتے ہوئے طنزیہ ہنسی۔ "آپ کا تمول۔ آپ کا وقار۔ آپ کی عزت آپ کی شہرت آپ کو حق دیتی ہے کہ جس سے چاہیں اور جیسا چاہیں سلوک روا رکھیں۔ ہم جیسے بے آسرا لوگ آپ کے رحم و کرم پر ہی تو پڑے ہیں۔"

ناہید کی باتیں منصور کے بلند کردار کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسا رہی تھیں۔ غلط فہمی دور ہونے کی بجائے پیچیدہ ہو گئی تھی۔ منصور اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکتے تھے۔ اور ناہید کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا اور کانوں سے سنا ہوا واقعہ بھولا نہیں تھا۔ اس کے الفاظ منصور کی چھاتی میں زہر آلود تیروں کی طرح چبھ رہے تھے۔ لیکن وہ بڑے تحمل سے کام لے رہے تھے۔ چپ چاپ ناہید کی باتیں سن رہے تھے۔

"میرے کردار کی ٹوٹ آپ کے ذہن پر اس بری طرح نقش ہو چکی ہے۔" وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ ان کا سانس سینے میں بمشکل سما رہا تھا۔ "شاید کوئی وقت آئے۔ جب آپ کو یہ نقش اپنے ذہن کا سب سے بڑا داغ محسوس ہونے لگے...... خیر۔" وہ قدرے رک کر بولے۔ "میں صرف آپ سے اک بات پوچھتا ہوں۔"

اور ناہید کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بولے۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ کہ زندگی کے سب سے بڑے تعلق سے لاتعلقی کے بعد آپ کس لئے تشریف لائی تھیں۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اس تعلق کی آخری کڑی بھی توڑنے کے لئے۔" ناہید نے جلدی سے جواب دیا۔ آج اس کی بے زبانیوں کو زبان مل گئی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی کا سارا زہر اگل رہی تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ افق پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔

"میں اپنا استعفیٰ پیش کرنے آئی تھی۔" ناہید نے سفید جھوٹ بولا۔ منصور نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ان کے صبر و قرار پر جیسے بجلی گر گئی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور آنکھوں کے لال لال ڈورے اور گہرے ہو گئے۔ وہ زور سے چیخے۔

"آپ مجھے ذلیل کرنے کا تہیہ کر چکی ہیں۔ اتنا ذلیل کر لیجئے۔ کہ دل کی کوئی حسرت باقی نہ رہے۔"

وہ اک جھٹکے کے ساتھ پلٹے۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے واپس چلے گئے۔

ناہید سانس روکے کھڑی رہی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا۔ کہ زنجیر بن کر ان قدموں سے لپٹ جائے۔ جو اس کے منصور کو اس سے دور لے جا رہے تھے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اپنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں دانتوں تلے دبائے۔ وہ دور جاتے ہوئے منصور کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور منصور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

..............○..............

۱۲

ٹاخ۔ ٹاخ۔ ٹاخ۔

گیند راڈ سے ٹکرا رہی تھی۔

نواب ذوالفقار علی خان کی لندن والی اقامت گاہ کے ایک وسیع کمرے میں بلیرڈ کھیلا جا رہا تھا۔ آج انہوں نے اپنے مشرقی اور مغربی دوستوں کو اپنے عزیز بھتیجے منصور کی آمد پر ایک پر تکلف دعوت دی تھی۔ کھانے کے بعد مہمان ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ کچھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ کچھ بال روم میں جوان جوان بانہوں کے سہارے ڈانس کر رہے تھے۔ کچھ ریفریشمنٹ روم میں تازہ دم ہو رہے تھے۔ اور کچھ اس روشنی سے جگمگاتے طویل و عریض ہال میں بلیرڈ کھیل رہے تھے۔

منصور برابر ہار رہے تھے۔ اور بلیرڈ کے چیمپئن کی یہ ہار موضوع بنتی چلی جا رہی تھی۔ "آپ آج کھیل کے موڈ میں نہیں ہیں مسٹر منصور۔" لارڈ ہیرسن نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جبھی تو برابر ہار رہے ہیں۔ ورنہ مسٹر منصور اور ہار دو متضاد چیزیں ہیں......" مس آرتھرا اپنے نائیلان کے خوبصورت لباس میں بڑی جاذب نظر آ رہی تھی۔ اور منصور کی یہ ہار انہیں کھٹک رہی تھی۔

"یہ تو بلیرڈ کے مانے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ورنہ یہ ہار ماننے والے کہاں ہیں۔" مسٹر پیٹر نے داد کے طور پر کہا۔

کھیل جاری تھا۔ اور میز کے گرد تماشائی بکثرت جمع ہو گئے تھے۔ منصور نے پھر بازی ہار دی۔ تماشائی پھر ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے لگے۔ اور اس خواہ مخواہ کی ہمدردی سے منصور کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ ہار ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ اور وہ سوچ رہے تھے۔ کہ اب وہ کبھی بھی نہ جیت سکیں گے۔

کھیل پھر شروع ہو گیا۔ منصور بڑی بے دلی سے کھیل رہے تھے۔

"اگر طبیعت ٹھیک نہیں مسٹر منصور تو کھیل ملتوی کر دیا جائے۔" لارڈ ہیرسن نے راڈ روک کر پوچھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"نہیں کچھ ایسی بات تو نہیں۔" منصور ہزیمت خوردہ ہنسی ہنسے۔

"تو پھر دلجمعی سے کھیلئے نا۔" روبی ہیرٹ نے اپنی نیلگوں آنکھوں سے انہیں بڑے پیار سے دیکھا۔ "آپ کئی بازیاں ہار چکے ہیں۔ یہ بات آپ کے شان شایان نہیں۔ آپ تو اتنے بڑے کھلاڑی ہیں۔"

"ضروری تھوڑا ہی ہے مس ہیرٹ۔" منصور نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کہ بڑا کھلاڑی ہر بازی جیت لے۔"

منصور نے بڑی حسرت سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں مایوس تمناؤں کی تڑپ تھی۔ راڈ آہستگی سے رکھ کر وہ میز سے ہٹ گئے۔ کھیل کچھ دیر کے لئے ملتوی ہو گیا۔ وہ تلخ سی ہنسی ہنستے ہوئے ریفرشمنی روم کی طرف چلے گئے۔

"آج کل کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں مسٹر منصور۔" جیمز نے ان کے جانے کے بعد کہا۔

"واقعی۔" مس برگنز ابولیں۔ "کل مسز میکالے کے ہاں بھی کچھ الجھے الجھے تھے۔ میں نے ڈانس کے لئے کہا۔ تو بڑی خوبصورتی سے ٹال گئے۔"

"پہلے تو ان کی آمد سے بڑی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ اتنے ہنس مکھ انسان کا یوں چپ ہو جانا واقعی تعجب کن ہے۔" مسٹر اسٹلینیے نے اضافہ کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں زیادہ مہمانوں کی تعداد ان کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ مس روبی ہیرٹ خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی خوبصورت نیلی نیلی آنکھوں میں غم کے سائے ڈول رہے تھے۔ یہ سنہری سنہری بالوں والی سرخ وسفید گڑیا لارڈ ہیرٹ کی اکلوتی صاحب زادی تھی۔ دل ہی دل میں منصور کو چاہے جا رہی تھی۔ منصور کی آمد اس کے لئے صدہا خوشیوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ اور جب وہ چلے جاتے تھے۔ تو روبی کی دنیا کچھ دنوں کے لئے اندھیر ہو جایا کرتی تھی۔ اور پھر ان کے دوبارہ آنے کے انتظار میں تلخی کے دن کاٹا کرتی تھی۔ لیکن اس دفعہ وہ کچھ اس انداز سے آئے تھے۔ کہ روبی کا دل ڈوب کر رہ گیا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ اور وہ اپنا بے تاب دل تھامے منصور کے پیچھے ریفریشمنٹ روم میں آ گئی۔

بیگم سعید ملک اپنی قیمتی بنارسی ساڑھی کا زریں پلو کسے ہوئے بلاؤز سے چھلکتے ہوئے سینے کی دلدوز بندشوں پر ڈالتے ہوئے منصور کے قریب کھڑی تھی۔ منصور کے ہاتھ میں گلاس تھا...... وہ اپنے سوکھے ہوئے حلق کو پانی سے تر کر رہے تھے۔ اور کھڑکی میں خورشید کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔

"کیا بات ہے منصور۔" بیگم ملک نے پوچھا۔

"پانی پی رہا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"پانی پی رہے ہیں۔ یا کھیل رہے ہیں۔" وہ ساختہ ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

جو سمجھ لیجئے" وہ گلاس پکڑے ابھی تک کھڑے تھے۔

آپ کی منگنی کا کیا بنا منصور۔ ہم تو مٹھائی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اور ہنس دی اور منصور کے چہرے پر ایک اذیت ناک لہر دوڑ گئی۔ پانی کا گلاس ہاتھ سے گر جاتا۔ اگر وہ جلدی سے اسے ٹرے میں نہ رکھ دیتے۔

"ذُلفی بھائی بتا رہے تھے کہ آپ کی منگنی ہونے والی ہے۔" وہ اپنے لمبے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

اور یہ بھی تو بتایا تھا کہ آپ کو اپنی پسند کی بہترین لڑکی ملی ہے۔ خورشید قریب آتے ہوئے بولے۔

منصور کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بیگم سعید ملک نے ان کے گلے پر چھری رکھی تھی۔ جو خورشید نے بڑھ کر چلا دی۔ لیکن اس اذیت کے باوجود مُسکرا رہے تھے۔

ہم نے سمجھا تھا کہ اس دفعہ بیگم بھی ساتھ آئیں گی۔ لیکن آپ اکیلے ہی آ گئے؟ بیگم ملک اپنے جوڑے میں لگے ہوئے پھول ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"اس دفعہ تو معاف کیا۔ اگر اگلے سال آپ اکیلے آئے۔ تو ہوائی اڈے سے ہی واپس بھیج دیا جائے گا سمجھے منصور" خورشید نے ان کا شانہ ہلایا۔

بالکل ٹھیک۔ بیگم ملک نے قہقہہ لگایا۔ خورشید نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ منصور کھسیانے سے کھڑے رہے۔ وہ اس وقت تنہائی چاہتے تھے۔ ایسی تنہائی جس میں اُن کے خیالوں کا بھی گذر نہ ہو۔ شور و غوغا سے ان کی طبیعت پریشان ہو رہی تھی۔

نائید سے تعلقات منقطع ہونے پر وہ اپنے دلِ مضطر کو لیے لندن آ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ماحول کی تبدیلی ان کی وحشت کو دُور کرنے میں مددگار ثابت ہو گی۔

نائید اور ان کے درمیان ناچاکی کے علاوہ اک خوف ناک غلط فہمی بھی حائل ہو چکی تھی انہوں نے اس سے معافی مانگ کر یہ غلط فہمی دُور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس دن معاملہ کتنا اُلجھا تھا۔ کہ منصور کے لیے اپنا گھر ہی بیگانہ ہو گیا اور وہ پہلی فرصت میں لندن آ گئے۔ یہاں آ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا قدم آگے بڑھنے کی بجائے خود انہیں ہی کچل رہا ہے۔ نائید سے دُوری بھی اذیت ناک تھی اور قربت بھی تکلیف دہ۔

مسٹر منصور" رُوبی ہیرٹ آ گئی "آج ڈانس میں میں آپ کی پارٹنر بنوں گی وہ ان کی باہوں میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہم کیوں پیچھے رہیں مسز ملک۔" خورشید نے مسز ملک کی طرف بازو بڑھا دیا۔ اور وہ اس کے بازو پر جھولتی ہوئی مسکرا دی۔ دونوں ہنستے ہوئے بال روم کی طرف چل دیئے۔

"معاف کیجئے مس ہیرٹ میں آج ڈانس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔"

منصور نے بڑی شائستگی سے اپنا بازو اس کی مرمریں بانہوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔" وہ مایوسانہ انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"میری طبیعت پریشان ہے۔" وہ لمبے دریچے سے باہر باغ کی سوئی ہوئی فضا کو گھورتے ہوئے بولے۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے منصور۔" روبی نے وارفتگی کے عالم میں اپنا نازک سا سر منصور کے چوڑے کندھے پر ٹکا دیا۔ قیمتی ڈنر سوٹ میں ملبوس یہ مشرقی شہزادہ روبی کی تشنہ تمناؤں کا حاصل تھا۔ وہ اس چوڑے شانے پر سر رکھے مدہوش سی جذبات کی دنیا میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور منصور کو سردیوں کی وہ دوپہر یاد آ گئی جب وہ ناہید کو ہسپتال کے بس سٹینڈ سے اپنے ہمراہ موٹر میں لے آئے تھے۔ اور ایک موڑ پر جھٹکا لگنے سے ناہید کا سر ان کے اسی شانے سے ٹکرا گیا تھا۔ کتنا فرق تھا۔ ناہید کے غیر ارادی اور مس روبی کے دانستہ ٹکراؤ میں۔ اس دن تو ان پر جذبات کا کیف آور سکر چھا گیا تھا۔ ان کی رگ وپے میں مسرت برقی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ اور انہوں نے ہمیشہ یہی فضا رہے" کی خواہش بڑی شدت سے محسوس کی تھی۔ اور آج روبی کا بے جان سا سر انہیں اپنے کندھے پر اک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا سر اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔ روبی نے اس طرح انہیں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "مجھے مایوس نہ کرو۔"

منصور نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا۔ "میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا روبی۔ میں خود تہی دست ہوں۔ مجھ سے سب کچھ چھین لیا گیا ہے۔ میرا متاعِ حیات لوٹ لیا گیا ہے۔ مجھے کنگال کر دیا گیا ہے۔ تمہیں دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ یوں دیکھ کر میری بے بسیوں کا تمسخر نہ اڑاؤ۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں مجبور ہوں۔ بے بس ہوں روبی۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔"

وہ بے قراری سے ٹہلنے لگے۔ روبی بڑھی۔ اور اپنی سڈول بانہیں منصور کے گلے میں حمائل کرنا چاہیں۔ مشرق کو مغرب کی اس آزاد روی پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ منصور نے روبی کے اٹھتے ہوئے بازوؤں کو اپنے ہاتھوں پر ہی تھام لیا۔

"اپنے کو اتنا ارزاں نہ بنایئے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"میں مایوس ہونا نہیں چاہتی منصور۔" وہ انداز سپردگی سے ان کی جانب بڑھی۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرنے کے قابل نہیں ہوں مس روبی۔" وہ اسی سنجیدگی سے بولے۔

"منصور۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" وہ بڑی تمنا سے بولی۔

"مجھے افسوس ہے...... کہ میں......"

"منصور۔" روبی نے ان کی بات کاٹ دی۔ "میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ میں آپ کی محبت کی بھوکی ہوں۔"

"مس روبی۔" منصور مضطرب ہو کر بولے۔ "انگاروں کو چھونے کی کوشش نہ کیجئے یہ آپ کو بھی جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے۔ چمن میں بے شمار پھولوں کو چھوڑ کر خاروں سے نہ الجھئے۔ ٹوٹی ہوئی بانہوں سے سہارے کی فضول توقع پر قوی بازوؤں کو رد نہ کیجئے۔ میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ آپ کے لئے سہارا دینے والوں کی کمی نہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر تنومند سہارا آپ کو مل جائے گا۔

منصور کے لہجے میں اک رقت تھی۔ اک کرب تھا۔ اک کھولن تھی۔ روبی متحیر سی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ اور پھر اپنی خوبصورت آنکھوں کو ننھے سے ریشمی رومال سے خشک کرتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔

لندن کی گہما گہمیوں سے منصور کو چڑ ہو گئی۔ زلفی انہیں سکاٹ لینڈ لے گئے۔ چند دن اچھے گذرے اور پھر طبیعت کا چڑچڑاپن عود آیا۔ زلفی وہاں سے لوٹ آئے۔ اور سوئزرلینڈ چلے گئے۔ گل پوش وادیوں اور برف پوش پہاڑیوں نے منصور کے دل کے داغوں کا تمسخر اڑایا۔ ان کی جلن کو ٹھنڈا نہ کیا۔ زلفی انہیں جگہ جگہ لئے پھرتے رہے۔ پیرس کے ہوٹل۔ افریقہ کے جنگل کوئی بھی تو ان کی تشنہ مسرت روح کا مداوا نہ کر سکا۔ چار ماہ مسلسل سکون وچین کی تلاش میں گنوا دینے کے بعد وہ لندن واپس آ گئے۔ قرار کہیں بھی نہ مل سکا۔ پھانس نکالنے کے لئے انہوں نے ساری کھال چھیل ڈالی۔ لیکن پھانس نہ نکلی۔ وہ چبھے گئی۔ اور مسلسل چبھے گئی۔ اور اس آوارہ گردی اور صحرا نوردی نے منصور کی صحت پر بہت برا اثر کیا۔ ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ سینے میں ذلت آمیز ناکامی گیلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہی تھی۔ سرخ وسفید رنگت دھندلا رہی تھی۔ کندن اپنی آب و تاب کھو رہا تھا۔ سونا میلا ہو رہا تھا۔ چاند کو گہن لگ رہا تھا۔

زلفی بڑے متفکر تھے۔ کئی بار انہوں نے منصور کو طبّی معائنے کے لئے کہا۔ لیکن ہر دفعہ انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔

"میں کوئی بیمار تھوڑا ہی ہوں۔"

"بیمار نہ سہی کمزور تو ہو رہے ہو۔ چہرہ اترا ہوا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔"

"یہ سب آپ کا وہم ہے۔ ورنہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں مجھے۔"

زلفی خاموش ہو جاتے لیکن منصور کی گرتی ہوئی صحت سے وہ بعض اوقات بڑے پریشان ہو جاتے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

منصور دنیا میں انہیں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ اس دفعہ منصور بغیر اطلاع کے آئے تھے۔ اور تقریباً چار ماہ سے انہیں کے پاس تھے۔ زلفی اس کی وجہ تو نہیں جانتے تھے۔ لیکن سمجھ رہے تھے۔ کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ کئی بار کریدنا چاہا۔ لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے ٹال گئے۔

بڑے دنوں کے بعد آج چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ مشرقی بر آمدے میں ہلکے سبز کپڑے والی خوبصورت آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ کین کے خوبصورت میزوں پر اخبار پڑے تھے۔ موسم پر نکھار تھا۔ حد نگاہ تک حسین مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ دور برفانی چوٹیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔

زلفی اور منصور آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ زلفی کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ پڑھنے سے زیادہ اخبار کی کالی کالی سطروں کو گھور رہے تھے۔ خیالات کہیں اور گھوم رہے تھے۔ منصور میز پر رکھی ہوئی چمکیلی طشتری میں پڑی ہوئی آج کی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ کئی خطوط تھے۔ دوستوں کے۔ کارندوں کے۔ یاسمین کے۔ اور سیکرٹری اعجاز کے۔ ہر خط بڑی بے دلی سے پڑھ کر وہ واپس طشتری میں رکھ رہے تھے۔ یاسمین کا خط پڑھ کر ان کے چہرے پر گھڑی بھر کے لئے رونق آگئی۔ بڑے مزے مزے کی باتیں لکھی تھیں انہوں نے۔

"کس کا خط ہے۔" زلفی نے ان کے چہرے پر بڑے دنوں کے بعد مسکراہٹ دیکھی تھی۔

"باجی کا۔" انہوں نے خط زلفی چچا کے ہاتھ میں دے دیا۔ زلفی خط پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ اور منصور نے بے توجہی سے اعجاز احمد کا خط پڑھنا شروع کر دیا۔ بڑا طویل خط تھا۔ وہی فرسودہ باتیں۔ وہی ضروری امور پر تبادلہ خیال۔ وہی حساب کی پڑتال۔ سب روکھی پھیکی باتیں تھیں۔ اس کا ہر خط ایسا ہی خشک اور بدمزہ ہوتا تھا۔ کاروباری قسم کا۔

منصور نے بغیر ختم کئے خط طشتری میں رکھ دیا۔ ان کی اپنی زندگی بھی آج کل کچھ اس خط ہی کی طرح روکھی پھیکی گذر رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ اٹھانا چاہا۔ لیکن جلدی سے پھر اعجاز کا خط ہاتھ میں لے لیا۔ خط کے آخری پیراگراف میں انہیں ناہید کا نام نظر آیا۔ ایک ہی سانس میں وہ سارا پیراگراف پڑھ گئے۔ صرف تین سطور ناہید کے بارے میں تھیں۔

"مس ناہید کچھ بیمار سی رہتی ہیں۔ شاید مسلسل کام کا نتیجہ ہے۔ یا پچھلے دنوں کے موسم کے حبس کا۔ اگر اجازت ہو۔ تو انہیں کم از کم دو ماہ کی رخصت دے دی جائے۔ تاکہ ان کی صحت بحال ہو جائے۔" منصور نے سارا خط پھر سے پڑھا۔ صرف یہی سطور ناہید کے متعلق تھیں۔

منصور کو عمر میں پہلی بار اعجاز پر اتنا غصہ آیا۔ کہ وہ اگر قریب ہوتا تو عجب نہیں وہ اس کا گلا ہی گھونٹ دیتے۔ ناہید کی صحت گر رہی تھی۔ اور وہ ان سے اجازت مانگ رہا تھا۔ کہ چھٹی دے یا نہ دے۔ فوراً نوکر کو بلا کر بحری تار دیا گیا۔ کہ ناہید کو چھٹی دے دی جائے۔

سارا دن منصور نے عجب پریشانی میں گذارا۔ ناہید کو بھلا دینے کے انہوں نے جتنے جتن کئے تھے۔ وہ سب الٹ ثابت ہوئے۔ وہ دن بدن شدت سے یاد آ رہی تھی اور منصور کی بقا کے لئے وہ ہوا اور پانی کی طرح ضروری ہو کر رہ گئی تھی۔

اسی شام زلفی کے ساتھ چائے پیتے ہوئے منصور کو چکر سا آگیا۔ ایسے چکر انہیں دو چار پہلے بھی آ چکے تھے۔ لیکن آج وہ دیر تک بے ہوش پڑے رہے۔ جب انہیں ہوش آیا۔ تو وہ اپنے بستر پر پڑے تھے۔ اور بوڑھا ڈاکٹر گریگوری ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ زلفی پریشان تھے۔ اور ان کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھے تھے۔

"فکر کی بات نہیں مسٹر ذوالفقار۔ کمزوری ہے۔ ٹانک استعمال کریں ٹھیک ہو جائیں گے۔" بوڑھا مدبر ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ لیکن منصور کے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی میں زلفی کی عمیق نظریں کچھ اور ہی دیکھ رہی تھیں۔

دوسرے دن منصور نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔

"ٹھیک ہونے پر چلے جانا۔ ابھی تمہیں سفر نہیں کرنا چاہئے۔" زلفی کچھ سوچ رہے تھے۔

"میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔" منصور ضدی بچے کی طرح مچل گئے۔

"منصور" زلفی ان کے اصرار کو نظر انداز کرتے ہوئے متفکرانہ لہجے میں بولے۔

"جی" منصور نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔ کمرہ ہیٹر سے گرم تھا۔ اور باہر دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی دوپہر کے تین ہی بجے تھے۔ لیکن ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے رات ہو گئی۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اور اس کی روشنی دھند کے عکس سے کمزور کمزور سی نظر آ رہی تھی۔

"ایک بات پوچھوں۔" زلفی نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "ٹال تو نہ جاؤ گے۔"

منصور جان گئے۔ کہ وہ کیا پوچھیں گے۔ ان کا دل زور سے دھڑکا۔ اور وہ چپ چاپ لیٹے رہے۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ کرسی ان کے پلنگ کے قریب کرتے ہوئے بولے۔ ان کے لہجے میں اک باپ کی بے لوث چاہت اور ایک دوست کا پر خلوص پیار تھا۔

بے اختیار منصور کا جی چاہا۔ کہ زلفی کی چھاتی سے لگ کر اپنے سارے غموں کو اشکوں کے سیلاب میں بہا دیں۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ لاوا باہر نکلنے کے لئے کلبلا رہا تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ پہاڑ کے پتھریلے سینے کو جلانے والی سیال آگ اگر بہہ نکلی تو اس کی زد میں آنے والی ہر چیز جل کر خاکستر ہو جائے گی۔ اس لئے بڑی ہمت سے وہ ہر پڑنے والی دراڑ کا منہ بند کر رہے تھے۔ لاوا اندر ہی اندر کلبلا رہا تھا۔ اور سیال آگ اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ منصور نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے زلفی کا چین و سکون بھی غارت ہو جائے۔

"کیا کسی چٹان سے ٹکرا گئے۔" زلفی نے زخمی سی مسکراہٹ سے ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہ تو افسوس ہی رہا۔ کہ کوئی چٹان حائل ہی نہ ہوئی۔" منصور آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ واقعی انہیں سنگلاخ چٹانوں نے نہیں کچلا تھا۔ ہموار میدانوں نے مارا تھا۔

"منصور تم کچھ چھپا رہے ہو۔" زلفی بولے۔ "لیکن تم اس بات کو جتنا ڈھکا چھپا سمجھ رہے ہو وہ اتنی ہی عریاں ہے۔ میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں زلفی چچا۔" منصور پلنگ کے تکئے سے سر ٹیک کر تقریباً بیٹھے ہوئے بولے۔

"تم غلط کہہ رہے ہو۔" زلفی بڑی سنجیدگی سے بولے۔ سگریٹ نکالا۔ لائٹر سے روشن کیا۔ پھر مینٹل پیس پر پڑی ہوئی تصاویر کو بڑے انہماک سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"تمہارا روگ میرا جانا بوجھا ہے منصور۔" زلفی کے لہجے میں برف کی منجمد برودت تھی۔ منصور ہنس دیئے۔ انہوں نے ہنسی میں بات ٹالنا چاہی۔ لیکن زلفی بیحد سنجیدہ تھے آج۔ منصور خاموشی سے انہیں دیکھنے لگے۔ زلفی اٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگے۔ سگریٹ کے کش پر کش لگاتے ہوئے وہ بولے۔ یہ دور کبھی مجھ پر بھی آیا تھا۔ لیکن دیکھ لو..... "انہوں نے پلٹ کر منصور کی حیران حیران نظروں سے مسکراتی ہوئی نظریں ملائیں۔ مسکراہٹ جس سے لہو ٹپک رہا تھا۔ زخمی بسمل تڑپتی ہوئی مسکراہٹ جب کسی مرد کے ہونٹوں پر پھیل جائے تو اس کے جذبات کا تجزیہ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ منصور ابھی تک حیرانگی سے زلفی چچا کو دیکھ رہے تھے۔ جو زندگی میں شاید پہلی بار اتنے سنجیدہ نظر آئے تھے۔

"ناکامیوں نے مجھے نگل جانا چاہا۔ لیکن میں ان سے مرعوب نہیں ہوا۔ میں نے ان کا منہ چڑایا۔ میں نے انہیں پچھاڑ دیا۔ جینا ہے تو ہنس ہنس کے جیو۔" منصور نے دیکھا کہ زلفی کی بڑی بڑی آنکھوں سے آزار چھلک رہا تھا۔ اور ان کے گوشے بھیگ سے گئے تھے۔ زلفی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

منصور کو ان کی زندگی کے اس حادثے کا جس کا انہوں نے اشارۃً ذکر کیا تھا۔ کچھ علم نہ تھا۔ اسی لئے وہ بڑی دیر تک حیران سے بیٹھے رہے۔ زلفی کو انہوں نے ہمیشہ ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے دیکھا تھا۔ لیکن آج یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی۔ کہ زخم بھر جائیں۔ گھاؤ مٹ جائیں۔ لیکن ان کے نشان کبھی نہیں مٹتے۔ اور ان اَن مٹ نشانوں سے زخموں کے آزار کی تلخ یاد ہمیشہ وابستہ رہتی ہے۔ تو پھر زخموں کے مندمل ہونے کا فائدہ؟ گھاؤ بھر جانے کا حاصل؟ منصور سوچ رہے تھے۔ کیوں نہ ان زخموں کے کھلے منہ پر پے در پے کچوکے لگنے دیئے جائیں۔ تاکہ کچوکوں کی اذیت سے زخم اپنے درد کی شدت کا احساس ہی کھو دیں۔

زلفی نے فطرت کو تہذیب کے دائرے میں لا کر اس کی شکل مسخ کر ڈالی تھی۔ انہوں نے اس کے منہ پر ظاہرداری کے پردے تان دیئے تھے۔ لیکن ننگی فطرت ان پردوں کے پیچھے کسمسا رہی تھی۔ باہر آنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ زلفی کو قدم قدم پر اسے چھپانے کا اہتمام کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ بات منصور کے نظریئے کے مطابق

غلط تھی۔ وہ فطرت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جس میں قدرت نے ودیعت کی تھی۔

انہوں نے ناہید کو چاہا تھا۔ اسے پا لینے کی آرزو کی تھی۔ یہ آرزو اب بھی اپنی جگہ پر اٹل تھی۔ اسی طرح تھی۔ جس طرح اس سے تعلقات کشیدہ ہونے سے پہلے تھی۔ انہوں نے اپنی اس فطری خواہش کا گلا گھونٹنے کی فضول کوشش نہیں کی تھی۔ اس تمنا کا دھارا کسی اور طرف موڑنے کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ گو وہ ناہید کو نہ پا سکے۔ اس کا حصول ان کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ لیکن یہ تند خواہش زندہ تھی۔ وہ ان کی ہستی کو چاٹ رہی تھی۔ منصور نے کوئی احتراز نہ کیا۔ اور اس جان دار تنومند خواہش کی خوراک بن گئے۔ ان کی صحت گرتی گئی۔ اور جب اڈے پر زلفی منصور سے الوداع کہتے ہوئے بغل گیر ہوئے۔ تو زلفی کا دل بے حد پریشان تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر کہا۔

"منصور ہنس ہنس کے جینا سیکھو۔"

اور منصور ہنس دیئے۔ شاید زلفی کے مقصد حیات پر۔

............○............

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۱۴

ناصرہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ڈاکٹر رحمان کی عمر بھر کی کمائی کا بیدریغ صرف ہو رہا تھا۔ ایک تو لڑکی کی شادی اور وہ بھی پہلی لڑکی کی بیگم رحمان کو تو کچھ سوجھ بوجھ ہی نہ رہا تھا۔ وہ یہ شادی کچھ اس دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھی۔ کہ لوگ برسوں اس کی یاد نہ بھلا سکیں۔ اور وہ سالوں اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ شدہ رقم کا تذکرہ اک تفاخر سے کرتی رہیں۔ بہترین ملبوسات تیار ہو رہے تھے۔ عمدہ عمدہ ڈیزائنوں کے مرصع زیورات آرہے تھے۔ قیمتی فرنیچر خریدا جا رہا تھا۔ مہمانوں کی فہرستیں بن رہی تھیں۔ غرضیکہ اک گہما گہمی تھی۔ جس میں ڈاکٹر کے مختصر سے خاندان کے علاوہ اس کے قریبی عزیز بھی حصہ دار تھے۔

شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ چند دن باقی رہ گئے تھے۔ لیکن ابھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ سارا کام پڑا ہوا ہے۔ فاخرہ بڑی مستعدی سے ہر کام میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اور ناصرہ شرمائی لجائی آنے والے خوش کن دور کو تصور میں بسائے جتنا ہو سکتا تھا کام نبھائے جا رہی تھی۔ فاخرہ کو شادی کی خوشی بھی تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ گھر میں اتنی چہل پہل دیکھنے میں آئی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اسے بہن کے بچھڑنے کا غم بھی تھا۔ وہ فرصت کے وقت غسل خانے میں جا کر جی کھول کر رو بھی لیتی تھی۔ یہی حال ناصرہ کا تھا۔ دونوں بہنوں میں اک نامعلوم سا حجاب حائل ہوتا جا رہا تھا۔ اور یہ حجاب فطری تھا۔

فاخرہ تیار شدہ کپڑوں پر استری پھیر رہی تھی۔ اور ناصرہ انہیں ترتیب سے چمڑے کے صندوق میں رکھ رہی تھی۔

"کچھ چیزیں لانی ہیں بازار سے"۔ ناصرہ نے گوٹے والا سرخ جوڑا احتیاط سے صندوق میں رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا چیزیں باجی"۔ انگوری قمیض تہہ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے لکھ رکھی ہیں"۔

"شام کو لے آئیں گے"۔

"تم کسی کو ساتھ لے کر چلی جانا بازار"۔

"آپ نہیں جائیں گی"۔

"نہیں"۔

"کیوں"۔

"بس یونہی"۔ ناصرہ شرما کر بولی "تم ہی لے آنا۔ میں کیا جاؤں اب"۔

"اچھا"۔ کہہ کر وہ پھر کپڑوں پر استری پھیرنے لگی۔ اچھا خاصہ ڈھیر آ پڑا تھا ابھی۔

"تم تھک جاؤ گی فاخرہ۔ لاؤ اب میں کروں۔" ناصرہ نے پیار سے بہن کو دیکھا۔

"نہیں باجی ابھی سے تھک کہاں گئی ہوں"۔ وہ زنگالی غرارے پر احتیاط سے استری پھیرتے ہوئے بولی۔

ناصرہ دوپٹے کی کرن کو ٹھیک کرنے لگی۔ یہ سیٹ بڑا پیارا سا تھا۔ زنگالی رنگ پر سنہری سلمے اور چمکیلے موتیوں کا کام بڑا پیارا دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں بہنیں اپنے اپنے کام میں مشغول تھیں۔ کہ دروازے کا پردہ ہٹا کر ناہید اور شیریں اندر آ گئیں۔

"شکر ہے آپ کو بھی آنے کی فرصت ملی"۔ فاخرہ نے شکایتاً ناہید سے کہا...... دونوں بہنیں کئی دنوں سے ناہید کا انتظار کر رہی تھیں۔ کئی دفعہ بلا بھی بھیجا تھا...... لیکن وہ ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے نہ آئی تھی۔ اور آج صبح تو انہوں نے بڑی منت سے اسے بلا بھیجا تھا۔ انکار مناسب نہ تھا۔ اور پھر شیریں بھی جانے کے لئے مصر تھی۔ اس لئے دونوں آ گئیں۔

بیگم رحمان کا لگاؤ ناہید کے ساتھ تقریباً ختم ہی ہو چکا تھا۔ انہوں نے معمولی اور رسمی طور پر اس کا خیر مقدم کیا۔ بڑے ٹھنڈے لہجہ میں اس کا حال پوچھا۔ ناہید سب کچھ سمجھتی تھی۔ اور شیریں کو تو جیسے اس بجھے بجھے برتاؤ سے لطف آ رہا تھا۔ رشتہ دار عورتیں ناہید کے کافر ادا حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گئیں۔

فاخرہ نے ایک ہی سانس میں زمانے بھر کے گلے شکوے کر دیئے۔ ناہید مسکراتی رہی۔

"اب تو ہم شکل دیکھنے کو بھی ترس جاتے ہیں آپ کی"۔ ناصرہ نے کہا۔

"شکل دیکھنے کو تو ہم ترسا کریں گے"۔ ناہید نے شوخ نظروں سے ناصرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ناصرہ شرما گئی۔

ناہید اور شیریں بھی دونوں بہنوں کے قریب چھوٹے سے قالین پر بیٹھ گئیں۔

"لاؤ فاخرہ میں کپڑے استری کرتی ہوں" ناہید نے بڑھ کر فاخرہ کے ہاتھ سے استری لے لی۔ فاخرہ بھی تھک گئی تھی تھوڑی دیر سستانے کا موقع مل گیا شیریں کے ہاتھ میں سوئی دھاگہ دیتے ہوئے ناصرہ نے کاسنی دوپٹہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور سنہری لپکار کھ دیا تینوں چاروں کام میں مشغول تھیں۔ شیریں کی باتوں پر دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ ناھید بھی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی یہاں آنے سے اسکی طبیعت بڑی بہل گئی تھی۔ ورنہ گھر پہ تو جیسے اس پر اس دن سے ہنسی حرام ہو گئی تھی۔ جس دن سے منصور اس سے جدا ہوئے تھے دن رات سوچوں میں الجھتے گزر رہے تھے جذباتی کش مکش اور ذہنی خلجان نے اسے مضمحل کر دیا تھا منصور چار ماہ لندن گزار کر واپس آ چکے تھے۔ اور جدائی کا ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی آن پر مر مٹنے والی تھی۔ اندر ہی اندر یہ غم اسے کھائے جا رہا تھا۔ کسی کے سامنے دل کا غبار نکالنے کا خیال تک بھی نہ کیا تھا۔ شیریں اس کی بڑی قریبی دوست تھی۔ لیکن اس نے اپنے اور اس کے درمیان بھی رازداری کے پردے تان رکھے تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ پردے اتنے باریک تھے کہ شیریں کی تیز آنکھیں ان کے پار سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"دولہا بھائی کیسے ہیں" ناہید نے پوچھا۔

"بخیریت ہیں" شیریں نے جلدی سے جواب دیا۔ تینوں ہنسنے لگیں ناصرہ نے سر جھکا لیا۔

"میرا مطلب ہے شکل و صورت کیسی ہے" ناہید مسکراتے ہوئے بولی۔

"تصویر دکھاؤں حیران رہ جائیں گی دیکھ کر" فاخرہ بولی "ڈاردن کا مقولہ صحیح نظر آنے لگتا ہے ان کی تصویر دیکھ کر۔ گستاخی معاف باجی" وہ ہنستے ہوئے بولی شیریں اور ناہید نے بھی ہنسی میں اس کا ساتھ دیا۔

"تم لاؤ تو تصویر۔ ہم فیصلہ خود کریں گے" شیریں بولی۔

"کہاں رکھی ہے باجی۔ دولہا بھائی کی تصویر" فاخرہ نے ناصرہ کو چھیڑا۔ اور تصویر لینے چلی گئی۔

"دل کے آئینے میں" شیریں نے فی البدیہہ کہا۔

"بڑی شریر ہیں آپ" ناصرہ نے اک حجاب آلود نگاہ سب پر ڈالتے ہوئے کہا۔

فاخرہ لپک کر تصویر لے آئی۔ ناہید نے استری کا پلگ اتار دیا۔ پلگ اتارتے وقت کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی۔ اور وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ شیریں نے جھپٹ کر تصویر لے لی۔ سوئی دوپٹے کے ساتھ ٹانک کر وہ تنقیدی نظروں سے تصویر کو دیکھنے لگی۔ ناہید بھی تصویر پر جھک گئی۔

تصویر اک خوش رو نوجوان کی تھی۔

"دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے قدرے بڑی ہے" شیریں نے ہنستے ہوئے تنقید کی۔

"بڑی باتیں آتی ہیں تمہیں شیریں" ناہید نے اسے ٹوکا۔

"لو تم خود ہی دیکھ لو۔ اچھا ناصرہ تم دیکھو اور انصاف کرو" شیریں نے تصویر ناصرہ کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔ ناصرہ جو تنہائی میں جانے کتنی بار تصویر کو ہر زاویئے سے دیکھ چکی تھی۔ شیریں کی بات پر شرما گئی۔

چار الھڑ جوانیاں ہنسی کھیل میں مشغول تھیں کہ خلیق کمرے میں آ گیا۔ سب سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ اس

کے ہاتھ میں کاغذ اور پنسل تھی۔ کسی ضروری بات کے متعلق ناصرہ سے کچھ پوچھنا تھا اسے یہ تو اک بہانہ تھا اندر آنے کا۔ ناہید کی منگنی کے بارے میں جب سے سنا تھا اس کے حصول کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے دیدار جمال رخ زیبا کی ہمیشہ کے لئے نہ سہی گھڑی بھر کے لئے ہی سہی کی تمنا کو دل سے نہ نکال سکا۔ شیریں نے ذو معنی نظروں سے ناہید کو دیکھا۔ ناہید کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ کچھ تو خلیق کے بے محابہ اندر آنے کا غصہ تھا۔ اور کچھ شیریں کی شرارت آمیز نظر کا۔ ناصرہ ناہید کی بیزاری سمجھ گئی۔ اور جلدی جلدی خلیق کی باتوں کا جواب دے کر اسے واپس بھیجنا چاہا۔ لیکن وہ تو جیسے چپک ہی گیا کھڑکی کے ساتھ شیریں نے چپکے سے ناہید کے بازو میں چٹکی لی۔ وہ تلملا کر رہ گئی۔ مصلحت خاموشی ہی میں تھی۔

"آپ کو کس نے بلاوا بھیجا تھا خلیق ماموں" فاخرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا بلاوا" وہ حیران ہو کر بولا۔

"آپ جو اس بے تکلفی سے تشریف لے آئے۔"

"میرا آنا جرم ہے" وہ جیسے ناہید سے پوچھ رہا تھا۔

"قطعی جرم" فاخرہ بولی "تشریف لے جایئے۔ ورنہ چالان ہو جائے گا۔" خلیق ڈھٹائی سے ہنستا ہوا ناہید پر وداعی نظریں ڈالتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ چھیڑ چھاڑ پھر شروع ہو گئی۔ ناہید کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ اس ہنسی مذاق میں پوری طرح حصہ نہ لے سکی۔

چائے چاروں نے وہیں قالین پر پی۔ اس اثناء میں ناہید سارے کپڑے استری کر چکی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں شیریں چٹ پٹے سے قصے سناتی رہی۔ فاخرہ الٹی سیدھی باتوں سے سب کو ہنساتی رہی۔

"چلو شیریں" ناہید نے کہا "تم تو ایسے بیٹھی ہو۔ جیسے واپس جانا ہی نہیں۔"

"کہاں جانا ہے آپ کو" ناصرہ نے پوچھا۔

"گھر" سادگی سے جواب دیا گیا۔

"کیا کہنے" فاخرہ آنکھیں نچاتے ہوئے بولی "اب آپ کو جانے تھوڑا ہی دیں گے۔ چند دن باقی ہیں۔ اتنے دن تو یہیں رہیں گی آپ۔ خدا خدا کر کے آئی ہیں۔ اب واپس جانے کی بھی رٹ لگا دی۔"

"ٹھیک ہے ناہید" شیریں بظاہر سادگی سے لیکن دل ہی دل میں ناہید کی چڑ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔ "سات آٹھ دن تو رہ گئے ہیں۔ اللہ قسم مجھے چھٹیاں ہوتیں۔ تو میں یہاں سے ایک منٹ کے لئے نہ ہلتی۔ تم تو ویسے بھی چھٹی پر ہو۔ گھر اکیلی کیا کرو گی۔ یہاں اچھی رہو گی"۔

ناہید نے گھبرائی ہوئی نظروں سے شیریں کو دیکھا۔ وہ یہاں ایک گھنٹہ بھی رکنے کی روادار نہ تھی۔ خاص کر خلیق کی موجودگی میں تو وہ یہاں سانس لینا بھی نہ چاہتی تھی۔ وہ بہانے کے لئے موزوں الفاظ سوچنے لگی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اچھا مجھے تو اجازت دو" شیریں اٹھتے ہوئے بولی۔

"رات کو چلی جایئے گا" فاخرہ نے کہا۔ ناہید بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں پھر آجاؤں گی۔ ابھی مجھے بھی جانے دو" اس نے ملتجی انداز میں کہا۔

لیکن ناصرہ اور فاخرہ نے ایسی ضد پکڑی۔ کہ اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ شیریں شرارت سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"بھئی ناصرہ کے پاس دو ایک سہیلیوں کا رہنا ضروری ہے۔ اور ناہید آج تم اس کے پاس رہو گی تو کل کو تمہارا وقت آئے گا۔ تو وہ تمہارا ساتھ دے گی۔"

شیریں کی باتیں ناہید کو تیر کی طرح لگیں۔

"ہم تو آپ کی شادی پر بن بلائے ہی پہنچ جائیں گے" فاخرہ بولی "اللہ قسم میں تو مہینہ بھر رہونگی آپ کے پاس۔"

ناہید بظاہر مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا۔

"کب تک آرہے ہیں ان کے وہ" ناصرہ نے شیریں سے پوچھا۔

"آبھی گئے" شیریں نے ایک دم جواب دے کر ناہید کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اور وہ کھا جانے والی نظروں سے شیریں کو گھور رہی تھی۔

"کب آئے ہمیں تو کچھ پتہ ہی نہیں" فاخرہ بولی۔

"یہی کوئی" شیریں ناہید کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "کوئی۔ کوئی میرے خیال میں پندرہ دن ہوئے ہیں۔ کیوں ناہید"

منصور کو لوٹے پورے پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اور شیریں درپردہ ناہید کو انہیں کے بارے میں کہہ کر تنگ کر رہی تھی۔

"پھر تو ان کی شادی بھی قریب ہی ہوئی" ناصرہ نے کہا۔

"بالکل" وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ ناہید دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

برآمدے میں ڈاکٹر رحمان کی آواز آئی۔ لڑکیاں چپ ہو گئیں۔ ناہید نے موقع غنیمت جانا۔ اور انہیں سلام کرنے کے بہانے جلدی سے باہر نکل گئی۔

ڈاکٹر نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے خلوص میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

"اب تو کبھی نظر ہی نہیں آتی بیٹا۔ بہت کام ہو گیا ہے دفتر میں۔"

"جی نہیں۔ کام تو کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔"

"کچھ کمزور نظر آرہی ہو"

"پچھلے دنوں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی" اس نے تعظیماً کہا "اب اچھی ہوں......"

"مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں" ڈاکٹر بولا "بھئی تکلف نہ کیا کرو۔ جب کوئی تکلیف ہو۔ یا تو خود آجایا کرو۔ یا اطلاع کر دیا کرو۔ میں آکر دیکھ جایا کروں گا۔"

"شکریہ" وہ مسکرا کر بولی۔ پھر ڈاکٹر اس کی دفتری زندگی کے متعلق پوچھتا رہا۔ شیریں بھی آگئی۔ وہ گھر جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کو سلام کیا۔

"اباجان" فاخرہ بولی "یہ بھی گھر جانا چاہتی ہیں۔ اب شادی میں دن ہی کون سے رہ گئے ہیں۔ انہیں کہئے نا اتنے دن یہیں رہیں۔ دفتر سے بھی چھٹی پر ہیں۔"

"نہیں بیٹا" ڈاکٹر بڑی اپنائیت سے بولا "اب کون جانے دے گا۔ بہن کی شادی ہے۔ جا بھی کیسے سکتی ہیں۔"

ناہید مرعوب ہو گئی۔ ڈاکٹر کے احسانوں نے ایک بار پھر اسے رک جانے پر مجبور کیا۔ شیریں چلی گئی۔ اور وہ خوش دکھائی دینے کی کوشش کرتی ہوئی واپس آگئی...... ناصرہ کو اس کے رک جانے سے بڑی خوشی ہوئی۔

شام ہو رہی تھی۔ فاخرہ ناصرہ کی مطلوبہ چیزیں لانے کے لئے بازار جانے لگی۔

"آپ چلیئے میرے ساتھ" ۔ اس نے ناہید سے کہا "باجی کی کچھ چیزیں لانا ہیں ۔ ادھر ہی سے آپ کے ہاں جائیں گے۔ آپ اپنے کپڑے بھی لے آیئے گا" ۔ تجویز معقول تھی۔ ناہید نے اس سے اتفاق کیا۔

دونوں بازار جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ ناصرہ نے چیزیں لکھوا دیں..... اور فاخرہ ماں سے پیسے لینے چلی گئی۔ اور جب وہ پیسے لے کر آئی تو ناصرہ نے پوچھا۔

"جاؤ گی کیسے موٹر تو اباجان لے گئے ہیں" ۔

"بس سے چلے جائیں گے۔ آتی دفعہ تانگہ پکڑ لیں گے" ۔

یہیں سے واپسی کا تانگہ لے لو۔ آتے آتے رات ہو جائے گی۔ اور پھر تم نے ہوسٹل بھی تو جانا ہے" ۔

"یہی ٹھیک ہے تانگہ یہیں سے لے لیتے ہیں۔ زیادہ اچھا رہے گا" ۔

ناہید نے بھی دونوں بہنوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

دونوں برآمدے میں آگئیں۔ سامنے سے بیگم رحمان کپڑوں کا ایک بڑا سا بنڈل اٹھائے ہانپتی چلی آرہی تھیں۔ ناہید نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے بنڈل پکڑ لیا بیگم رحمان کا سانس پھول رہا تھا۔

"کہاں رکھوں انہیں" ۔ ناہید نے پوچھا۔

"ناصرہ کو دینے جا رہی تھی۔ میرا تو سانس ہی پھول جاتا ہے۔ دو قدم کوئی چیز اٹھا کر نہیں چلا جاتا" ۔ وہ

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ابھی تک ہانپ رہی تھی۔

ناہید ناصرہ کو کپڑے دے کر آئی تو بیگم رحمان کہہ رہی تھی۔

"اس وقت اکیلی نہیں جاؤ فاخرہ"۔

"ناہید جو ساتھ ہیں امی"۔

"ناہید بھی تو لڑکی ہے۔ کوئی مرد تھوڑا ہی ہے"۔

"شام ہو رہی ہے آپا"۔ رئیسہ خالہ چک اٹھا کر باہر آگئی ۔ یہ ابھی بچیاں ہیں زمانے کی ہوا کو کیا جانیں۔ خلیق کے ساتھ چلی جائیں۔ وہ بھی بازار جا رہا ہے"۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہے ذرا بلانا تو اسے" بیگم رحمان نے رئیسہ سے کہا۔ خلیق تو جیسے تاک ہی میں تھا۔ جھٹ سے آواز سنتے ہی باہر نکل آیا۔

"تم بازار جا رہے ہو نا خلیق" بیگم رحمان بولی۔

"جی ہاں" خلیق نے جواب دیا "آرائش گھر سے کچھ چیزیں خریدنی ہیں"۔

"یہ بھی تو وہیں جا رہی ہیں" بیگم رحمان نے کہا "اکٹھے ہی چلے جاؤ"۔

"بہت بہتر" خلیق ناہید کے ساتھ جانے کے خیال سے جھومتے ہوئے بولا ناہید کا جی چاہا کہ جانے سے انکار کر دے۔ لیکن مجبور تھی۔ خاموشی ہی رہ گئی۔

خلیق خوشی خوشی اور ناہید با دل نخواستہ فاخرہ کے ساتھ چل دیئے...... بیگم رحمان اور رئیسہ خالہ انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔ رئیسہ خالہ نے بھی ناہید کے متعلق سب کچھ سنا تھا۔ اور کل جب سے اسے دیکھا تھا۔ خلیق کی محرومی پر اسے بڑا افسوس آرہا تھا۔

آرائش گھر بازار کی سب سے بڑی دوکان تھی۔ متمول طبقے کی زندگی کی آسائش اور آرائش کے سارے سامان وہاں سے مل سکتے تھے۔ بڑی بڑی لمبی شیشے کی الماریاں اور چمکتے ہوئے کاؤنٹر گاہک کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے اور وہ بہت کچھ بلا ضرورت بھی خریدنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

ناہید لکھی ہوئی چیزیں بتا رہی تھی۔ سیل مین بڑے ادب سے مطلوبہ اشیاء نکال کر کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔ فاخرہ چیزوں کی قیمتوں کے متعلق استفسار کر رہی تھی اور خلیق ناہید کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہونے کا موقع دیکھ رہا تھا۔ ناہید کو اس کا یوں قریب قریب کھڑے ہونا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے دوپٹے کو اپنے شانوں پر لپیٹ رہی تھی۔

"لپ اسٹک کا یہ رنگ کیسا رہے گا" فاخرہ نے سیاہی مائل سرخ رنگ کی لپ اسٹک ناہید کو دکھائی۔

"مجھے اس معاملے میں کورا ہی سمجھو"۔ ناہید نے آہستہ سے کہا "ان لوازمات کے خریدنے کا کبھی اتفاق

نہیں ہوا"۔

"ماشاءاللہ آپ کو ان کی ضرورت بھی کیا ہے"۔ خلیق نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ناہید کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔

"تم چیزیں پیک کراؤ فاخرہ" کہتے ہوئے وہ باہر تانگے میں آبیٹھی۔

تھوڑی دیر بعد خلیق چھوٹے بڑے کئی بنڈل اٹھائے باہر آگیا۔ ناہید کے پاس پچھلی سیٹ پر اس نے لفافے تھیلے اور بنڈل رکھ دیئے۔ ایک گول سا پیکٹ لڑھک کر ناہید کے قدموں میں آگرا۔ خلیق جلدی سے جھکا اور پیکٹ اٹھا کر سیٹ پر رکھا۔ لیکن ٹھوکر لگنے سے دو تین پیکٹ اور ناہید کے قدموں کے قریب آگرے۔ خلیق بوکھلا گیا۔ جلدی سے پیکٹ اوپر رکھے۔ دباؤ سے ایک نیچے کا پیکٹ پھر لڑھک کر گر گیا۔ وہ سٹ پٹا گیا۔ اور کھسیانہ ہو کر ناہید کے پیروں کے قریب پڑا ہوا پیکٹ اٹھانے کیلئے جھک گیا۔

ناہید کو جانے کیوں اس کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آگئی۔ خلیق جھکا ہوا تھا۔ اور ناہید کے ہونٹوں پر ہنسی مچل رہی تھی۔

ہارن کی تیز آواز پر گھوڑی اچھلی اور ناہید نے چونک کر دیکھا۔

چمکیلی موٹر کے شفاف شیشوں کے پیچھے سے دو آنکھیں اسے گھور رہی تھیں روشن اور حسین آنکھیں جن میں طنز کا انداز اس نقطے پر پہنچا ہوا تھا۔ کہ اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ موٹر لمحہ بھر کے لئے رکی۔ اور پھر بڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔

کار میں منصور تھے...... ناہید کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ انہیں آئے تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے۔ ناہید چھٹی پر تھی۔ اس لئے انہیں ملنے یا دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ آج سر راہ انہیں دیکھا بھی تو یوں کہ ناہید اپنی نظروں میں چور سی ہو گئی۔ موٹر کا یوں ہارن دے کر نکل جانا ایسے تھا۔ جیسے کسی کے کردہ گناہوں کو جتلا کر ستر پوشی کر دی جائے۔

ناہید کو خلیق کی سراسیمگی پر ہنسی آئی تھی۔ خلیق اس کے قدموں میں جھکا ہوا تھا ایسی حالت میں منصور نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ناہید نے چاہا کہ اس معمولی سے واقعے کو کوئی اہمیت نہ دے۔ لیکن وہ چبھتی ہوئی نظریں بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔ طنز میں بجھے ہوئے تیر چلا گئی تھیں۔ جو اس کے دل میں پیوست ہو گئے تھے۔

اس نے بہتیرا اس واقعے کو نظر انداز کرنا چاہا۔ اپنے دماغ سے اس کا خیال ہٹانا چاہا۔ اس کا اب منصور سے تعلق ہی کیا رہ گیا تھا...... واسطہ ہی کیا تھا۔

بظاہر دونوں لاتعلق تھے۔ لیکن وہ لاتعلقیاں مل کر ایک ایسا تعلق بن چکی تھیں جس سے انحراف ایک مسلم حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف تھا۔ اور یہ اسی تعلق کا واسطہ تھا۔ کہ ناہید آج منصور کی گھورتی ہوئی نظروں کی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے گھبرا گئی تھی۔

منصور سے اس کے تعلقات ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن دونوں کی روحیں جن بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ انہیں کوئی نہ توڑ سکا تھا۔ منصور چار ماہ ولایت رہ آئے تھے اور ناہید کا دل باوجود دماغ کی پرزور استدلال کے لحہ بھر کے لئے بھی ان کی یاد سے غافل نہ ہوا تھا۔ وہ اس کے دل کے اتنے ہی قریب تھے جتنے شروع سے تھے وہ نہ اپنے مقام سے ہٹے تھے۔ اور نہ ہی اس نے ہٹانے کی فضول سعی کی تھی۔

اور آج وہ یہ تو نہ جان سکی۔ کہ ہوا کیا ہے۔ پر اتنا سمجھ گئی کہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ اور یہ ہُوا ہوا بن کر اس کے اعصاب پر مسلط ہو گیا۔

راستہ بھر فاخرہ اور خلیق چیزوں کے متعلق باتیں کرتے آئے۔ ناہید گم سم سی اپنے خیالات ہی میں کھوئی رہی۔ اس کا چہرہ اس کے دوپٹے ہی کی طرح زرد تھا۔

۱۴

منصور لندن سے واپس آ گئے۔ دل پریشان کو بہلانے گئے تھے۔ لیکن اس کا رہا سہا سکون بھی لٹا کر لوٹے تھے۔ ان کے آنے سے قصر رعنا کی سوئی ہوئی رونقیں جاگ اٹھیں۔ دوست احباب اور ملنے جلنے والوں کا تانتا سا لگ گیا۔ لیکن منصور کے دل ویران میں بہار نہ آ سکی۔ انہوں نے اپنی بیکل طبیعت کا نفسیاتی علاج شروع کیا۔ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے لگے۔ بڑی بڑی دعوتیں دیں۔ رقص و سرود کی محفلیں منعقد کیں۔ مشاعرے کروائے۔ لیکن طبیعت سنبھلنے کی بجائے الجھتی گئی۔ انہوں نے باقاعدگی سے کلب جانا شروع کر دیا۔

لیکن جلد ہی کلب کی مصنوعی اور کھوکھلی زندگی سے جی بھر گیا انہوں نے ایک دم کلب جانا موقوف کر دیا۔

شمسہ نے ایک بار پھر سہارا دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اس کے ساتھ ناہید سے ناچاقی کی خونیں یاد وابستہ تھی۔ منصور کے لہجے کی خنکی اور ان کے برتاؤ کی ٹھنڈک نے شمسہ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ آج کل ویسے بھی نواب غزالی کی منظور نظر تھی۔ اور مستقبل قریب میں شادی بھی کرنے والی تھی۔ اس لئے وہ اپنا وقت ضائع نہ کر سکی۔ از راہ ہمدردی اس نے منصور کو بہلانا چاہا تھا۔ لیکن انہیں اس کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔

کلب جانا موقوف کرنے کے بعد انہوں نے دوستوں سے بھی زیادہ ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ زیادہ تر تنہا ہی رہتے۔ اور یہ تنہائی ان کی صحت کے لئے مضر ثابت ہو رہی تھی اپنے گھر میں وہ اجنبیت محسوس کرنے لگے۔ یاسمین اور ان کے بچوں کا خیال آتے ہی وہ ناظم آباد پہنچ گئے۔

یاسمین کا کلیجہ انہیں دیکھ کر دھک رہ گیا۔ ان کی گرتی ہوئی صحت۔ ان کی سیاہی مائل زرد رنگت دیکھ کر وہ گھبرا گئیں۔ منصور جب بھی سفر یورپ سے واپس آتے تھے ان کی صحت قابل رشک ہوا کرتی تھی۔ رنگت میں اک خاص چمک آ جایا کرتی تھی۔ لیکن اب کے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ چار ماہ یورپ کی سیاحت میں گزار کر نہیں آئے بلکہ کہیں دھوئیں کی زد میں بیٹھے رہے ہیں۔

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تمہیں کیا ہو گیا منصور؟ بیمار رہے ہو کیا؟ کتنے کمزور ہو رہے ہو۔ رنگ کیسا خراب ہو رہا ہے"۔ یاسمین ایک ہی سانس میں کئی باتیں کہہ گئیں۔ اور منصور ننھے شاہین کو گود میں لئے بیٹھے رہے۔ جواب توتلی زبان میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہوا بڑا ہی پیارا لگتا تھا۔

"کمزور تو بہت ہو رہے ہو منصور۔ بیمار تو نہیں رہے"۔ نواب صدیق نے بھی انہیں دیکھ کر یہی کہا۔ یاسمین کی بڑی بیوہ نند بھی منصور کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ منصور انہیں اپنے بچوں ہی کی طرح عزیز تھے۔

"میں تو دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔ پہچانے ہی نہیں جاتے"۔ وہ بولیں منصور کو اس رٹے پٹے موضوع سے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔

"اچھا بھلا تو ہوں"۔ وہ گول مٹول شاہین کے سرخ سرخ گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے مسکرائے۔

"خاک اچھے بھلے ہو۔ میرا تو دل بیٹھ رہا ہے تمہیں دیکھ کر"۔ یاسمین جل کر بولیں۔

"آپ تو یونہی پریشان ہو رہی ہیں باجی وہم کی بھی حد ہوتی ہے کوئی"۔ منصور بولے۔

"وہم تو نہیں منصور" نواب صدیق بولے "صحت تو تمہاری گر گئی ہے۔ یاسمین ذرا کمزور دل واقع ہوئی ہیں۔ اس لئے زیادہ اثر لیا ہے"۔

یاسمین بڑی ہی پریشان ہو رہی تھیں۔ منصور ان کے عزیز ترین بھائی تھے۔ ہمدرد و مونس و غمگسار بھائی۔ جن کے لئے ان کے دل میں دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی محبت تھی۔

دو تین دن منصور یاسمین کے بچوں سے کھیل کر ہنس کر خوش ہو کر وقت گزارتے رہے۔ لیکن یہ حیلہ بھی کارگر نظر نہ آیا۔ وہ اکتا گئے۔ اور واپسی کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ یاسمین تو ان کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ منصور خاموشی سے ان کی میٹھی میٹھی ڈانٹ سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئیں۔ تو پھر بولے۔

"کسی دن پھر آ جاؤں گا باجی۔ آپ کو معلوم تو ہے ہی اتنا عرصہ غیر حاضر رہا ہوں بے شمار کام پڑے ہیں"۔

"جہنم میں گئے تمہارے کام صحت کی طرف تو دھیان نہیں کاموں کی پڑی ہے"۔ لیکن منصور اپنی بات پر اڑے رہے۔ ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ اور وہ جلد از جلد قصر رعنا پہنچ جانے کیلئے بے تاب ہو رہے تھے۔ طبیعت کے یوں اچاٹ ہو جانے پر وہ خود بھی حیران تھے۔ لیکن کر کیا سکتے تھے۔ مجبور تھے۔ اک دل نادان کے ہاتھوں۔

"میں آج ہی جانا چاہتا ہوں باجی"۔ انہوں نے بڑے اصرار سے کہا۔

اور جب نواب صدیق یاسمین اور ان کی نند کے کہنے کے باوجود بھی انہوں نے جانے کا ارادہ ہی ظاہر کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

"صبح چلے جانا۔ آج شام میں نے جرمن ڈاکٹر مری کو بلایا ہے"۔ یاسمین نے بالآخر کہا "تمہارا طبی معائنہ

ہونا بڑا ضروری ہے"۔

"وہ کیوں"...... منصور حیران سے یاسمین کو دیکھنے لگے۔ لیکن یاسمین کی ضد تھی کہ وہ منصور کو ڈاکٹر کو دکھائیں گی۔ ان کی ضد کے سامنے منصور کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور روانگی صبح پر ملتوی کر دی گئی۔

ڈاکٹر آیا۔ نبضیں ٹٹولیں۔ سینے کا زیر و بم دیکھا۔ سانسیں گنیں۔ آلات کی مدد سے خون کا دباؤ دیکھا۔ کوئی خاص بیماری نہ تشخیص کر سکا۔ محض کمزوری بتائی۔ ٹانک لکھے انجکشن بتائے۔ غذا کی فہرست مرتب کی۔ فیس لی اور چل دیا۔ یہی وہ کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر دل کی دھڑکنیں گن سکتا تھا۔ ان دھڑکنوں میں تہہ و بالا ہوتی ہوئی دنیا اسے کہاں نظر آ سکتی تھی۔ وہ سینے کا اتار چڑھاؤ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس چھاتی میں سلگتے ہوئے آتش فشاں کی تپش تو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

یاسمین کو ڈاکٹر کی تسلی بخش رپورٹ کا یقین نہ آیا۔ ان کا دل مطمئن نہ ہو سکا۔ کوئی ان کا دل اندر ہی اندر مسل رہا تھا۔ منصور ان کے میکے کا سہارا تھے۔ اور جانے کیوں انہیں یہ سہارا ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ دل آنے والے خدشات سے لرز رہا تھا۔ منصور کے چلے جانے کے بعد ان کا دل بھر آیا۔ اور وہ بڑی دیر تک بے قرار سے روتی رہیں شوہر اور نند کی تسلیاں صبر و ضبط کے ٹوٹے ہوئے بند جوڑ نہ سکیں۔

منصور واپس سلطان پور آ گئے۔ سارا سارا دن موٹر لئے سلطان پور کی سڑکوں پر بے معنی گھومتے پھرتے جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش ہو۔ انہوں نے دل کو سمجھانا چاہا۔ لیکن وہ کہاں مانتا تھا۔ وہ تو کھڑ اور ضدی بچے کی طرح اسی کھلونے کیلئے مچلا ہوا تھا جسے وہ پسند کر چکا تھا۔ اس کے بدلے میں قیمتی سے قیمتی اور اعلیٰ سے اعلیٰ کھلونے اس کی نظروں میں ہیچ تھے۔

شام ہو رہی تھی۔ منصور حسب سابق موٹر لئے بے مقصد سڑکوں کی لمبائیاں ماپ رہے تھے۔ جانے کیا خیال آیا۔ موٹر کا رخ آبادی کی طرف پھیر دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سلطان پور کے گنجان آباد بازار سے گزر رہے تھے آرائش گھر کے باہر تانگے میں بیٹھی ہوئی ناہید نظر آ گئی۔ ان کا دل زور سے اچھلا۔ روح ہمک کر اس کی طرف جھکی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے بارود کو کسی نے آگ دکھا دی۔

ناہید ہلکے زرد رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔ اور اس کے چہرے پر تبسم رقصاں تھا۔ اس کے قدموں کے قریب ایک نوجوان جھکا ہوا تھا۔ اس قدر قریب کہ منصور سے برداشت نہ ہو سکا۔ غیر اختیارانہ طور پر ان کا ہاتھ ہارن پر گیا۔ ہارن کی تیز آواز ناہید کی نظریں ان کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اور پھر وہ تیزی سے آگے نکل گئے۔

وہ نوجوان کون تھا............ یہ سوچنے کی نہ تو انہیں ضرورت تھی۔ نہ فرصت انہیں تو ناہید کے انکار کی وجہ مجسم نظر آ گئی تھی۔ ان کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عرصے سے سلگتی ہوئی گیلی لکڑیاں اپنی تپش سے ہی سوکھ گئی تھیں۔ اور اب اک پھونک سے ہی اس تیزی سے جل اٹھیں کہ ان سے اٹھتے ہوئے شعلوں کی لپک سے ساری عمارت کے جل جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔

سورج غروب ہوچکا تھا۔ دھندلکے گہرے ہو گئے تھے۔ منصور کی موٹر کچے راستے سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی اور وہ دریائے سطیر کے کنارے اسی جگہ پر بیٹھے تھے۔ جو جگہ انہوں نے اپنا متاع حیات ناہید کے قدموں میں ڈالنے کے لئے منتخب کی تھی اور شومئی تقدیر سے وہ جگہ ان کی محبت کا مدفن بن گئی تھی۔ وہ بڑی حسرت سے اس پتھر کو دیکھتے رہے۔ جہاں ناہید آکر بیٹھی تھی۔ ان پر کچھ ایسی رقت طاری ہو گئی۔ جیسی قبرستان میں کسی نئی قبر کو دیکھ کر ہو جاتی ہے۔

ان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور سینے کی جلن سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ کچھ خیال آگیا۔ بوٹ اتارے۔ اور پاؤں دریا کے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیئے۔ دل بوجھل تھا۔ دماغ بھاری تھا۔ سانس سینے میں سما نہیں رہا تھا۔ اور وہ ٹھنڈے پانی میں پاؤں لٹکائے دیر تک بیٹھے رہے۔ گہری رات ہو رہی تھی۔ جب وہ اٹھ کر موٹر کے قریب آئے۔ کار سٹارٹ کرنے ہی والے تھے۔ کہ اک چکر سا آگیا۔ سٹیرنگ پر سر رکھے جانے کب تک پڑے رہے۔

رات کے دس بجے وہ کرسی پر بمشکل بیٹھے تھے اور شمو قدموں پر جھکا ہوا بوٹوں کے تسمے کھول رہا تھا۔ پیر بھٹی میں جلتے ہوئے لوہے کی طرح گرم تھے۔

"سرکار" شمو پیروں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے شمو" منصور نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کہیں دشمنوں کو بخار تو نہیں ہو گیا" اس کا لہجہ گھبرایا ہوا تھا۔

"ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے" انہوں نے آنکھیں بند کر کے سر گدے دار کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔

"نہیں سرکار آپ پہلے بھی کمزور ہیں" ۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ اسے اپنے مالک سے بے انتہا محبت تھی۔ اور مالک کا رویہ بھی اس کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا تھا۔ لیکن جب سے بقول اس کے آقا کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ ان سے بڑا ڈرنے لگا تھا۔

"شمو" منصور نے کہا ان کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔

جی سرکار" ۔ وہ فوراً لے بوٹ پیروں میں پہناتے ہوئے بولا۔

"میرا لباس تبدیل کراؤ نیند آرہی ہے" ۔ ان کی آواز بوجھل تھی۔

شمو نے حکم کی تعمیل کی لباس تبدیل کراتے وقت اس نے منصور کے جلتے ہوئے جسم سے بخار کا اندازہ کیا۔

سانس کی تیزی بھی بخار کی مظہر تھی۔ اور سرخ انگارہ سی آنکھیں دیکھ کر تو وہ بے حد گھبرا رہا تھا۔ لباس شب خوابی پہنا کر وہ سہارا دے کر منصور کو مسہری تک لے آیا۔ جہاں وہ گرتے ہی بے سدھ ہو گئے۔ نیند کا غلبہ تھا۔ کہ بخار کی بے ہوشی شمو نے جلدی سے ہلکی سبز رنگ کی ریشمی رضائی ان کے سینے تک سرکا دی۔ اور جلدی سے باہر آگیا۔

دم بھر میں منصور کی علالت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے محل میں پھیل گئی۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ ڈاکٹر کے ساتھ ہی اعجاز بھی پہنچ گیا۔ بخار کافی تیز تھا۔ ڈاکٹر ہراساں نظروں سے تھرمامیٹر دیکھ رہا تھا۔ تھرمامیٹر میز پر رکھ کر وہ اسٹیتھو سکوپ لے کر ان پر جھک گیا۔ بڑی دیر تک وہ اس ڈاکٹری آلے سے سینے کا اتار چڑھاؤ اور سانس کی آمدورفت دیکھتا رہا۔

"ٹھنڈ لگ گئی ہے" ۔ وہ اعجاز احمد کو مخاطب کر کے بولا۔

"جانے کیا ہو گیا ہے سرکار کو" شمو دردانگیز آواز میں بولا "جب سے ولائت سے لوٹے ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہی نہیں رہتی" ۔

"بڑے کمزور ہو رہے تھے" ۔ اعجاز بولا "پہلے تو جب انگلینڈ سے واپس آتے تھے۔ بڑی صحت ہوا کرتی تھی" ۔

"رات جب واپس آئے تو بڑا تیز بخار تھا۔ کپڑے بھی تو ہلکے سے پہن رکھے تھے۔ سردی تو کافی ہو رہی ہے آج کل "شمو تاسف سے" دونوں ہاتھ مل رہا تھا۔ ڈاکٹر بازو پر جھکا ہوا انجکشن دے رہا تھا۔ اور اعجاز پائنتی کی طرف کھڑا ان کے سرخ اور تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

منصور خاموش پڑے تھے۔ جانے بخار ہی تیز تھا۔ یا ان سب کی موجودگی بار خاطر تھی۔ ڈاکٹر ضروری ہدایات دے کر چلا گیا۔ کچھ دیر رک کر اعجاز بھی شمو اور دیگر نوکروں کو احتیاط کی تاکید کرتا ہوا واپس ہو گیا۔ محل کے افراد ان کے کمرے کے گرد جمع تھے دور پار کی خالائیں اپنے عزیز بھانجے کے لئے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ شمو نے بتایا کہ سرکار سو رہے ہیں۔ اس لئے سب حرم سرا کی طرف چلے گئے۔ سب ملازم بھی اپنی اپنی جگہ چلے گئے۔ شمو ابھی تک ان کی خواب گاہ میں تھا۔ اور مسہری کے باریک پردوں سے آقا کو بڑی پریشانی سے دیکھتے ہوئے مضطربانہ ادھر ادھر پھر رہا تھا۔

"شمو" منصور نے اسے پکارا۔

"جی سرکار" وہ ان کے قریب آگیا۔

"تم ابھی یہیں پھر رہے ہو۔ جاؤ سو جاؤ............رات کافی گزر چکی ہو گی" ۔

"مجھے نیند نہیں آرہی سرکار۔ جب سونا ہو گا۔ چلا جاؤں گا" ۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"پگلے کب تک جاگتے رہو گے جاؤ"۔

لیکن وہ نہیں گیا۔ منع کرنے کے باوجود مسہری کے قریب دبیز قالین پر ایک کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند نہ آنا تھی۔ نہ آئی وہ بار بار سر اٹھا کر منصور کو دیکھ رہا تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں مالک کمرے سے چلے جانے کا حکم نہ دے دیں۔ اٹھنے کی جرأت نہ کرسکا۔

رات گزر گئی۔ دن نکلا۔ ڈاکٹر آیا...... بخار کم ہونے کی بجائے۔ اور تیز ہو گیا منصور کا پیکر آگ کی لپیٹ میں آکر جل رہا تھا۔ شہر کے چوٹی کے ڈاکٹر ہر جتن کر ہارے لیکن یہ آگ بجھ نہ سکی۔ بھڑکتی گئی۔ تیسرے دن تو سب گھبرا گئے۔ حالت تشو یشنا ک ہو گئی۔ محل کے سارے افراد اور خاص کر حسنہ کی والدہ تو ان پر تصدق ہو رہی تھیں۔ وہ ان کے دکھ درد کے شریک تھے۔ ان کی بیوگی کے دن انہیں کے سر پر کٹ رہے تھے۔ وہ بار بار قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر ان پر پھونک رہی تھیں۔ محل کے سارے خدام ان کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ملنے جلنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا دوست احباب بھی گھبرا گئے تھے۔ یاسمین کو بھی ان کی بیماری کی اطلاع کر دی گئی۔

اور جب نواب صدیق یہ خبر بد لے کر اندر آئے۔ تو ان کی بہن ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر سہم گئیں۔ بیماری کی اطلاع پاتے ہی سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

"میں تو اسی دن سمجھ گئی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا۔ کہ کچھ ہونے والا ہے۔ خدا ہر آفت سے بچائے۔ جوانی نصیب ہو"۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

بغلی کمرے کا پردہ اٹھا کر یاسمین آگئیں۔ کیا ہوا۔ وہ گھبرا کر بولیں۔

"منصور بیمار ہیں"۔ نواب صدیق نے کہا۔ کچھ چھپانا فضول تھا۔

"منصور" وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ سر گھومنے لگا۔ دل پہلے ہی غوطے کھا رہا تھا۔ ایک دم جیسے ڈوب ہی گیا۔ نواب صدیق نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ اور بہن کے قریب مسند پر گاؤ تکیئے کے سہارے بٹھا دیا۔

"معمولی بخار ہے یاسمین.......... تم بڑی جلدی گھبرا جاتی ہو"۔ نواب صدیق نے ان کی تسلی کے لئے کہا لیکن ان کا دل کانپ کانپ کر کہہ رہا تھا کہ بات معمولی نہیں۔

"دل تھوڑا نہ کرو یاسمین" ان کی نند آنسو پونچھتے ہوئے بولیں "خدا رحم کرنے والا ہے۔ تم نے حوصلہ ہار دیا تو منصور پر برا اثر پڑے گا۔ جلدی سے تیاری کر لو.......... شام تک پہنچ جاؤ تو اچھا ہے"۔

"شاید ہوائی جہاز سے بندوبست ہو جائے" نواب صدیق بولے۔

"یہ تو اور بھی اچھا رہے گا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

یاسمین کی آنکھیں دریا بہا رہی تھیں۔

دوپہر کے دو بجے نواب صدیق اور یاسمین سلطان پور کے ہوائی اڈے سے قصرِ رعنا سے آئی ہوئی موٹر پر سوار ہو رہے تھے۔ سفید وردی اور سنہری صافے والا ڈرائیور کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خاموش تھا۔ راستے میں نواب صدیق اور یاسمین نے اس سے لاتعداد سوال پوچھے۔ اس نے ہر سوال کا تقریباً ایک ہی جواب دیا۔ منصور کی حالت مخدوش تھی۔ یاسمین کا دل تڑپ اٹھا۔

"منصور" کہتے ہوئے یاسمین تقریباً مسہری پر گر گئیں منصور کی تپتی ہوئی پیشانی پر بوسہ دیتے وقت ان کی آنکھوں کے ٹھلکے ہوئے آنسو بے اختیار نکل پڑے۔ منصور نے آنکھیں اٹھا کر بہن کو دیکھا۔ ان کے چہرے سے ان کی ذہنی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا یاسمین نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور ان کی خالہ سہارا دے کر انہیں دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

منصور دل گرفتہ سے انہیں دیکھتے رہے۔ اور پھر کروٹ بدل لی نواب صدیق بھی کمرے سے باہر آگئے۔ اور دیر تک ڈاکٹر کے پاس بیٹھے بیماری کی نوعیت پر اس سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔

شام کو منصور کو پھر چکر آگیا۔ وہ دورہ پہلے دورے سے زیادہ عرصہ رہا۔ کمزوری بہت بڑھ گئی۔ چہرہ یوں مرجھا گیا جیسے پھول پانی کے بغیر مرجھا جاتے ہیں۔ گھر کے سب افراد اور خدام کی تو جیسے جانیں ہوا ہو گئیں۔ اور یاسمین کا تو حال برا تھا۔ وہ خود بیمار معلوم ہوتی تھی۔ رنگت سرسوں کے پھول کی طرح زرد پڑ گئی۔ آنسو بہاتے بہاتے آنکھیں تھک گئیں۔

رات کو ملک کے نامور ڈاکٹر ہڈسن کو نواب صدیق علی خان نے خود فون کیا سارے کیس کے متعلق ضروری بات چیت کی۔ اور بذریعہ طیارہ سلطان پور بلایا۔ صبح نو بجے کے قریب ڈاکٹر ہڈسن مع اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹر جعفر اور مس انجلینہ کے قصر رعنا پہنچ گئے دو نرسیں پہلے ہی بلالی گئیں تھی۔ ان کے آنے سے پہلے ہی منصور کی خواب گاہ سے بھاری فرنیچر نکال دیا گیا تھا۔ اور کھڑکیوں دروازوں اور مسہری کے رنگین پردے ہٹا کر مہین ریشمی سفید پردے ڈال دیئے گئے تھے۔ گہرا سبز موٹا قالین اٹھوا دیا گیا تھا۔ اور اس کی جگہ بڑے بڑے خوشنما پھولوں والا سفید قالین ڈال دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر ہڈسن اپنا ڈاکٹری سامان کھولے میز پر جھکا ہوا بخار کا چارٹ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر حفیظ اور ڈاکٹر سلیمان سارے کیس کے متعلق پچھلے دنوں کی رپورٹ دے رہے تھے۔

"یہ چکر کبھی پہلے بھی آئے تھے نواب صاحب کو" ہڈسن نے ٹمپریچر چارٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بخار آنے کے بعد تیسرا دورہ آج رات ہوا تھا" ڈاکٹر حفیظ بولا۔

"میرا مطلب ہے بخار آنے سے پہلے بھی کبھی ایسی تکلیف ہوئی تھی انہیں"۔

اس نے بات کی وضاحت کی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہ بات میرے علم میں تو نہیں آئی۔ کیوں ڈاکٹر سلیمان آپ کو معلوم ہے"۔ حفیظ بولا۔

ڈاکٹر سلیمان بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ دراصل دونوں نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ڈاکٹر ہڈسن جعفر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ دونوں ڈاکٹر کھسیانے سے ہو گئے۔ ڈاکٹر ہڈسن اور ڈاکٹر جعفر منصور کی خواب گاہ میں آ گئے۔ بڑی دیر تک ڈاکٹر ہڈسن ان پر جھکا ہوا طبی آلات کی مدد سے ان کا معائنہ کرتا رہا۔ بخار اس وقت بھی خطرناک حد تک تیز تھا۔ لیکن منصور ہوش میں تھے۔ ڈاکٹر نے ان سے متعدد سوال پوچھے۔ اور وہ بڑی بے دلی سے جواب دیتے رہے۔ جب سے وہ بیمار تھے خاموش لیٹے رہتے تھے۔ وہ چپ تھے۔ دانستہ چپ تھے یا بیماری ہی کچھ اس نوعیت کی تھی۔ یہ تو وہی جانتے تھے۔ دیکھنے والوں کو تو یہی محسوس ہوتا۔ جیسے وہ تھکے ہوئے تھے۔ اور ستانے کیلئے مسہری پر لیٹے تھے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر ہڈسن نے ملنے والوں پر بندش لگائی۔ کسی کو خواب گاہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر نرس یا نواب صدیق اندر آتے جاتے تھے۔

یاسمین کو تو جیسے ہوش ہی نہ تھا۔ وہ تو خواب گاہ کے گرد پروانے کی طرح منڈلاتی پھرتیں اندر جانے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا۔ بڑی ہمت کر کے ان کے پاس ایک آدھ بار جاتیں بھی تو جلدی سے اٹھ کر آ جاتیں۔ وہ جب بھی ان کے پاس جاتیں۔ ان کا ایک ہی سوال ہوتا ایک ہی بات پوچھتے۔

"باجی میری بیماری کی اطلاع سب کو مل چکی ہے"۔

اور یاسمین کا کلیجہ جیسے کوئی چھری سے کاٹ کر رکھ دیتا۔ وہ انہیں تسلی دینا چاہتیں لیکن الفاظ حلق ہی میں اٹک جاتے زلفی چچا کو ان کی بیماری کی اطلاع نہ دی گئی تھی۔ کیوں کہ وہ خود بیمار تھے۔ ان کا خط ہسپتال سے آیا تھا۔ پردیس میں بیمار تھے وہ اس لئے منصور کی بیماری کی انہیں جان بوجھ کر اطلاع نہ دی گئی تھی۔ منصور کے بار بار پوچھنے پر یاسمین کا دھیان ادھر ہی جاتا۔ وہ سمجھ رہی تھیں۔ کہ انہیں زلفی چچا کا انتظار ہے لیکن منصور کی روح جس کیلئے انتظار بن کر آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ زلفی نہ تھے ناہید تھی۔ ایک دنیا ان کی بیماری پرسی کیلئے آئی تھی۔ امیر غریب چھوٹے بڑے سبھی انہیں دیکھنے آ چکے تھے۔ لیکن وہ نہیں آئی تھی۔

منصور اپنی گرتی ہوئی حالت دیکھ رہے تھے۔ انہیں کھوکھلی تسلیاں دی جا رہی تھیں۔ اور آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جانے سے پہلے ایک دفعہ اس غارت گرِ دین و ایمان کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ ناہید ان سے دور ہو چکی تھی۔ اور اس دن بازار میں اسے دیکھنے کے بعد تو ان کا دل اس کی طرف سے بدگمان بھی ہوا تھا۔ لیکن وہ اب بھی ان کی ساری ہستی پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ ان کے تخیل میں برا جمان تھی۔ وہ ان کے شعور سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ ان کے ذہن میں محفوظ تھی۔ ان کے ذہن کی یہ محفوظ تصویر کئی دفعہ تخیل کے پردوں پر اس طرح ابھری کہ وہ حقیقت ماننے پر مجبور ہو گئے۔ خیال خیال ہی تھا۔ اور اب تو اس مسلسل ذہنی جھوٹ سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی اسے

نہ آنا تھا نہ آئی۔ منصور کی خاموش نگاہیں ہر آہٹ پر دروازے کی طرف اٹھتیں اور ناکام لوٹ آتیں۔

ڈاکٹر ہڈسن کے علاج کو چوتھا دن تھا۔ اس کی ان تھک کوششیں بارآور نہ ہو سکیں۔ صبح کے دورے نے تو انہیں موت کے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ کہ معمر ڈاکٹر بھی گھبرا گئے پریشانی کے عالم میں وہ اپنے علاج کی ناکامی کے بارے میں ٹھیک طرح سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ بخار خطرے کی علامت بن گیا تھا۔ کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

بڑی دیر تک وہ کہنیاں میز پر ٹکائے ہاتھوں سے سر کو تھامے کچھ سوچتا رہا۔

"ڈاکٹر" نواب صدیق کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نواب صدیق نے جب منصور کی حالت کے بارے میں اس سے پوچھا تو وہ کچھ دیر چپ رہ کر آہستگی سے بولا۔

"میں آپ کو مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتا نواب صاحب" وہ پریشانی سے ہاتھ مل رہا تھا "۔ کوئی علاج کارگر نہیں ہوا۔ آپ نواب صاحب سے مل کر آخری بات چیت کر سکتے ہیں۔ وصیت.........."

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ نواب صدیق کا رنگ سفید پڑ گیا۔ اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے کھڑکی کا پٹ تھام لیا۔

"ڈاکٹر" ان کی آواز تھرا رہی تھی۔

"میں ہر نسخہ آزما چکا ہوں.......... نواب صاحب کی جوانی دیکھ کر تو قدرت کے انتہائی ظالم ہونے کا گمان ہوتا ہے"۔

"ڈاکٹر امید کی کوئی صورت نہیں" وہ اب تک کانپ رہے تھے۔

ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ اب دورہ ہوا تو وہ آخری دورہ ہو گا.......... اور وہ دو چار گھنٹے تک یہ دورہ متوقع ہے"۔ ڈاکٹر بڑی مایوس آواز میں کہہ رہا تھا۔

نواب صدیق کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے قیامت ٹوٹنے والی ہو۔ محل کے گوشے گوشے سے جنازے اٹھ رہے ہوں۔ ماتم ہو رہا ہو۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چپ چاپ ڈاکٹر کے کمرے سے باہر آ گئے۔ منصور کی خواب گاہ کے قریب سے گزرے اندر جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مرمریں ستون سے پشت ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سینے میں اک ہل چل مچی ہوئی تھی۔ منصور کے ساتھ والے کمرے میں یاسمین سجدے میں گری ہوئی گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے بھائی کی صحت کی دعائیں مانگ رہی تھیں ......

کئی دنوں سے دعائیں ہو رہی تھی۔ قصر رعنا کے چمنوں میں حافظ قرآن بیٹھے تھے مسجدوں میں سکولوں میں یتیم خانوں میں محتاج گھروں میں دعائیں ہو رہی تھیں۔ خیراتیں بانٹی جا رہی تھیں۔ صدقے دیئے جا رہے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ غریبوں اور مسکینوں کو کھانے کھلائے جا رہے تھے۔ ہر امکانی حیلہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن شمع بجھتی ہی جا رہی تھی۔ نیلا نیلا شعلہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔

..............O..............

۱۵

شیریں سکول سے واپس آئی تو وہ بڑی مغموم تھی۔ آج سکول میں نواب منصور کی صحت کے لئے دعا کرائی گئی تھی۔ نادار بچیوں کو کھانا کھلایا گیا تھا۔ کپڑے تقسیم کئے گئے تھے۔ نواب صاحب کے کردار ان کے اخلاق اور اوصاف حمیدہ کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ شیریں کو توجشن کی رات نہیں بھول رہی تھی۔ منصور کا صحت مند جسم بار بار آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ سکول سے واپسی پر وہ سیدھی ناہید کے پاس آئی۔ وہ بستر پر پڑی تھی۔ فاختی دوپٹہ پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ بڑی محویت سے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ شیریں کی آواز پر چونکی اور ایک دم اٹھ بیٹھ گئی۔

"بڑی دیر لگا دی تم نے آج۔ میں دو دفعہ تمہاری طرف گئی تھی۔" ناہید نے کہا۔ "کہاں سے آ رہی ہو۔"

"سکول سے۔" شیریں نے سوگوار آواز میں جواب دیا۔

"اس وقت۔" اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں آج دعا کرائی گئی تھی۔ دیر ہو گئی۔"

ناہید کا دل دھک سے رہ گیا۔ منصور کی بیماری کی پل پل کی خبر اسے مل رہی تھی سلطان پور کی ساری آبادی دم بخود سی کسی منحوس خبر کا جیسے انتظار کر رہی تھی۔ ناہید انہیں دیکھنے نہیں گئی تھی۔ لیکن اس کے دن اور رات خدا سے دعائیں مانگتے اور آنسو بہاتے گزر رہے تھے۔ کئی راتوں سے اس کی نیند حرام ہو رہی تھی۔ اور وہ بستر پر کروٹیں بدلتے یا چمن میں پھرتے راتیں گزار رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کا خیال اسی طرف تھا۔ حالات کچھ اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ پاؤں میں زنجیر بن کر حائل ہو گئے تھے۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کر سکی تھی۔

"تم انہیں اس دفعہ بھی دیکھنے نہ گئیں۔" شیریں کہہ رہی تھی۔ "کچھ ان کے احسانوں کا ہی خیال کیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوتا۔ اس دن میں نے کتنا کہا۔ لیکن تم اپنی ضد پر قائم رہیں۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ "

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی رہی۔

" آج تو ان کی حالت بڑی خراب ہے۔ خدا جانے بچیں گے بھی یا...... "

ناہید تڑپ کر اٹھی۔ اور شیریں کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ ناہید کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ اس کی آنکھوں میں مہیب سکوت تھا۔ اس کے چہرے پر اک منجمد خاموشی تھی۔ اک ویران چپ تھی۔ کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔

اور اس سناٹے میں وہ کش مکش کے تمام مراحل طے کر گئی۔ شش و پنج کی ساری منزلیں پیچھے چھوڑ گئی۔ تذبذب کے سب مدارج عبور کر گئی۔ ایک ہی جست میں وہ عشق کی ان بلندیوں پر پہنچ چکی تھی جہاں نہ اسے اپنے ماضی کا خوف تھا۔ نہ منصور کے عالی وقار خاندان کا خیال۔ نہ ماں کی طوائفیت کا دھڑکا۔ نہ شمسہ کے وجود کا احساس۔ حالات کی زنجیریں تھیں نہ حجاب کی دیواریں۔ ہر چیز ایک دبیز پردے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ اور اس دبیز پردے پر ایک ہی تصویر متحرک تھی۔ منصور کی تصویر...... منصور جو موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

" کہاں چلیں۔ " شیریں نے پوچھا۔ وہ بڑی خاموشی سے اس کی حرکات کا مطالعہ کر رہی تھی۔

" ان کے پاس۔ " ناہید نے کچھ اس یگانگت سے کہا۔ کہ شیریں کی آنکھوں سے کئی پردے اٹھ گئے۔

وہ تیزی سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ شیریں کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھتی رہی اور جانے کیوں اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

ناہید کے قدم بڑی تیزی سے قصر رعنا کی طرف اٹھ رہے تھے۔ فاختی کپڑوں میں وہ اس وقت اک دل گرفتہ فاختہ نظر آ رہی تھی۔ فاختی دوپٹہ اس کے شانوں پر پڑا ہوا تھا۔ گرد و پیش سے بے خبر وہ گزر گئی۔ بر آمدہ طے کر کے وہ زینے پر پہنچ گئی۔

باوردی ملازم پہرے دار کی طرح زینے کے قریب کھڑا تھا۔

" اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے مس صاحبہ۔ " وہ بولا۔ لیکن اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے وہ زینے کے آخری چکر پر پہنچ چکی تھی۔ ملازم اس کے سرخ سینڈل اور بالوں میں پڑے ہوئے سرخ ربنوں کو ہی دیکھتا رہ گیا۔

کوئی مقناطیسی کشش تھی۔ جو اسے کشاں کشاں اپنے محبوب کے پاس لئے جا رہی تھی۔ کوئی غیر مرئی طاقت تھی۔ جو اسے کھینچ کر اپنے منصور کے قریب لا رہی تھی۔ بالکنی میں شمو مغموم صورت بنائے سہما ہوا کھڑا تھا۔ اسے خواب گاہ کی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے اشارے سے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ بڑی سرعت سے پردہ اٹھا کر

اندر داخل ہو گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں مسہری کے مہین پردوں پر تھرک رہی تھیں۔ کمرے کی فضا پر سکوت مرگ طاری تھا۔ وہ مسہری کے قریب آ کر ٹھہر گئی۔ باریک ریشمی پردوں کے پیچھے منصور کا مٹا مٹا سا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ جس میں موت بہت چابک دستی سے اپنا رنگ بھرنے میں مصروف تھی۔ پردہ کھینچ کر وہ مسہری کے اندر آ گئی۔ دہشت زدہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے کچھ ہوش ہوتا تو شاید ان کی حالت دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی۔

منصور نے آنکھیں کھول دیں۔ روشن اور کشادہ آنکھیں جن میں انتظار کی شمعیں جل رہی تھیں۔ منصور نے پہلے تو اسے تخیل کا فریب سمجھا۔ بارہا وہ اسے اپنے قریب محسوس کر چکے تھے۔ مسہری کے پردوں پر اس کا پیکر تھرکتا ہوا دیکھ چکے تھے...... وہ خیال ہوتا تھا۔ اور آج حقیقت تھی۔ منصور نے اسے چھو کر اطمینان کرنا چاہا۔ اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ناہید نے وہ لرزتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ منصور حقیقت سے باخبر ہو گئے۔ اور وہ مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کے حواس پر جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا۔ منصور کا جلتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

" ناہید۔ " منصور کی نحیف آواز آئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی موجودگی اور قربت کو برداشت کرنے کی ان میں ہمت ہی کہاں رہی تھی۔

منصور چند لمحے اسی طرح پڑے رہے۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

" آپ نے ناحق تکلیف فرمائی۔ "

اس جملے میں کتنا گلہ تھا۔ کتنی تڑپ تھی۔ کچھ ناہید ہی محسوس کر سکی۔

" منصور " اس نے پہلی دفعہ ان کا نام پکارا۔ وہ ان کے اوپر اس قدر جھکی ہوئی تھی۔ کہ منصور کو اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس اپنے تپتے ہوئے چہرے پر جنتی ہواؤں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔

آپ نے مجھے مار ڈالا ناہید۔ " منصور نے شدت کرب سے ہونٹ کاٹے۔

" ایسا نہ کہیئے میں مر جاؤں گی منصور۔ " اور فطرت قانون اور تہذیب کے سارے بندھن توڑ کر یکسر آزاد ہو گئی۔ ناہید کا جھکا ہوا سر منصور کی جلتی ہوئی چھاتی سے چھو گیا۔

منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے چمن میں بہاریں اس وقت آئیں۔ جس وقت انہیں رخصت سفر باندھنے کا حکم مل چکا تھا۔ اس احساس کے ساتھ ہی انہیں کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے ہوش کا دامن پکڑنا چاہا۔ لیکن بے سود۔ ناہید کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور دورہ پڑ چکا تھا۔ آخری مہلک دورہ۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"منصور۔" ناہید ان کا گریبان پکڑے اس زور سے چیخی کہ فضا تھرا اٹھی۔

یاسمین نواب صدیق بھاگے ہوئے آئے۔ مس انجلینہ کھٹ سے دروازہ کھول کر پہنچی۔ چند سکینڈ میں سفید کوٹ میں ملبوس ڈاکٹر ہڈسن فرشتے کی طرح ان پر جھکا ہوا تھا۔ نواب صدیق بچوں کی طرح ان کا چہرہ تھامے منصور منصور پکار رہے تھے۔ یاسمین کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

اور آناً فاناً کمرہ لوگوں سے بھر گیا۔ سب خواب گاہ کی طرف بدحواسی کے عالم میں بھاگے چلے آ رہے تھے۔ برآمدہ۔ سیڑھیاں۔ بالکنی سب جگہ سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ غریب امیر کی تمیز نہ رہی تھی۔ نوکر رشتہ دار سبھی شانہ سے شانہ ٹکرائے مسہری تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ پردہ دار رشتہ کی خواتین مردوں کے دوش بدوش کھڑی تھیں۔ سب کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

"کلام پاک لاؤ۔" مجمعے میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔ اس آواز کے ساتھ ہی دبا دبا سا کہرام مچ گیا۔ سسکیاں ہی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ ڈاکٹر ہڈسن ڈاکٹر جعفر کی مدد سے ابھی تک ان کے جسم کو ٹٹول رہا تھا۔ اور ناہید ساکت وصامت اسی طرح بیٹھی تھی۔ منصور کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے چہرے سے سرخی عنقا تھی۔ سفید مرمریں بت کی طرح وہ پلک جھپکائے بغیر اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو دیکھ رہی تھی۔

"کمرہ خالی کر دیا جائے۔" ڈاکٹر ہڈسن نے کہا۔ لیکن جیسے کسی نے ڈاکٹر کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"آپ کون ہیں۔" ڈاکٹر ہڈسن نے تعجب سے ناہید کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ نواب صدیق نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا لیکن وہ اسے نہ جانتے تھے۔ یاسمین منصور پر جھکیں۔ ناہید سے نظر ملتے ہی چیخ مار کر اس سے لپٹ گئیں۔

"ڈاکٹر۔" وہ روتے ہوئے بولیں۔ "یہ منصور کی ہونے والی منگیتر ہیں۔ ہمارے لئے نہیں تو ان کے لئے ہی بچالو منصور کو۔" اس کے ساتھ ہی وہ غش کر گئیں۔ کئی آڑھی ترچھی نظریں ناہید پر پڑیں۔ کچھ تو اس کے سوگوار حسن کی معترف ہو کر لوٹیں۔ اور کچھ چنگاریاں برساتی ہوئیں۔ بیگم وقار نے بڑی مشکل سے جگہ بنا کر اسے جھانکا۔ عجیب عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ موقع کی نزاکت کو بھی بھول گئی۔

"بخدا کمرہ خالی کروائیے۔" ڈاکٹر ہڈسن نے نواب غزالی سے کہا۔ اور غزالی جن کا دل اپنے دوست کے لئے خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لوگوں کو شائستگی سے باہر نکالنے لگے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد کمرہ خالی ہو گیا۔ بے ہوش یاسمین کو ساتھ والے کمرے میں لٹایا گیا۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ آزار سے چھوٹ گئیں۔

ناہید اور نواب صدیق کمرے میں ہی تھے۔ ناہید کو تو جیسے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ اب بھی پھٹی پھٹی نظروں سے منصور کو دیکھے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی کچھ سوچ کر اسے اٹھانا نہ چاہا۔ ناہید کے دل پر جو گزر رہی تھی۔ شاید اسے اس کا پورا احساس تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ منصور کو ابھی تک ہوش نہ آیا تھا۔ نبضیں ابھی سست رفتاری کے ساتھ چل رہی تھیں۔ سانس اس طرح رک رک کر آ رہی تھی۔ لیکن ان کے چہرے پر اک اطمینان بخش مسکراہٹ تھی۔ اور ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے وہ بڑے آرام سے سو رہے ہیں۔ بڑے دنوں کی تھکن اتار رہے ہیں۔ مس انجلینہ مسہری سے ذرا ہٹ کر بیٹھی ناہید کے سفید چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو شام سے اسی انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بار بار آ کر منصور کا نبض ٹٹول رہا تھا۔

"منصور۔" ناہید کے لرزتے ہونٹوں سے آواز نکلی۔ اس نے آہستگی سے ان کا چہرہ چھوا لیکن وہ بے سدھ پڑے رہے۔ پھر جانے اسے کیا ہوا۔ صبر و شکیب کی ساری قوتیں جواب دے گئیں۔ سحر ٹوٹ گیا۔ اور وہ حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔ اس دنیا میں جہاں منصور آخری سانس لے رہے تھے۔ اس کا ساتھ ہمیشہ چھوٹ جانے والا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ اس کے آنسوؤں سے ان کی چھاتی بھیگ گئی۔ اور شاید دیپک راگ کے جلے کو ملہار گانے کی ضرورت تھی۔ منصور نے آنکھیں جھپکائیں۔ ان کے لب ہلے۔ انہوں نے اس قدر نحیف آواز میں کچھ کہا۔ کہ ناہید سن نہ سکی۔ اور پھر ان پر غنودگی چھا گئی۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ ناہید گھبرا گئی۔ آخری وقت اس کی ماں کو بھی ایسے ہی پسینہ آیا تھا وہ اپنے آنسو اور منصور کا پسینہ ایک ہی دوپٹے سے پونچھ رہی تھی فاختی دوپٹہ تقریباً بھیگ چکا تھا۔ مس. انجلینہ نے اس کی پیشانی کو چھوا۔ وہ بھیگی ہوئی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف لپکی۔ نواب صدیق برآمدے میں بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ اور یاسمین کو ابھی تک ہوش نہ آیا تھا۔

دوسرے لمحے ڈاکٹر ہڈسن اور ڈاکٹر جعفر بھاگے ہوئے خواب گاہ میں داخل ہوئے نواب صدیق نے انہیں دیکھا۔ کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ان کا اس تیزی سے اندر جانا کسی خبر منحوس کا ہی پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔

"ونڈر فل۔" ڈاکٹر ہڈسن اونچی آواز میں بولا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر۔" جعفر اس کے قریب آ گیا۔

"انہیں پسینہ آ رہا ہے۔ ڈاکٹر ہڈسن کی آنکھیں امید سے چمکنے لگیں۔

"سچ" جعفر کو جیسے یقین نہ آیا۔ اور جلدی سے اس کی پیشانی چہرے اور بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولا۔ "واقعی یہ تو بھیگ رہے ہیں ڈاکٹر۔" جعفر کی آواز میں مسرت انگیز گھبراہٹ تھی۔

دونوں ڈاکٹر بڑی دیر تک طبی آلات سے منصور کا معائنہ کرتے رہے۔ بخار ایک درجہ کم تھا۔ یہ بات امید افزا تھی۔ وہ دونوں صبح تک اپنی کوششوں سے منصور کو ہوش میں لانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ اور ناہید متوحش نظروں سے انہیں دیکھتی رہی حرم سرا رشتہ داروں سے بھری ہوئی تھی۔ کوئی بھی تو رات کو نہ سو سکا۔ مہمان اونگھتے ہوئے قیاس آرائیوں میں مصروف تھے نوکر چاکر سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر خواہ مخواہ آ جا رہے تھے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

رات گزر گئی۔ اور......

صبح اپنے دامن میں امید کی کلیاں لئے ہوئے طلوع ہوئی۔ منصور نے آنکھیں کھولیں۔ خالی خالی نظروں سے کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے جلدی سے دودھ میں دوائی کے چند قطرے ٹپکائے۔ ناہید نے دودھ لے لیا۔ اور قطرہ قطرہ ان کے حلق میں ٹپکاتی رہی۔ دودھ تھا یا آب حیات۔ یا پھر ناہید کی مسیحائی منصور ہوش میں آ گئے۔ ڈاکٹر ہڈسن خوشی سے پھولا نہ سمایا اس دورے سے منصور کا بخیریت گزر جانا اک معجزے سے کم نہ تھا۔ وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔

"نواب صاحب۔" وہ چلایا...... اور نوب صدیق کا دل جیسے ڈوب گیا کمرے سے حسنہ کی والدہ دوڑی ہوئی باہر آ گئیں۔

"مبارک ہو نواب صاحب۔" ڈاکٹر نے نوید سنائی۔

"کیا کہا۔" وہ حیران ہو کر ڈاکٹر کا منہ دیکھنے لگے۔

"مبارک...... نواب صاحب بڑی امید بندھ گئی ہے۔ آج پہلی بار انہیں پسینہ آیا ہے۔ دورے سے بخیریت گزر گئے ہیں نواب منصور ......"

تیسرے دن منصور خطرے کی حد سے باہر ہو گئے۔ کمزوری حد سے زیادہ تھی ڈاکٹر بڑی احتیاط برت رہا تھا۔ خواب گاہ کے ارد گرد کسی کو پھٹکنے کی مجال نہ تھی۔ ملنے جلنے والوں کا سلسلہ قطعی بند تھا۔ بخار ابھی اترا نہیں تھا۔ البتہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔

ناہید نے ان کی تیمار داری میں دن رات ایک کر دیئے۔ اسے اپنے آپ کا ہوش ہی نہ تھا جیسے۔ رات رات بھر وہ ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ کسی وقت اونگھ آ گئی تو سر وہیں رکھ دیا۔ دن رات کا تو جیسے امتیاز ہی نہ رہا تھا۔ نرسیں ڈیوٹی بدل بدل کر اپنا فرض ادا کر رہی تھیں۔ ایک وہ تھی۔ جسے وقت کا احساس ہی نہ تھا یاسمین تو اس پر دیوانہ وار تصدق ہو رہی تھیں۔ اس کے آنے سے ان کو بڑی ڈھارس ملی تھی۔ ان کے سارے غم ناہید نے بانٹ لئے تھے۔ اور پھر اس کا قدم اتنا مبارک پڑا تھا کہ منصور خطرے کی حد سے باہر ہو چکے تھے۔ نواب صدیق کو بھی اس کی مخلص اور بے لوث خدمت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ انہیں بھی اس سے ایک طرح کی عقیدت ہو گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ناہید کے والہانہ جذبات کے قدر دان ہو گئے تھے۔ اور ان کی بہن تو جیسے ناہید کی متوالی تھیں۔ گھڑی بھر کے لئے جب یاسمین زبردستی اسے آرام کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں لے آئیں۔ تو ان کی نند بڑے پیار سے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کے پیارے پیارے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتیں۔ ناہید کا تھکا ہوا دماغ اتنی فرحت محسوس کرتا۔ کہ وہ بے خبری سے سو جاتی۔

لیکن کنبہ کے دیگر افراد کو تو جیسے ناہید سے للہی بغض تھا۔ دبی دبی زبان میں اس پر نکتہ چینیاں ہو رہی

تھیں۔ بیگم وقار کو تو جیسے اس سے چڑ سی گئی تھی۔

حرم سرا کی آراستہ نشست گاہ میں قہوے کا دور چل رہا تھا۔ نرم نرم ریشمی گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی بیگمات بیگمات قہوہ پیتے ہوئے گفت گو میں مصروف تھیں۔ کنیزیں چاندی کی کشتیوں میں روسی چائے دانیوں میں قہوہ لا کر سامنے رکھ رہی تھیں۔ دو دو چار چار عورتیں سر جوڑے منصور کی تشو یشناک حالت کا نئے سرے سے تذکرہ کر رہی تھیں۔ ناہید کے متعلق دلوں میں بھرا ہوا زہر اگل رہی تھیں۔

"آخر یہ ہے کون۔" بیگم وقار اپنے سینے پر پڑے موتیوں کی دوہری مالا پھیلاتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔

"میں خود نہیں جانتی۔" سلطانہ بولی۔ "کوئی یاسمین کی سہیلی ہے۔"

"یاسمین ادھر آئیں نہیں صبح سے۔" زیب النساء نے پوچھا۔ کانوں میں پڑے ہوئے یاقوتی آویزوں کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے بولی۔ "منصور کے پاس ہی ہیں شاید۔"

"ان کے پاس وہ ایک ہی کیا کم ہے۔" بیگم وقار نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔"

"کون۔" زیب النساء نے پوچھا۔

"منصور کی منگیتر۔" بیگم وقار نے اپنے طلائی کنگنوں کو ہلاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ آنکھوں سے طنز کے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اسے تو ناہید سے ایک بیر سا ہو گیا تھا۔ دراصل وہ اب تک منصور پر اپنی صبیحہ کے لئے آس لگائے بیٹھی تھی۔ صبیحہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بیگم وقار منصور کی رشتہ کی چچی تھی۔ جب سے منصور بیمار ہوئے تھے۔ عیادت کے لئے آئی ہوئی تھی۔ دل کھول کر خیرات دے رہی تھی۔ بے دریغ صدقہ نکال رہی تھی۔ ان سب باتوں کے نیچے اپنی بیٹی صبیحہ کا رشتہ منصور سے کرنے کی خواہش کار فرما تھی۔ اس دن جب اس نے سنا تھا کہ ناہید منصور کی ہونے والی منگیتر ہے تو اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ وہ بلاوجہ اس کے بارے میں زہریلی باتیں پھیلا رہی تھی۔ اور یہ اگلا ہوا زہر بجائے ناہید کے خود اسے ہی گزند پہنچا رہا تھا۔

"میں تو اس لڑکی کی جسارت پر حیران ہوں۔ کس بے باکی سے رہ رہی ہے یہاں اور یاسمین کو دیکھو دن رات اس کا کلمہ پڑھتی ہے۔" وہ غرا رہی تھی۔

"یاسمین تو کہہ رہی تھیں۔ کہ ناہید کا قدم اتنا مبارک پڑا۔ منصور اچھے ہو گئے......" سلطانہ بیگم نے لقمہ دیا۔ تھوڑی دیر میں سات آٹھ بیگمات سر جوڑے ناہید کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔

"کسی ایسے ویسے گھر کی ہو گی۔" بیگم وقار نے تیر چھوڑا۔

"معلوم تو کسی بڑے گھرانے کی ہوتی ہیں۔" ممتاز بانو نے اس کی طرف داری میں کہا۔

"بڑے گھرانے کی لڑکیاں یوں مادر پدر آزاد نہیں ہوتیں۔" سلطانہ بیگم نے جواب دیا......

"سنا ہے اس کے والدین مر چکے ہیں۔" ممتاز بانو نے پھر کہا۔ جانے کیوں انہیں ناہید سے گہری ہمدردی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہو گئی تھی۔

"جبھی اس طرح اس دن سے آئی بیٹھی ہے......" بیگم وقار نے بڑی حقارت سے کہا۔

"نئی روشنی ہے بہن۔" سلطانہ بیگم نے پھر لقمہ دیا۔ "زمانے کی ہوا ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے۔"

"نوج نئی روشنی۔" بیگم وقار پھنکاریں۔ لیکن یاسمین کی آمد پر اسے چپ ہو جانا پڑا۔ عورتیں یاسمین سے منصور کا حال پوچھنے لگیں۔ کوئی چچی تھی۔ کوئی خالہ تھی کوئی ممانی تھی ہر کوئی جتنی رشتہ داری تھی اسی حساب سے احوال پرسی کر رہی تھی۔

"ابھی بخار ٹوٹا نہیں۔" یاسمین نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ "لیکن کم ہو رہا ہے انشاء اللہ جلد ہی اتر جائے گا۔ خطرے سے باہر ہیں اب تو اللہ کے فضل سے۔"

"ہمیں بھی دیکھنے کی اجازت ملے گی یا نہیں۔" بیگم وقار نے جیسے یاسمین پر کوئی احسان کیا۔

"چچی جان فی الحال تو ڈاکٹر نے بڑی سختی سے منع کر رکھا ہے۔ وہ کسی کو خواب گاہ کے قریب جانے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ بڑی پابندی لگا رکھی ہے انہوں نے......" یاسمین نے سادگی سے ساری بات کہہ دی۔ بیگم وقار تو جیسے دل کی آگ بجھانا چاہتی تھی۔ بڑی نخوت سے بولی۔

"یہ پابندی صرف ہمارے ہی لئے ہے۔"

"چچی جان آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" یاسمین نے ان کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔ وہ بار بار اپنی طلائی چوڑیوں کو ٹھیک طرح سٹ کر رہی تھیں۔ کوئی بھی تو نہیں جا سکتا ان کے پاس میں جاتی ہوں یا ناہید ہیں وہاں۔"

"ہاں بھئی ہم کوئی ناہید کے ساتھ تھوڑی ہی مل سکتے ہیں۔"

بیگم وقار کے طنزیہ جملے پر یاسمین کا خون کھول گیا۔ ناہید پہلے ہی انہیں اتنی عزیز تھی۔ منصور کی بیماری میں اس نے اپنی بے لوث خدمت سے تو انہیں جیسے خرید لیا تھا۔ انہیں یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ناہید کوئی غیر نہیں انہی کے گوشت پوست کا ہی حصہ ہے۔

"آپ یہاں بیٹھ کر بھی ان کے لئے دعا کر سکتی ہیں۔" یاسمین بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

"وہ تو گھر بیٹھ کے بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" یاسمین نے چاہا کوئی تلخ سا جواب دے کر اس کا منہ بند کر دیں۔ لیکن گھر آئے مہمان سے جھگڑنا آئین مہمان نوازی کے خلاف تھا۔ غصہ پی کر بولیں۔

"آج ڈاکٹر سے پوچھوں گی۔ انہوں نے اجازت دی۔ تو آپ بھی دیکھ آیئے گا انہیں۔"

بیگم وقار بڑبڑاتی رہی۔ اور یاسمین دوسری خواتین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

شام کو انہوں نے ڈاکٹر ہڈسن سے پوچھا۔ وہ بڑی حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ "آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ۔"

"کیا کیا جائے ڈاکٹر۔" وہ کھسیانی ہو کر بولیں۔ "ان رشتہ داروں کو سمجھانا بڑا مشکل ہے۔"

"لیکن مجھے افسوس ہے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" وہ بولا۔ "ایک دفعہ ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو بس بیماری جہاں سے چلی تھی وہیں پہنچ جائے گی۔"

یاسمین کانپ گئیں۔

"یہ دیکھئے۔" یہ ٹمپریچر چارٹ دکھاتے ہوئے بولا "کن خطرناک مراحل سے گزرے ہیں نواب صاحب۔ بخار اب کم ہو رہا ہے لیکن ذرا سی چوک بڑے مہلک نتائج کی حامل ہو گی۔ بخار اتر جانے کے بعد بھی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ رشتہ داروں کی ناراضگی کو فی الحال کوئی وقعت نہ دیجئے......"

یاسمین چپ ہو گئیں۔ ان کی نظریں چارٹ پر تھیں۔ اور پچھلے دنوں کے تصور سے ان کا دل کانپ رہا تھا۔

ساتویں دن بخار ٹوٹ گیا۔ منصور کو خدا نے دوبارہ زندگی بخشی۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس بخشش پر یاسمین نے دل کھول کر غربا کو بخششیں دی۔ ہزاروں روپے خیرات کر ڈالے یتیموں کو کھانے کھلائے گئے۔ کپڑے تقسیم کئے گئے۔ مسجدوں میں شکرانے بھجوائے گئے۔ نادار طلباء کو مستقل وظائف دیئے گئے۔

ڈاکٹر ہڈسن کی اب کچھ خاص ضرورت نہ تھی۔ اسے فیس کے علاوہ قدردانی کے طور پر بہت سا انعام دیا گیا۔ ڈاکٹر جعفر کو بھی اس کی خدمات کا معاوضہ فراخدلی سے دیا گیا۔ رخصت ہونے سے پہلے ڈاکٹر ہڈسن نے ساری باتیں ڈاکٹر حفیظ کو جو منصور کا خاندانی ڈاکٹر تھا سمجھا دیں۔ احتیاط برتنے کی بار بار تاکید کی۔

"ان کی روز مرہ کی کیفیت سے مجھے مطلع کرتے رہئے گا۔ ضرورت ہوئی تو میں پھر آ کر انہیں دیکھ جاؤں گا۔ ہر رات آٹھ بجے کے بعد مجھے فون پر سب حال کہہ دیا کیجئے گا......" ڈاکٹر ہڈسن نے ڈاکٹر حفیظ کو تاکید کی۔

اس نے بہت بہتر کہہ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

اور جب ڈاکٹر ہڈسن نواب صدیق کے ہمراہ منصور کو الوداع کہنے گئے۔ تو ناہید مس انجلینہ سے دوائی لے کر انہیں پلا رہی تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر منصور کے قریب آ گیا۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد اس نے منصور سے ہاتھ ملایا۔

"میں آپ کا مشکور ہوں ڈاکٹر" منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نقاہت ابھی زیادہ تھی۔ اس لئے اٹھ نہ سکے۔ "آپ نے بڑی محنت کی۔"

"مشکور تو آپ کو ان کا ہونا چاہئے نواب صاحب" ڈاکٹر ہڈسن نے ہنستے ہوئے ناہید کی طرف دیکھ کر کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ناہید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نواب صدیق بھی مسکرا دیئے۔

"ان کی آمد سے ہی کوئی معجزہ رونما ہوا" ڈاکٹر بولا "ورنہ میں تو قطعاً مایوس ہو چکا تھا۔ میں آپ کو آپ کی صحت یابی کے ساتھ ساتھ ایسی بہترین دوشیزہ کے انتخاب پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ وہ ایک جانثار بیوی ثابت ہوں گی" ڈاکٹر ہڈسن اپنی مغربی تہذیب کے مطابق بڑی سادگی سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

"ان کی خوش قسمتی میں کسے شک ہے ڈاکٹر" نواب صدیق مسکراتے ہوئے بولے "ایسی خدمت گزار لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ میں تو انہیں فرشتۂ رحمت سمجھتا ہوں رات دن ایک کر دیئے انہوں نے تیمارداری میں۔"

منصور خاموشی سے ڈاکٹر اور نواب صدیق علی خان کی باتیں سن رہے تھے جب سے انہیں ہوش آیا تھا۔ ناہید ان کے پاس تھی۔ آخری دورے سے پہلے اس کا آنا بھی انہیں کچھ کچھ یاد تھا۔ وہ کیوں کر آئی۔ کیسے آئی بارہا انہوں نے سوچنا چاہا لیکن ذرا سی سوچ دماغ کو تھکا دیتی۔ وہ کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ اور آج ان دونوں کی باتوں سے تو وہ حیرت میں ڈوب گئے تھے۔ ڈاکٹر نے جن واضح الفاظ میں ناہید کے انتخاب پر انہیں مبارک دی تھی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ڈاکٹر نے ایسا کیسے کہہ دیا ہے۔ اس نے قیاس آرائی سے کام لیا ہے یا کسی نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ جب یاسمین نے اس کا تعارف کرایا تھا۔ منصور بے ہوش تھے۔ اسی لئے وہ آج ان کی باتوں سے کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔

..........O..........

۱۲

ناہید از خود رفتگی کے عالم میں منصور کے پاس آئی تھی۔ منصور کی حالت جتنے دن مخدوش رہی۔ اسے گردوپیش کا کوئی احساس ہی نہ تھا۔ لیکن اب منصور کی حالت سنبھل رہی تھی۔ اور ناہید کی بے ہوشیوں کو ہوش آ رہا تھا۔ اسے اپنے جرأت مندانہ اقدام پر حیرت ہو رہی تھی۔ اپنی دیوانہ حرکات پر تعجب ہو رہا تھا۔ کنبہ والوں کی نظریں چبھ رہی تھیں۔ بیگم وقار کے زہر میں بجھے ہوئے جملے ناگن کی طرح ڈس رہے تھے۔ اسے خود بھی اپنی بے باکی پر ندامت سی ہو رہی تھی ایک دوشیزہ کا اس طرح پہلے آنا اور یوں ایک نوجوان کے پاس ٹھہرنا خود اس کی نظروں میں بھی اب کھٹک رہا تھا۔ اس کی از خود رفتگی کا ردعمل شروع ہو گیا تھا۔ اسے منصور کی زندہ زندہ نظروں سے حجاب آنے لگا تھا۔ ٹمپریچر لیتے وقت یا دوائی دیتے وقت اس کا ہاتھ کبھی منصور کے ہاتھ سے چھو جاتا تو اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ نواب صدیق کے تو سامنے آتے ہوئے وہ کتراتی تھی۔ دل ہی دل میں شرم سے کٹ جاتی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود منصور کی تیمارداری اسی تندہی اور جانفشانی سے کئے جا رہی تھی۔ مکمل علاج۔ پوری احتیاط اور سب سے بڑھ کر ناہید کی قربت کا احساس منصور کی کھوئی ہوئی طاقت کی بحالی میں مدد اور معاون ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بڑی سرعت سے طاقت پکڑ رہے تھے۔ کمزوری رفع ہو رہی تھی۔ اور چہرے کی رنگت بدل رہی تھی۔ اب تکئے کے سہارے بیٹھ کر وہ اخبار دیکھ لیا کرتے تھے۔ ہلکی غذائیں بھی ہضم ہونے لگی تھیں ناہید جو اتنے دنوں سے اک جذباتی دور سے گزر رہی تھی نے سوچا کہ اب اسے چلا جانا چاہیئے۔ لوگوں کی چبھتی ہوئی نظریں سہارنے کی ہمت نہ رہی تھی اس میں بیگم وقار نے تو جیسے اسے نشانہ ہی بنا لیا تھا۔ سلطانہ بیگم بھی کچھ پیچھے نہ رہی تھی۔ ان دونوں سے تو ناہید کو اب خوف سا آنے لگا تھا۔ جب بھی وہ منصور کو دیکھنے آتیں۔ ناہید حتی المقدور ان کے سامنے نہ آتی۔ لیکن وہ تو منصور کو دیکھنے سے زیادہ ناہید پر اپنا زہر اگلنے کے لئے آتی تھیں۔ دو چار طنزیہ باتیں کر کے ضرور اس کا خون خشک کر دیتی تھیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے واپسی کا ارادہ یاسمین پر ظاہر کر دیا۔

"کہاں جانا ہے" وہ اس طرح بولیں جیسے ناہید نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

"گھر" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"تم بڑی تھک گئی ہو مجھے اس کا پورا احساس ہے ناہید" وہ اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی بالوں کی بے قرار لٹوں کو سلجھاتے ہوئے بولیں "اپنے ساتھ والا کمرہ تمہارے لئے ٹھیک کروا دوں گی۔ چند دن آرام کر لو...... تمہاری جگہ میں دیکھ بھال لوں گی اور پھر مس انجلینہ جو ہیں۔ تم اتنا تردد نہ کیا کرو۔"

"نہیں باجی میں گھر جاؤں گی" اس نے بڑے اصرار سے کہا وہ سر جھکائے اپنی انگلی پر دوپٹہ لپیٹے جا رہی تھی۔ یاسمین کو اس پر دلی پیار آ گیا۔

"اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتیں" انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر اس کا منہ اونچا کیا۔ ناہید شرما گئی۔ اس نے اپنا سر ان کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر شفق پھوٹ پڑی۔ اور اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ یاسمین نے اسے لپٹا لیا۔

"میں پھر آ جاؤں گی اب جانے دیجئے" ناہید جانے پر مصر تھی۔

"اب جانے کی ضرورت کیا ہے ناہید" یاسمین نے ہنستے ہوئے کہا "اور پھر بھلا منصور کہاں جانے دیں گے۔"

اور جب ناہید نے بار بار اصرار کیا تو یاسمین شرارت سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"چلو منصور سے پوچھ لو۔ جانے دیتے ہیں یا نہیں۔"

ناہید کے ہچکچانے کو نظر انداز کرتے ہوئے یاسمین بڑی محبت سے اسے منصور کے پاس کھینچ کر لے گئیں۔

نرم نرم ریشمی تکیوں کے سہارے منصور مسہری پر بیٹھے اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں دیکھ رہے تھے۔ ان کے سینے تک ہلکا سا گرم کمبل تھا ڈھیلی ڈھالی گرم سفید قمیض کا گلا کھلا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ انہیں آتا دیکھ کر اخبار ہٹا دیا۔ جلتا ہوا سگریٹ راکھ دان میں رکھ دیا۔ یاسمین ناہید کا ہاتھ پکڑے ہنستے ہوئے اسے کھینچ رہی تھیں۔ اور ناہید آگے بڑھتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ منصور دونوں کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔

"منصور یہ گھر واپس جانا چاہتی ہیں" یاسمین نے ناہید پر پیار بھری نظر ڈالی۔ اور ایک لمحہ میں منصور کے بشاش چہرے پر دھندلکے سے پھیل گئے۔

"میرے روکنے سے تو رکتی نہیں۔ تم کہو شاید رک جائیں۔" وہ پھر ہنسیں۔ ان کے آب دار موتیوں کی طرح دانت بڑے خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ اور وہ شوخ نظروں سے ناہید کو دیکھ رہی تھیں۔ اور منصور ناہید کے سیاہ سینڈل میں جکڑے ہوئے گلابی گلابی پیروں کو دیکھ کر نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔ ناہید نے ڈرتے ڈرتے منصور کی طرف دیکھا۔

"اب پوچھ لو ان سے ناہید" یاسمین پھر بولیں۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے باجی" منصور کے لہجے میں بڑی ٹھنڈک تھی۔ "جب وہ جانا ہی چاہتی ہیں تو ہم روکنے والے کون" اخبار پھر اٹھا کر وہ یوں دیکھنے لگے جیسے بڑے انہماک سے پڑھ رہے ہوں۔ لیکن ان کی نظریں ایک ہی سطر پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کسی بات سے سخت اذیت ہو رہی ہے۔ فضا پر بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔ جانے کیوں یاسمین نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا . اور اک مصنوعی سی ہنسی ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ناہید نے ایک بار پھر منصور کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح اخبار دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جانے اسے کیا چیز نظر آئی وہ کچھ بے چین ہو گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اب وہ کبھی بھی یہاں سے نہ جا سکے گی۔ وہ بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ جہاں سے چلی تھی وہ مقام نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ دنیا کچھ کہے سلطانہ بیگم اور بیگم وقار جتنا چاہیں زہر اگلیں۔ وہ واپس نہ جا سکے گی۔ جو قدم آگے اٹھ چکے تھے وہ واپس نہ مڑ سکتے تھے۔

ناہید چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ منصور نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ اس کا دل کچھ بوجھل سا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی دوائی کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ مڑی مس انجلینہ کے کمرے کی طرف چلی۔ منصور کی نظریں اس کے اٹھتے ہوئے قدموں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ مس انجلینہ دوائی لے کر آ رہی تھی۔ برآمدے ہی میں ناہید مل گئی۔

"میں سمجھی آج آپ بھول گئیں" وہ مسکرائی۔

"یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے مس انجلینہ" ناہید جبراً مسکراتے ہوئے بولی۔ دوائی لے کر وہ خواب گاہ کا پردہ اٹھا کر اندر آ گئی۔

سورج غروب ہونے والا تھا۔ کمرہ اس کی آخری کرنوں سے روشن تھا باریک پردے کھڑکیوں پر لرز رہے تھے۔ مسہری کے پردے اٹھے ہوئے تھے اور منصور دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے آنکھیں بند کئے چت پڑے تھے۔ اخبار ان کے سینے پر اسی طرح کھلا پڑا تھا۔ ناہید کے قدموں کی آہٹ پر بھی آنکھیں نہ کھولیں۔ وہ ان کے سرہانے دوائی لئے کھڑی رہی۔

"دوائی پی لیجئے" اس نے بڑے شیریں لہجہ میں کہا۔

"رکھ دیجئے پی لوں گا" منصور اسی طرح پڑے رہے۔

"کب پیئیں گے۔ وقت تو ہو گیا ہے" وہ بھی اسی طرح کھڑے کھڑے بولی۔

"آپ کو جانے کی جلدی ہو تو مس انجلینہ سے کہہ دیجئے وہ دے دیں گی" ان کے لہجہ میں خفگی تھی۔

اور وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ ناہید خاموش کھڑی رہی۔ دوائی ہاتھ میں لئے جانے وہ کن خیالوں میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

غرق تھی۔ کچھ لمحے ناگوار سے گزرے۔

"آخر آپ کب تک یونہی کھڑی رہیں گی" منصور نے سر گھما کر اسے بھرپور نظروں سے دیکھا ناہید سیاہ گدے دار سٹول کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"لیجئے" اس نے دوائی بڑھائی۔ اس وقت وہ ایک تربیت یافتہ نرس کی طرح اصرار کر رہی تھی۔

"وہاں رکھ دیجئے" منصور نے قریب پڑی ہوئی شیشے کی میز کی طرف اشارہ کیا "پی لوں گا"۔

"کب پیئیں گے" وہ قدرے مسکرائی۔ منصور کے روٹھنے کی وجہ وہ جانتی تھی اس لئے پریشان ہونے کی بجائے فطری طور پر محظوظ ہو رہی تھی۔

"جب میری مرضی ہو گی"۔ منصور نے کہنی کے بل کروٹ بدلی۔ ناہید ان کے بالمقابل بیٹھی تھی۔ دوائی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ اپنی زنگالی قمیض کی سیاہ دھاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہ ریشمی دوپٹہ بڑی خوبصورتی سے اس کے شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔ بال شانوں پر دو چوٹیوں کی شکل میں پڑے ہوئے تھے۔ جن میں کالے کالے چوڑے ریشمی ربن بڑے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے کانوں میں کالے موتیوں کی بالیاں تھیں جو اس کے دل کی طرح کانپ رہی تھیں۔ اس وقت اس کے حسین چہرے پر منصور کی تاب سے کہیں زیادہ نکھار تھا۔

"ناہید" منصور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی" وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی بولی۔

"ایک بات پوچھوں" منصور کہنی نرم تکیئے پر ٹکائے اپنا سر ہتھیلی پر رکھے اسے اب بھی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ناہید جانتی تھی۔ کہ وہ کس بارے میں پوچھیں گے اس کا دل زور سے دھڑکا گھبراہٹ دور کرنے کے لئے اس نے پھر کہا۔

"دوائی پیجیئے وقت ہو گیا ہے"۔

"آپ نے میری بات کا جواب ہی نہیں دیا"۔ منصور کچھ مضمحل سے دکھائی دے رہے تھے۔

"پہلے دوائی پی لیجیئے" اس نے دوائی بڑھا دی۔ منصور نے ایک دم دوائی پی لی۔

"شاید نہ مجھے کوئی سوال کرنے کا حق ہے اور نہ آپ کوئی جواب دینے کے لئے تیار ہیں"۔ منصور نے ناہید کے ایک بار کہے ہوئے الفاظ دہرائے۔ ناہید نے مضطربانہ انہیں دیکھا۔ پھر سر جھکا کر بولی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں"۔

"آپ یہاں باجی کے بلانے پر آئی تھیں" منصور نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں" وہ اپنے دوپٹے کے کناروں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"میری شدید بیماری سے متاثر ہو کر از راہ ترحم تشریف لائی تھیں"۔ انہوں نے دوسرے رخ سے سوال کیا...... ناہید نے نفی میں سر ہلا دیا۔

منصور حیرانگی سے اسے دیکھنے لگے۔ ناہید نے نگاہیں اٹھائیں۔ مجروح نظریں لڑکھڑا کر جھک گئیں۔ تمنائے دید نے نظروں کو پھر سے ابھارا۔ پلکیں حجاب کے بوجھ سے جھک گئیں۔ نظروں کے شوق اور پلکوں کے

حجاب کی کش مکش میں وہ بار بار آنکھیں جھپک رہی تھی۔

"تو پھر آپ کیسے آئی تھیں"۔ منصور نے کچھ عجیب سا سوال کیا۔

"میں خود نہیں جانتی" اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا پلکوں کو اک قیامت خیز جنبش ہوئی۔ ہونٹوں پر اک بے چین تبسم تھا۔ اس نے منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں"۔ کوئی غیر مرئی طاقت مجھے یہاں لے آئی"۔

ناہید نے بڑی معصومیت سے ایک بہت بڑی حقیقت کا اعتراف کیا منصور کی روح فرطِ مسرت سے جھوم اٹھی۔

"آپ اب واپس کیوں جانا چاہتی ہیں"۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"آپ اچھے جو ہو گئے ہیں"۔ اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا منصور کو اس جواب سے بڑی کوفت ہوئی۔ وہ ہٹ کر بستر پر لیٹ گئے۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ چھت کے خوبصورت نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"بڑی مشکلوں سے طوفانی تھپیڑوں سے بچایا ہوا سفینہ کنارے سے ٹکرا کر پھر ڈوب سکتا ہے"۔ ناہید بے قرار ہو گئی۔ اس نے بے چین نگاہوں سے منصور کو دیکھا انہوں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آ کر چلے جانا تھا۔ تو پھر آپ آئی ہی کیوں تھیں۔ ڈوبنے والوں کو ڈوب جانے دیا ہوتا"۔

"آپ کتنی تلخ باتیں کر رہے ہیں"۔ وہ شیشے کی میز کی طرف گھوم گئی۔ اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ آنسوؤں کو چھپانے کیلئے اس نے منصور کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ منصور کے لئے وہ اک پہیلی تھی۔ جسے بوجھنے کی وہ اپنے کمزور دماغ میں ہمت نہ پا رہے تھے۔

ناہید انکار اور اقرار کے جان لیوا چکر میں پھنسی ہوئی تھی اس کا جی چاہا کہ منصور کے سامنے اپنی ماں کی ہستی کو بے نقاب کر دے اپنے رسوائے عالم خاندان کا پول کھول دے انہیں بتا دے کہ وہ سماج کے گندے اور کرم خوردہ عنصر کی اولاد ہے وہ نسوانیت کے بلند درجے سے پٹخی ہوئی ماں کی بیٹی ہے۔ اس کے لب پھڑپھڑائے۔

"جانے آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ اس نے انتہائی مایوسی سے کہا۔ منصور تڑپ اٹھے وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ ناہید اور ان کے درمیان دولت کی حد بندیاں حائل ہیں۔ ناہید ان حد بندیوں کو توڑنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اس کے ان مایوس الفاظ نے منصور کو تڑپا دیا۔ وہ ان کی طرف کمر کئے بیٹھی تھی۔ منصور اس کے لہراتے ہوئے بالوں کو محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ناہید...... میں آپ کو انسان سمجھتا ہوں۔ انسان جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا"۔

ناہید کانپ گئی۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر کہے۔ کہ ذرا سی بھول پر اسی انسان کو جنت سے بھی نکالا گیا تھا۔ لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر لاتے لاتے رہ گئی۔

"مجھے ان بلندیوں پر نہ لے جایئے جہاں سے گرنے کے بعد میرا کچھ بھی باقی نہ بچے"۔

اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا منصور نے بے قراری سے کروٹ بدلی۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ ان کی آواز شدت جذبات سے کچھ لرز رہی تھی۔

"ناہید میں نہ کسی مغالطے میں رہنا چاہتا ہوں۔ نہ آپ کو رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو کسی بلندی پر نہیں پہنچایا۔ آپ کا مقام وہی ہے جو پہلے تھا۔ آپ اب تک اس بلندی پر ہیں۔ جہاں میری نظروں نے روز اول آپ کو دیکھا تھا۔ بڑے بڑے کٹھن لمحے آئے لیکن یہ بلندی لازوال تھی لازوال ہی رہی"۔ وہ سانس لینے کو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

رکے..... قدرے توقف کے بعد پھر بولے "مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی باک نہیں کہ پہلے ہی دن سے میں نے اپنی ہستی کو آپ کی ذات میں کچھ اس طرح تحلیل پایا کہ الگ کرنے کی گنجائش ہی نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ آپ بلندیوں سے گرانے کے بعد اگر آپ کا کچھ نہ بچے گا۔ تو میرا بھی کچھ باقی نہ رہے گا۔"

وہ کچھ دیر کوڑ کے ناہید اسی طرح اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ان کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی۔ وہ رو رہی تھی یا چپ تھی منصور کو کچھ پتہ نہ چل سکا۔

"ناہید میں آپ سے رحم کی بھیک نہیں مانگتا۔ نہ ہی اپنی موجودہ حالت پر آپ کا ترس کھا کر ہمدردی جتلانا مجھے تسکین دے سکتا ہے میں اپنے ٹھوس عشق اور اپنی دیوانہ وار محبت کے بدلے میں کچھ ایسے ہی جذبات کا متمنی ہوں"۔ وہ کچھ دیر ناہید کی پشت پر نظریں جمائے اپنے سانس کی آمدورفت کو بحال کرتے رہے۔

"اگر آپ کا دل ایسے جذبات سے عاری ہے۔ تو پھر آپ تشریف لے جا سکتی ہیں" وہ نڈھال ہو کر گر گئے "میں آپ کی کرم فرمائیوں کا مشکور ہوں"۔

ناہید کی نرم اور گلابی ہتھیلیوں پر آنسوؤں کے قطرے گلاب پر شبنم کی طرح لرز رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ منصور کے سامنے اعتراف کر لینے کی اس نے کوشش کی تھی۔ لیکن انہوں نے جس انداز میں اپنی محبت کا ذکر کیا تھا اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ان نظروں سے گرنا نہ چاہتی تھی جن میں وہ حوروں کا تقدس پا چکی تھی۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

اور اس کی خاموشی سے منصور کا دل ڈوبنے لگا۔ ان کی نظروں کے سامنے اس دن بازار میں تانگے میں مسکراتی ہوئی ناہید کی تصویر ابھری جس کے قدموں پر ایک نوجوان جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ اس قدر مضطرب ہوئے۔ کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

"ہو سکتا ہے"۔ وہ نڈھال لیٹے ہوئے ست آواز میں بولے "آپ کا دل کسی اور کے لئے ایسے ہی"...... لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ناہید زخمی ناگن کی طرح تلملا کر پلٹی۔

"آپ میری توہین کر رہے ہیں" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ آنسو پارے کی طرح اس کے پیازی پیازی گالوں سے پھسل رہے تھے۔ اس کی گھنی پلکوں کی تیز نوکوں پر سچے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ بے اختیار روئے جا رہی تھی۔

"بخدا روئیے نہیں ناہید" منصور بے چارگی سے بولے "آپ کے آنسوؤں سے مجھے قلبی دکھ پہنچ رہا ہے"۔

ناہید کے آنسو سیلاب کی طرح امنڈے ہوئے تھے۔ دل کا سارا غبار دھل رہا تھا۔

"آپ مجھے مار مار کر جلا رہی ہیں۔ اور جلا جلا کر مار رہی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے اپنے ہاتھوں سے ابھی میرا گلا گھونٹ دیجیے۔ میں لمحے لمحے کی موت نہیں مر سکتا ناہید" انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا "میں کچھ نہیں سمجھ سکا مجھے سمجھا دیجئے کچھ تو سمجھا دیجئے۔

ناہید ڈر گئی۔ کہیں پھر نہ چکر آ جائے۔ منصور کی سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ ان کا زرد چہرہ گہرا سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ابھر آئے تھے اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ منصور سر پکڑے آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ وہ کچھ لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ بے حد گھبرا رہی تھی۔

جلدی سے اٹھ کر وہ ان پر جھک گئی۔ آہستگی سے ان کے ماتھے پر رکھے ہوئے ہاتھ ہٹائے ان کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ ناہید نے کمبل کھینچ کر ان کی گردن تک کر دیا۔ منصور نے آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔ وہ اب تک ان کے دیکھئے اک معمہ تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

"ناہید میں کچھ نہیں سمجھ سکا" وہ اسے دیکھتے ہوئے بڑی کمزور آواز میں بولے "بخدا مجھے صاف صاف کہہ دیجیے"۔

"کیا کہہ دوں" ناہید مسکرا دی۔ منصور کی حالت سے وہ سہم گئی تھی طبیعت پر جبر کر کے مسکرانے لگی۔

"میں کیا سمجھوں" وہ بولے۔

"جو سمجھ کر آپ کا دل مطمئن ہو جائے"۔ اس نے اک حیاء آلود تبسم سے انہیں دیکھ کر کہا۔

"ناہید" منصور وفور مسرت سے چیخے۔

"آرام سے لیٹے رہیئے" یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ناہید گھر نہ گئی۔ یاسمین کے ساتھ والا کمرہ اس کے لئے ٹھیک کروا دیا گیا۔

منصور کے دل و دماغ میں رینگتے ہوئے اندیشوں نے دم توڑ دیا تھا۔ وہ بڑی سرعت سے صحت پکڑ رہے تھے۔ رات کو گہری نیند سوتے تھے۔ اور بے فکری کی گہری نیند ان کی صحت کی بحالی کیلئے مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ ان کی رنگت کی کھوئی ہوئی سرخی عود آئی تھی۔ وزن بڑھ رہا تھا۔ اور وہ اپنی اصلی حالت پر آتے جا رہے تھے۔ مس انجلینہ ابھی یہیں تھی۔ لیکن ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ناہید پر ہی تھی یہ ایسا فرض تھا جس کی ادائیگی اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

منصور کی صحت کے پیش نظر ناہید نے اپنے ماضی کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ کر وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ لیکن رات کی تنہائیوں میں جب یہ احساس جھنجھوڑتا تو گھنٹوں اس کی نیند غائب ہو جاتی۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا اسے کچھ سمجھ نہ آتی کہ کیا کرے منصور کی محبت کا جواب دے کر اس نے غلطی کی تھی یا صحیح قدم اٹھایا تھا۔ وہ اب تک یہ مسئلہ حل نہ کر سکی تھی۔

سردیوں کی ایک روشن صبح تھی۔ کھڑکیوں کے بھاری پردے اٹھا دیئے گئے تھے۔ ہلکی ہلکی زرد دھوپ اندر آ رہی تھی۔ کمرے کی ہر چیز چمک اٹھی تھی۔ اونچی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔ دھوپ کی زد میں منصور کے لئے آرام کرسی بچھی ہوئی تھی۔ قریب ہی چھوٹی سی میز پر اخبار پڑا تھا۔ دوسری بلوریں میز پر منقش راکھ دان اور سگریٹ کیس پڑا تھا منصور اب اپنی خواب گاہ میں اٹھ کر تھوڑی دیر کیلئے چل پھر لیتے تھے۔ وہ اس وقت الماری کے قریب کھڑے کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے۔ مطلوبہ چیز نکال کر الماری بند کر کے وہ آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ سفید گرم ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ کوئی یونانی دیوتا دکھائی دے رہے تھے۔

مالی پھول لے کر آیا تھا۔ ناہید پھول گلدانوں میں بڑے قرینے سے سجا رہی تھی۔ گہرے کاسنی ریشمی کپڑوں پر سرخ سویٹر بڑا پیارا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بالوں کو سرخ ریشمی سکارف سے باندھ رکھا تھا۔ اور کانوں میں موٹے موٹے سرخ موتی لٹک رہے تھے ان کے چہرے پر ان پھولوں سے زیادہ شگفتگی اور تر و تازگی تھی مس انجلینہ کونے والی میز پر جھکی ہوئی ٹمپریچر چارٹ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

"بڑی سردی ہے آج تو" منصور کی آواز پر دونوں نے ان کی طرف دیکھا انجلینہ کے پہنچنے سے پہلے ہی ناہید نے ہلکا سفید گرم کمبل ان کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"شکریہ" منصور بڑی گرمجوشی سے مسکرائے ان کے ہاتھ میں آج پھر وہی سفید ڈبی تھی۔ جس میں پلاٹینم کی خوب صورت اور بیش قیمت انگوٹھی چمک رہی تھی۔

مس انجینہ چارٹ لے کر چلی گئیں۔ مالی باقی ماندہ پھول اکھٹے کر کے کمرے سے نکل گیا۔ ناہید گلدانوں کو ان کی موزوں جگہ پر رکھنے میں منہمک تھی۔ منصور نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ان کی طرف پشت کئے وہ کونے کی اونچی میز پر گلدان رکھ رہی تھی۔

" اف " منصور کے منہ سے نکلا۔ ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔

ناہید گھبرا کر پلٹی۔ منصور اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو سہلا رہے تھے ہونٹوں کو یوں کاٹ رہے تھے۔ جیسے سخت تکلیف ہو رہی ہو۔ ناہید جلدی سے ان کے پاس آ گئی۔

"جانے کیا ہو گیا ہے ہاتھ کو" وہ ہاتھ کو جھٹک کر بولے "سوئیاں سی چبھ رہی ہیں..........اف"۔

ناہید پہلے تو جھجکی لیکن ان کی تکلیف کب برداشت کر سکتی تھی۔ گھبرا کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے سہلانے لگی۔ دوسرے ہی لمحے منصور نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا ناہید ان کی شرارت پر محجوب ہو گئی۔ گھبرا کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔

"چھوڑیئے نا" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اوں ہوں"۔ منصور ہنسے اور ہاتھ کو زور سے دبایا "اتنی مشکلوں سے ہاتھ میں آیا ہوا یہ ہاتھ ایسے ہی تھوڑا چھوٹے گا"۔

ناہید نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

"کوئی نہیں ہے" منصور اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔ ناہید کو ٹھنڈ کے باوجود پسینہ آ گیا۔

"بیٹھیئے" منصور نے اسے اخبار ہٹا کر میز پر بٹھا دیا۔ ناہید ہاتھ چھڑانے کی جتنی کوشش کر رہی تھی۔ منصور اتنی ہی مضبوطی سے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ ہار کر اس نے کوشش چھوڑ دی۔

"بس ہتھیار ڈال دیئے"۔ منصور مسکرائے ناہید نے سر جھکا لیا اس کا چہرہ سویٹر ہی کی طرح سرخ تھا۔ دوسرے ہاتھ سے منصور نے سفید ڈبیہ کھول کر چمکتی ہوئی انگوٹھی نکال۔ لحہ بھر بڑے پیار سے اسے دیکھتے رہے پھر بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"خدائے بزرگ و برتر کو حاضر و ناضر جان کر میں اپنی محبت کی نشانی کے طور پر یہ انگوٹھی پہنانا چاہتا ہوں"۔

ناہید کیلئے یہ لحہ موت سے کم نہ تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی عمودی چٹان پر کھڑی ہے۔ توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اسے ہر حال میں گرنا ہے جدھر بھی گرے خوف ناک کھڈیں منہ کھولے اسے نگل جانے کو ہیں۔ تو پھر کیوں نہ اس طرف کود جائے۔ جس طرف عمیق کھڈ کے سرے پر منصور بازو پھیلائے اسے تھام لینے کو کھڑے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے کود جانے کے زور سے منصور بھی اس کے ساتھ ہی تباہی کے اس عمیق اور گہرے غار میں گر جائیں۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اپنے مضبوط بازوؤں میں اسے سمیٹ کر ان ڈراؤنے غاروں سے دور لے جائیں۔

ایک بار اس نے پھر اعتراف حقیقت کرنا چاہا۔ منصور کی دیوانگی کی حدوں تک پہنچی ہوئی محبت سے اسے ڈھارس تھی۔ اس کی ماں طوائف تھی۔ آخر اس کا قصور بھی کیا ہے۔ ماں کے کئے کی سزا وہ کیوں بھگتے اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتی منصور انگشتری اس کی انگلی میں پہنا چکے تھے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ کو آہستگی سے سہلایا۔ ان کی روح کیف و انبساط سے جھوم رہی تھی۔ ان کی آنکھیں محبت کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ ناہید نے انہیں دیکھا لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ منصور نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا، جانے شرم و حیا کی پھیلتی ہوئی سرخی چھپانے کیلئے یا کرب و اذیت کی ابھرتی ہوئی لہروں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے۔۔

منصور بڑی چاہت سے اس کی مخروطی انگلیوں کو دیکھ رہے تھے۔ انگوٹھی بڑی مشکلوں کے بعد اپنے صحیح مقام پر پہنچ ہی گئی تھی آخر۔

ناہید اس دن منصور کے پاس جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ شام کو شیریں اسے ملنے آ گئی۔ ناہید کی انگلی پر لپٹے ہوئے۔ رومال کو اس نے تعجب سے دیکھا۔ ناہید نے ہاتھ چھپا لیا..........

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" شیریں ہنستے ہوئے بولی "میں بھی دیکھ کے رہوں گی"۔

بڑی جدوجہد کے بعد اس نے ہاتھ کھینچا۔ رومال ہٹایا۔ چمکتی ہوئی انگوٹھی دیکھ کر وہ شوخی سے مسکرائی۔

"چوری چوری سب کچھ طے کر لیا۔ آج سے ہماری تمہاری دوستی ختم" اس نے جان بوجھ کر ناراضگی کا اظہار کر دیا۔ ناہید نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اور شیریں ہنس دی۔

شیریں دوسرے تیسرے دن اسے ملنے آیا کرتی تھی۔ دونوں کی دوستی میں ابھی تک وہی خلوص تھا۔ اس کے آنے سے ناہید کو بڑا سکون ملتا تھا۔ گو اس کی چھیڑ چھاڑ سے وہ گھبرا بھی جاتی تھی۔ پھر بھی وہ اسے پسند تھی۔ اس کی باتیں اور اس کی حرکتیں دل خوش کن تھیں۔

"ارے بھئی" شیریں بولی "ہمیں تو بڑی مدت کا الہام ہو چکا تھا۔ تم ہی چھپا رہی تھیں۔ سب باتیں" ناہید شرما گئی۔ اور پھر شیریں کے بار بار پوچھنے پر اس نے انگوٹھی کا قصہ شرمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سنا دیا۔

"اب اسے چھپائے کیوں پھر رہی ہو"۔ شیریں نے کہا کیوں کہ ناہید پھر انگلی پر رومال لپیٹ رہی تھی۔

"باجی سے شرم آتی ہے"۔ ناہید محجوب سی ہو رہی تھی۔

چائے پر یاسمین نے بھی ان کی صحبت میں شرکت کی۔ بڑی پر لطف باتیں ہوتی رہیں اور جب شیریں جانے لگی۔ تو اس نے ہنس کر یاسمین کو کہہ ہی دیا۔

"ناہید کی انگلی کٹ گئی"۔

"کیسے" یاسمین ہڑبڑا کر بولیں۔ ناہید شیریں کی اس غیر متوقع شرارت پر بوکھلا گئی اور جب یاسمین نے زبردستی انگلی دیکھی تو پلاٹینم کی انگوٹھی خندہ زن تھی۔ ناہید شرم سے کٹ رہی تھی۔ اور شیریں کو لطف آ رہا تھا۔

"اس بے چاری کو تو پتہ ہی نہیں چلا۔ نواب صاحب نے پہنا دی"۔ شیریں ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

یاسمین کے چہرے پر بشاشت سے گلابی رنگ آ گیا۔ انہوں نے بڑھ کر بڑی محبت سے ناہید کی روشن پیشانی چوم لی۔ ناہید نے بے اختیار ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

اور منصور کے جشن صحت پر ان دونوں کی باقاعدہ منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔ یاسمین نے ناہید کو مرصع طلائی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کنگن نشانی کے طور پر پہنا دیئے...... اور منگنی کا یہ اعلان اگر بیگم وقار کے وقار پر تازیانے کی طرح لگا تو بیگم رحمان پر بھی بم بن کر پھٹا ناہید کو تو کچھ کہہ نہ سکی تھیں البتہ شیریں کو جی بھر کر کوسا۔

............○............

۱۷

زلفی کافی عرصہ بیمار رہے گو بیماری کوئی سنجیدہ قسم کی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی صحت کافی گر گئی تھی۔ منصور کی بیماری کی انہیں اطلاع ملی تھی۔ لیکن مجبوری کی بنا پر آنہ سکے تھے ہسپتال سے ڈسچارج لینا مشکل تھا۔ اور پھر انہیں منصور کی بیماری کی معمولی طور پر ہی اطلاع دی گئی تھی۔ اس کی سنجیدگی کا قصداً ذکر نہ کیا گیا تھا۔ جب زلفی کو ان کی صحت یابی کا تار ملا تو ان کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے تھے۔ جشن صحت یابی میں شرکت کی انہوں نے بڑی کوشش کی۔ ڈاکٹر کو رخصت دینے پر مجبور کیا۔ لیکن اس نے سفر کی اجازت نہ دی۔

ڈسچارج ہو کر ابھی گھر آئے چند ہی دن گزرے تھے کہ انہیں منصور کی شادی کا تار ملا۔ اب تو نہ دیر کرنے کی ضرورت تھی۔ نہ ان میں ہمت۔ رخت سفر باندھا اور عازم وطن ہو گئے۔ قصر رعنا پہنچ کر جب منصور اور زلفی بغل گیر ہوئے۔ تو دونوں کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

"تم کس قدر کمزور ہو گئے منصور" وہ انہیں چھاتی سے لگائے ہوئے بولے "میں کس قدر تڑپا آنے کیلئے کم بخت ڈاکٹر نے اجازت ہی نہ دی"۔

"شکر کیجیئے آپ یہاں تھے نہیں" صدیق بولے "مجھے تو جب وہ وقت یاد آتا ہے تو کانپ جاتا ہوں۔ کوئی خدا ہی کی مہربانی ہوئی۔ ورنہ امید تو کوئی نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر ہڈسن تو قطعاً مایوس ہو چکے تھے"۔

اور آپ بھی تو پہچانے نہیں جا رہے"۔ منصور ابھی تک زلفی کے بازوؤں میں بازو ڈالے ہوئے تھے۔

"یہ تو تمہاری زیادتی ہے۔ اتنا کمزور تو نہیں ہوا"۔ زلفی ہنسے۔

"شکر ہے گردش کے دن خدا نے پھیر دیئے۔ ایک طرف آپ کی بیماری کا خیال تھا۔ دوسری طرف ان کی" یاسمین بولیں "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جس نے یہ دن دکھایا"

دوسری رات سب قصر رعنا کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کھانا کھا کر سب ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ بڑی دیر تک منصور کی بیماری کی باتیں ہوتی رہیں۔ زلفی سن سن کر لرز اٹھے۔ ہر کوئی اپنا بیان بڑی وضاحت سے دے رہا تھا۔ منصور کھڑکی کے قریب کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کی باتیں سن سن کر انہیں بھی تعجب ہو رہا تھا۔ انہیں یقین نہ آرہا تھا۔ کہ وہ اتنے کٹھن دور سے گزرے ہیں۔

باتوں ہی باتوں میں ناہید کا ذکر آگیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"وہ ہمارے لئے باعث صدر حمت ہوئیں"۔ یاسمین بڑے پیار سے ناہید کے متعلق اظہار خیال کر رہی تھیں۔

"وہ تمہارا در نایاب" زلفی چچا نے یاسمین کو چھیڑا۔

"یہ تو میں بھی کہوں گا زلفی ماموں" نواب صدیق بولے "وہ واقعی در نایاب ہیں"۔ شوہر کی طرف داری سے یاسمین نے اک فخر سا محسوس کیا۔

"جس خلوص اور جانفشانی سے انہوں نے منصور کی تیمار داری کی ہے مجھے تو ان سے کچھ دلی عقیدت ہو گئی ہے"۔ نواب صدیق کی بہن صابرہ بیگم بولیں "اور شکل صورت بھی تو قدرت نے ایسی بنائی ہے۔ کہ دیکھنے سے طبیعت سیر ہی نہیں ہوتی۔

"آپ سب پر تو جیسے انہوں نے جادو کر دیا ہے"۔ زلفی ہنستے ہوئے بولے "سبھی انہیں کی تعریف میں مصروف نظر آ رہے ہیں"۔

"آپ دیکھیں گے تو جان جائیں گے" یاسمین بولیں "کہ ہمارے بیان میں کتنی صداقت ہے"۔

منصور بظاہر ان باتوں پر کوئی دھیان دیئے بغیر سگریٹ پینے میں مصروف تھے لیکن ان کا رواں رواں سرشار تھا۔ ناہید نے ان کے خاندان والوں کی نظر میں بھی اک بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہ بات ان کے لئے صدہا خوشیوں کا باعث تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کے گرم سوٹ میں ان کا چہرہ بڑا ہی دلفریب نظر آ رہا تھا۔

نواب صدیق ان کی بہن اور یاسمین سبھی ناہید کے والہ وشیدا نظر آتے تھے۔ بڑی دیر تک اسی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

"ان کے والدین نہیں ہیں"۔ یاسمین کو جیسے روحانی صدمہ ہو رہا تھا ۔ دنیا میں کوئی نہیں جسے اپنا کہہ سکیں" وہ اپنا ریشمی زرد دوپٹہ بے چینی سے مسل رہی تھیں۔ جس پر کالی گوٹ لگی ہوئی تھی ۔

"ہم تھوڑے ہیں" زلفی ہنستے ہوئے بولے "کیوں صدیق"۔

"میرا مطلب ان کے رشتہ داروں سے تھا" یاسمین بڑی افسردگی سے کہہ رہی تھیں "آج کل بڑی پژمردہ سی رہتی ہیں" منصور نے پلٹ کر یاسمین کو دیکھا۔ ٹائی کی گرہ جیسے گلے میں پھنس رہی تھی۔

مجھے خود بڑا ترس آتا ہے ان پر" صابرہ بیگم بولیں۔

"یہ مشرقی لڑکیاں شادی سے پہلے یونہی بسورا کرتی ہیں"۔ زلفی بولے "وہ بھی اس پرانی روائت کو زندہ رکھنے کے لئے مغموم رہنے کی کوشش میں ہونگی۔ ورنہ ان کے افسردہ ہونے کی وجہ تو بظاہر کوئی نہیں"۔

"اور سنو" صابرہ بیگم بولیں "یہ کیا کم وجہ ہے زلفی ماموں۔ نہ گھر بار نہ ماں نہ باپ"۔

یاسمین ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

"ماں باپ نہ تھے۔ کوئی قریبی عزیز ہی ہوتا۔ جب بھی اتنی آزردہ نہ ہوتیں کم از کم اپنے گھر سے رخصت کرنے والا تو ہوتا"۔

زلفی کو ناہید کے حالات کچھ بھی معلوم نہ تھے۔ جس انداز سے دونوں خواتین گفتگو کر رہی تھی۔ زلفی بڑے متاثر ہوئے۔

"یاسمین کی شادی یاد نہیں" صابرہ بیگم بولیں" اللہ کے فضل سے سب کچھ تھا باپ کی کمی یاسمین کس

طرح محسوس کر رہی تھیں۔ غش پر غش آ رہے تھے۔ رخصتی کے وقت"۔

یاسمین کو وہ وقت یاد آگیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے محفل کچھ سوگوار سی ہوتی جا رہی تھی۔ زلفی نے ہنس کر پانسہ پلٹ دیا۔

"بھئی یاسمین کے غش کھانے کی اور وجوہ بھی تو ہو سکتی تھیں" زلفی ہنس کر بولے............ شوخ نظروں سے یاسمین کو دیکھا اور پھر شرارت سے بولے "ہو سکتا ہے یاسمین کو زبردستی صدیق کے پلو سے باندھا جا رہا ہو۔ اور اس بات پر............"

"اوئی اللہ" یاسمین چیخیں "زلفی چچا آپ تو خواہ مخواہ کی باتیں بنا دیتے ہیں"۔

یاسمین کے سٹ پٹانے پر سب ہنس دیئے۔ محفل کا رنگ بدل گیا۔ صدیق تو دل کھول کر ہنسے۔

"کیوں یاسمین یہ بات تم نے آج تک مجھے نہ بتائی" وہ بولے۔

"بڑے دل گردے کی عورت ہیں پہاڑ بھی سر پر آ گرے پرواہ کرنے والی نہیں۔ آخر کو تو ہماری بٹیا ہیں"۔ زلفی بھی ہنس کر بولے یاسمین کھسیانی ہو گئیں۔

"ذکر تو ناہید کا ہو رہا تھا آپ سب میرے پیچھے ہی پڑ گئے" وہ اب تک جھینپ رہی تھی۔

"ناہید کیا ہوا۔ در نایاب کہو"۔ زلفی نے ستانے کو کہا۔

"در نایاب ہی سہی" وہ جل کر بولیں۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہاں رہنے سے انہیں ذہنی کوفت ہو رہی ہو گی" نواب صدیق بولے" وہ بڑی غیور اور حساس لڑکی ہیں"۔

"وہ یہاں ہیں" زلفی تعجب سے بولے۔

"اور کہاں جائیں" یاسمین نے کہا اپنے ہلکے زرد رنگ کے ریشمی سوٹ کا کامدانی کام دیکھتے ہوئے وہ کسی سوچ میں کھو گئیں۔

"میں نے تو انہیں دیکھا ہی نہیں" زلفی بولے۔

"آپ شادی کے بعد ہی دیکھ سکیں گے" صابرہ بیگم اپنا سفید دوپٹہ شانوں پر ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔

"رونمائی تیار رکھیئے"۔

"اگر میں ابھی دیکھنا چاہوں تو"۔ زلفی نے بڑے شوق سے کہا۔

"یہ تو میرے خیال میں ممکن نہ ہو گا"۔ یاسمین مسکرائیں "میں نے ان کا سب سے پردہ کرا دیا ہے"۔

"منصور سے بھی"۔ زلفی حیرانگی سے بولے۔ منصور جانے کب کمرے سے جا چکے تھے۔

"اور کیا"۔ یاسمین ہنسیں "ان سے پہلے اوروں سے بعد میں"۔

"بڑی عجیب بات ہے" زلفی بولے۔ آزاد خیال چچا کو جانے کیوں یہ بات بڑی ہی عجیب لگ رہی تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

منصور نے جس دن سے ناہید کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ ناہید کی جھجک بہت بڑھ گئی تھی۔ اور منگنی کی رسم ادا ہونے کے بعد تو شرم و حیا کے یہ فطری جذبے کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ یاسمین نے جنہیں المڑ جوانی کی نفسیات سے آگہی تھی۔ یہی مناسب سمجھا کہ اس کا منصور سے باقاعدہ طور پر پردہ کرا دیا جائے۔ اس انوکھی وضعداری پر منصور یاسمین سے بچوں کی طرح الجھے تھے۔ بڑی بڑی دلیلوں سے قائل کرنا چاہا تھا...... وہ بیماری کے دوران میں دن رات ان کے پاس رہی تھی۔ آخر اب پردے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ناہید کے حجاب اور جھجک کے پیش نظر یاسمین نے ایسا کیا تھا۔ منصور کو ایسی میٹھی ڈانٹ دی کہ دوبارہ انہیں اصرار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

منصور سے ناہید کا پردہ جب کہ پہلے سے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ زلفی کی نظروں میں کوئی مستحسن فعل نہ تھا۔ "منصور سے پردہ کروانا فضول تھا یاسمین"۔ زلفی بولے۔

"زلفی چچا اس میں بھی کچھ مصلحت ہے۔ ناہید کی طبیعت میں قدرتی جھجک ہے دوسرا بڑی حساس بھی ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا نا کہ وہ بڑی افسردہ رہتی ہیں آج کل۔ اس طرح الگ تھلگ کرنے سے انہیں بڑی حد تک ذہنی سکون مل رہا ہے"۔ یاسمین نے اپنی منطق پیش کی۔

"میں نے تو رائے دی تھی۔ کہ انہیں فیض آباد والی کوٹھی میں منتقل کر دیا جائے۔ صدیق نے کہا۔

"وہیں سے رخصت ہوں۔ برات وہیں جائے"۔

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے"۔ یاسمین بولیں۔ "وہ اس بات کو شدت سے محسوس کر رہی ہیں کہ ان کا گھر بار نہیں"۔ یاسمین کو ویسے بھی برات دیکھنے کا ارمان تھا۔ اور قصر رعنا میں ہی شادی انجام پاتی تو انہیں یہ خواہش کچلنا پڑتی تھی۔

"فیض آباد جانے کی کیا ضرورت ہے"۔ زلفی شاید یاسمین کی خواہش کو پا گئے تھے مابدولت کی ذات بابرکات کس کام آئے گی آخر۔ قصر فردوس میں بھیج دیجئے انہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم ہی باپ بن جائیں گے۔ منصور کی دلہن کو افسردہ تو ہم دیکھنے سے رہے"۔

زلفی کی بات پر سب ہنس دئے۔ لیکن جب انہوں نے سنجیدگی سے کہا...... "اتنی سی بات سے اگر کسی کے جذبات مجروح ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ تو پھر تاخیر نہیں کرنی چاہئے"۔

زلفی نے ناہید کو قصر فردوس نے جا کر ایک باپ کی طرح پورے اہتمام سے رخصت کرنے کی تجویز پیش کی۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ یاسمین کی تو خوشی کی حد نہ تھی۔ ان کا ارمان پورا ہو جائے گا۔ منصور کی بارات پوری شان و شوکت سے جائے گی۔ یہی وہ چاہتی تھیں۔

"ناہید سے پوچھوں گی" یاسمین کچھ سوچتے ہوئے بولیں "اگر وہ مان گئیں تو انہیں قصر فردوس میں منتقل کر

دیا جائے گا"۔

وہ سب باتوں میں مشغول تھے اور منصور لمبے لمبے برآمدوں کو طے کرتے ہوئے چوڑی بالکنیوں سے ہوتے ہوئے تیزی سے ناہید کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ ناہید کے متعلق انہوں نے یاسمین سے دو ایک بار پہلے بھی سنا تھا کہ وہ بڑی مضمحل رہتی ہیں۔ اب بھی وہ زلفی چچا کو یہی کہہ رہی تھیں۔ ناہید کو دیکھے بڑے دن ہو چکے تھے۔ جب سے یاسمین نے پابندی لگائی تھی وہ اس پابندی کی پابندی بڑی پابندی سے کر رہے تھے۔ لیکن آج ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ ناہید کا اضمحلال ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔

ناہید کے کمرے میں روشنی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ کمرے کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلا تھا اور پردہ ہوا سے آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ روشنی ایک لکیر کی صورت میں برآمدے میں پڑ رہی تھی۔ روشنی کی یہ لکیر پردے کے ہلنے سے کبھی پھیل رہی تھی۔ کبھی سکڑ رہی تھی۔ جانے کیوں منصور بے دھڑک اندر جانے کی جرأت نہ کر سکے۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے ہوئے اندر جانے کے متعلق سوچنے لگے۔

کھڑکی کا پردہ ہوا سے اٹھا منصور نے دیکھا ناہید اپنے پلنگ پر الٹی لیٹی تھی۔ سرخ شنیل کی چمکتی ہوئی رضائی اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کے ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ نرم نرم لچکیلے تکیوں پر بازوؤں کا حلقہ سا کئے وہ اپنے ہاتھ میں پڑی ہوئی منصور کی پہنائی ہوئی انگوٹھی کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ پردہ گر گیا منصور کو ہوا کی یہ چھیڑ بڑی ناگوار گزری۔ ہوا کا جھونکا پھر آیا۔ پردہ پھر اٹھا۔ ناہید کروٹ بدلے لیٹی تھی۔ اس کا منہ کھڑکی کی طرف تھا۔ اس کا چہرہ واقعی اترا ہوا تھا لیکن حسن ہر رنگ میں حسین تھا۔ وہ اب بھی انگوٹھی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پردہ پھر گر گیا۔ کچھ دیر آہستہ آہستہ لرزتا رہا۔ منصور کو سوائے سرخ رضائی کے کچھ نظر نہ آ سکا۔ ایک تیز جھونکا آیا۔ لرزتا ہوا پردہ اڑا۔ ناہید کا ہاتھ اس کے لبوں کے قریب تھا۔ بڑی محبت سے اس نے انگوٹھی کو چوم لیا۔ منصور کو جیسے اپنی محبت کا جواب مل گیا۔ ان کے دل کا پیمانہ خوشیوں کی شراب سے لبریز تھا۔ پردہ گر گیا۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ جو وہ ناہید کی آنکھوں کے پردے سے بہتے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکے۔ ناہید کی مسرور تنہائیوں میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھ کر منصور شاداں و خرماں لوٹے ہوا سرد تھی۔ رات سہانی منصور گنگناتے ہوئے تیز قدموں سے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ قصر رعنا کے خاموش در و دیوار ایک مسرور ہنگامے کی لپیٹ میں آئے ہوئے تھے۔ تیاریاں بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھیں۔ ناہید کے لئے قیمتی اچھوتے اور دیدہ زیب ملبوسات تیار ہو رہے تھے۔ جدید و قدیم وضع کے زیورات تیار ہو رہے تھے۔ ہیرے موتی افزائش حسن کے لئے نئی نئی قسم کے زیورات میں لگائے گئے تھے۔ جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہمانوں کو بلاوے بھیجے جا رہے تھے۔ اور نواب منصور کا تقریباً سارا کنبہ قصر رعنا میں جمع تھا ہر متنفس کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یاسمین کو تو سانس لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ بڑی مدت کی تمنا بر آئی تھی۔ ایک ہی ایک بھائی تھے۔ وہ یہ شادی بڑے تزک و احتشام سے کرنا چاہتی تھیں۔ دولت کی فراوانی تھی اسلئے ان کی خواہش نہ پوری ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی۔ جوں جوں دن قریب آ رہے تھے یاسمین کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انہیں یہی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کوئی کام بھی مکمل نہیں ہوا۔ سب کام ادھورے پڑے ہیں۔ محل کے سینکڑوں خدام اور کنیزیں ان کے اشارے پر ناچ رہے تھے۔ اور محل کے منتظمان کو تو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔

اور ناہید کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی شادی نہیں موت کا دن قریب آ رہا ہے وہ ہر وقت اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہتی۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا۔ ”تو نے منصور کو دھوکہ دیا ہے۔ تو نے ان کے خلوص سے بیمانہ کھیل کھیلا ہے۔ تو نے ان کے عشق سے غاصبانہ چال چلی ہے۔ تجھے سب کچھ بتا دینا چاہئے تھا کچھ بھی چھپانا نہیں چاہئے تھا۔ یہ آئین وفاداری کے خلاف ہے۔ یہ وضعداریٔ عشق کے منافی ہے۔ اس کا انجام بڑا بھیانک ہو گا بڑا دلدوز ہو گا“۔

ضمیر کی یہ آواز سنتے سنتے ناہید کا دماغ کچے پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا اسے اپنی غلطی کا اعتراف تھا اپنے جرم کا احساس تھا۔ بارہا اس نے ارادہ کیا تھا لیکن ایک دفعہ بھی کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ شاید یہ اس کی اخلاقی کمزوری تھی۔ یا قصداً اس نے منصور کے سامنے اپنے ماضی کو عریاں نہ کیا تھا۔ وقت گزر چکا تھا وہ کہنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی تھی یہ بوجھ جہاں تھا وہیں رہا اور اس بھاری بوجھ کے نیچے اس کی پاکیزہ روح چیخ رہی تھی اس کا ضمیر تلملا رہا تھا۔ وہ اپنی آگ میں آپ ہی جل رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا معلوم ہونے لگتا وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ ”اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں ایک طوائف کی بیٹی ہوں تو کیا ہو گا............“ اس کی روح تک لرز اٹھتی۔ اس کا دل بیٹھنے لگتا اسے محسوس ہوتا کہ اس نے آگ سے بچنے کے لئے جیسے انگاروں پر پاؤں رکھ دیئے ہوں۔ ایک کھائی سے بچنے کے لئے اس سے عمیق اور گہری کھائی میں کود گئی ہو۔ معمولی خطا کو چھپانے کے لئے بہت بڑے جرم کی مرتکب ہو گئی ہو۔

اس کے حواس پر اک نامعلوم سا خوف چھاتا جا رہا تھا۔ یہ خوف ماضی کا نہ تھا مستقبل کا تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ماضی اس کا تعاقب کرتے کرتے ہار گیا تھا اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا تھا۔ اور اب ماضی مستقبل کے روپ میں سامنے کی طرف سے اس پر جھپٹ رہا تھا۔ اور ہر گزرنے والا لمحہ اسے مستقبل کے زہر آلود پنجوں میں دینے میں کے لئے آگ کی طرف دھکیل رہا تھا۔

ناہید کے دن رات کش مکش میں گزر رہے تھے کبھی تو اس کی آنکھوں میں بنجر ویرانیاں گھر کر گئیں۔ اور کبھی آنسوؤں کے سوتے ابل پڑتے وہ کچھ اس طرح الجھی تھی کہ سلجھنے کا امکان ہی نہ رہا تھا۔

پہلے اس نے اسی ماضی سے خوف زدہ ہو کر اپنی محبت کا گلا دبو چا تھا۔ لیکن زندہ و جاوید محبت مر نہ سکی۔ منصور کی بیماری نے اس محبت کو غیر فانی بنا دیا۔ لیکن اپنے ذلیل خاندان کا احساس ناہید کے دماغ سے مٹ نہ سکا۔ اس نے کوشش کی کہ منصور کو سب کچھ بتا دے لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ کچھ اس خیال سے کہ وہ منصور کی محبت کو کھونا نہ چاہتی تھی۔ کچھ منصور کی کمزوری سے خائف تھی۔ یہ بات بم بن کر بھی توان پر گر سکتی تھی۔ ناہید نے خاموشی ہی کا مجبوراً سہارا لیا اور منصور کی انگوٹھی پہنا دینے کے بعد کچھ بتانا توان کی محبت کو کند چھری سے ذبح کرنے کے مترادف تھا۔ ناہید یہی سوچ کر چپ رہ گئی تھی لیکن احساس دن بدن شدید ہو رہا تھا۔ اس کا معمولی سا قصور خود اس کی نظروں میں ایک ناقابل معافی جرم بن چکا تھا۔

اور یاسمین اس کے اضمحلال اس کی پژمردگی اور افسردگی کی وجہ اس کا دنیا میں تن تنہا ہونا سمجھ رہی تھیں۔ سارے دن میں وہ بڑی مشکل سے دس پندرہ منٹ کے لئے اس کے پاس آتیں۔ اسے سمجھاتیں۔ تسلیاں دیتیں۔ ناہید ان کی موجودگی سے اور بے چین ہو جاتی اس وقت کا خیال کر کے کانپ جاتی جب یاسمین کو پتہ چلے گا محبت پاش نظریں قہر برسائیں گی اس ذلالت کے خیال ہی سے ناہید کا جیسے دم نکل جاتا اور کئی بار اس نے ہجوم افکار سے خودکشی کا ارادہ کیا۔ لیکن اس سے منصور کی ذات وابستہ تھی۔ اس کی خودکشی منصور کے لئے اک جلتا ہوا طعنہ بن جائے گی۔ ان کی رسوائی ہو گی۔ جگ ہنسائی ہو گی۔ اور ناہید کو منصور کی تضحیک مر کر بھی گوارہ نہ تھی۔

اک نورانی صبح سلطان پور کے بلند و پست پر پھیلی ہوئی تھی یاسمین اسے دیکھ کر بے چین ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ناہید کو چائے پلائی۔ بڑی محبت سے اسے چمکارتے ہوئے بولیں۔ ”تم تو پگلی ہو ناہید“۔ یاسمین کا اپنا دل بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اور ناہید کو ان کی موجودگی اور ان کی مخلص باتیں نوکیلے کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ اس کا دل شدت سے ملامت کرنے لگا۔

”آخر ماں باپ ساری عمر تھوڑا ہی ساتھ بیٹھے رہتے ہیں ہماری طرف دیکھو امی حضور کو منصور کے سہرے کے پھول دیکھنے کا کتنا ارمان تھا“۔ یاسمین کا دل بھرا ہوا تھا۔ کئی دنوں سے وہ والدین کی کمی کی خلش محسوس کر رہی تھیں۔ ماں کا نام لیتے ہی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور دوسرے لمحے وہ بے اختیار رو رہی تھیں۔ ناہید کو تسلی دیتے دیتے اپنا ہی پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ اور ناہید کو تو جیسے اک بہانہ مل گیا۔ وہ کچھ اس بے قراری سے روئی کہ اسے چپ کرانا محال ہو گیا۔ یاسمین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے اپنے آنسو جلدی سے پونچھ ڈالے وہ ناہید کو چپ کرا رہی تھیں۔

”بس اب چپ بھی ہو جاؤ میری اچھی بہن۔“ انہوں نے ناہید کی پیشانی چوم لی۔ آنسو اب بھی ان کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے تھے ان کا گلابی چہرہ تمتما رہا تھا ناہید کا سینہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کی سانس غیر متوازن ہو رہی تھی۔ اور اس کے دماغ کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شام کو یاسمین نے شیریں کو بلا بھیجا۔ اسی کے ذریعے ناہید کو قصر فردوس جانے کی تجویز سے مطلع کیا۔ جگہ کی تبدیلی شاید اس کے ہیجانی افکار کے لئے وجۂ تسکین بن جائے۔ اس خیال سے ناہید نے رضامندی دے دی اور دوسرے دن تین موٹریں قصر فردوس کی طرف جارہی تھی۔ صابرہ بیگم پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ ناہید اپنا سارا بوجھ شیریں کے کندھے پر ڈالے بے خودسی بیٹھی تھی۔ دوسری موٹروں میں خاندان کی معمر اور سنجیدہ عورتیں تھیں۔

قصر فردوس کے شان دار پورچ میں زلفی نواب صدیق کے ہمراہ کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔

"اب اترو بھی۔" شیریں نے موٹر کے پائیدان پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔

"باہر کون کون ہے۔" ناہید نے پوچھا۔ وہ زلفی اور صدیق کے سامنے اترتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"ایک تو غالباً تمہارے نندوئی ہیں۔" شیریں ہنس کر بولی۔ "اور دوسرے تمہارے والد بزرگوار۔"

ناہید نے سر جھکا لیا اسے شیریں نے بتایا تھا کہ زلفی ایک باپ کی طرح اس کی رخصتی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں باپ..... اس کے لئے یہ ایک بے معنی سا لفظ تھا۔ لیکن اس کی روح نے اس تشنگی کو ہمیشہ ہی شدت سے محسوس کیا تھا۔

"تشریف لائیے۔" صدیق موٹر کے قریب آتے ہوئے بولے۔

"کیا بات ہے۔" زلفی بھی صدیق کے قریب آگئے۔ "اتر کیوں نہیں رہیں"۔

"وہ کہتی ہیں مجھے ابا حضور کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے۔" ناہید کو دیکھ کر شیریں نے شرارت سے کہا۔ ناہید دانت پیس کر رہ گئی اور زلفی اور صدیق شیریں کی بات پر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیئے۔

"لو بھئی ہم چلے جاتے ہیں۔" کہتے ہوئے زلفی صدیق کے ساتھ برآمدے کے بغلی کمرے میں چلے گئے۔

قصر فردوس میں ناہید کے آجانے سے بڑی ہلچل مچ گئی۔ زندگی کی اک لہر دوڑ گئی۔ اور زلفی ناہید کے وداع کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے پوری سنجیدگی کے ساتھ پورے اہتمام کے ساتھ۔

مہ و انجم کی تابندگی سے رات کی تیرگی تو نہیں مٹتی۔ البتہ چاندنی سے اندھیرا دودھیا سا ضرور ہو جاتا ہے۔ یہی حال ناہید کا ہوا شیریں کی صحبت اور ماحول اور جگہ کی تبدیلی نے ناہید پر خاطر خواہ اثر کیا۔ اسے کچھ وقتی طور پر سکون مل گیا۔ سارا دن شیریں اسے جا و بے جا مذاق کر کے ہنساتی رہتی۔ ہاں رات کے تاریک لمحے ابھی تک ایک ہی تھے۔ لیکن دن بھر کا تھکا ہوا دماغ اکثر نیند کی لپیٹ میں آجاتا۔ اور وہ تلخ حالات سے غافل ہو جاتی۔ واقعات کو اس نے حالات پر چھوڑ دیا اپنی کشتیٔ حیات کو تقدیر کے دھارے پر بہنے دیا۔ اور اس بات سے وہ قدرے مطمئن بھی ہوگئی۔

تیاریاں دھوم دھام سے ہونے لگیں۔

قصر رعنا مہمانوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ کئی دنوں سے ضیافتیں اڑائی جارہی تھیں۔ ناچ گانے کی محفلیں ہورہی تھیں۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ لیکن آج تو مہمان کچھ اس کثرت سے آئے تھے کہ قصر رعنا جیسی وسیع عمارت بھی تنگ معلوم ہونے لگی تھی۔

آج منصور کی شادی کا دن تھا۔

حرم سرا کے ایک طویل و عریض کمرے میں روپہلی مسند پر کم خواب کی شیروانی پہنے وہ دولہا بنے بیٹھے تھے ناہید آج روحانی طور کے علاوہ دینی اور دنیاوی طور پر بھی ان کی ہونے والی تھی خوشیوں کا بحر ناپیدا کنار پھیلتا ہی جارہا تھا۔ ان کے دل میں مسرتیں اس کی وسعتوں سے بڑھ چڑھ کر سمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور ان کامرانیوں کا پرتو ان کے بے مثال مردانہ حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ ان کا چہرہ چمک رہا تھا اور ان کی آنکھوں میں خمار انگڑائیاں لے رہا تھا۔

سنہری کم خواب کے بھاری غرارے آڑے فراک اور چمکیلے مہین دوپٹے میں یاسمین ادھر ادھر چہکتی پھر رہی تھیں۔ بھاری بھاری مرصع زیورات پہنے وہ عروسِ نو معلوم ہورہی تھیں۔ آج ان کی زندگی کا مسرور اور مصروف ترین دن تھا وہ بڑے چاؤ سے خاندانی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے رسوم ادا کر رہی تھیں یہ شادی ان کے خاندانی رسم و رواج کے مطابق انجام پارہی تھی۔

خاندان کی عورتیں اور مرد منصور کو گھیرے ہوئے تھے۔ کمرے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی کوئی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ کوئی قہقہوں کا طوفان اٹھا رہا تھا۔ پچھلی شادیوں کے دلچسپ واقعے دہرائے جارہے تھے۔ شباب ٹکرا رہے تھے۔ جوانیاں مچل رہی تھیں۔ اک شور تھا ہنگامہ تھا۔ اور باہر قصر رعنا کے مہمانوں سے بھرے ہوئے چمنوں میں بینڈ دل نواز نغمے بجا رہا تھا۔

ملازمہ چاندی کے تھال میں چمکتے ہوئے پونڈ لئے یاسمین کی طرف بمشکل جگہ نکال کر بڑھی تھال ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے منصور کا صدقہ اتارا۔ اور پھر جو صدقہ اتارنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہوتا نظر نہ آیا۔ ہر رشتہ دار اپنی حیثیت کے مطابق پونڈ تھال میں رکھ رہا تھا۔ چاندی کا بڑا تھال دیکھتے ہی دیکھتے چمکتے ہوئے سکوں سے بھر گیا۔

"یہ چونچلے اب ختم بھی ہوں۔" نواب اظہر جو منصور کے رشتہ کے ماموں تھے آگے بڑھے۔ "صدیق آپ تو بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ یہ رسمیں ختم ہوتے ہوتے تو شام ہو جائے گی لوگ باہر انتظار کر رہے ہیں۔"

"ابھی تو برات کا خیر مقدم کرنے والے یہیں ہیں۔" صدیق مسکراتے ہوئے زلفی کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تم سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔" زلفی بولے۔ "بڑی مدت کے بعد یہ رسوم دیکھنے میں آئی ہیں"۔ وہ ان۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

رسموں کو بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ جب سے انگلینڈ گئے تھے کسی شادی میں شرکت نہ کی تھی صرف یاسمین کی شادی پر آئے تھے۔ وہ بھی چند دن کے لئے۔

نواب اظہر نے بڑھ کر منصور کا ہاتھ تھام لیا۔ "اٹھئے"۔

منصور اٹھے۔ مبارک سلامت کا اک شور بلند ہوا۔ پھولوں کی بارش کی گئی دعائیں بھی پھولوں ہی کی طرح برس رہی تھیں۔ یاسمین کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔ ہجوم منصور کو گھیرے ہوئے تھا۔ نواب اظہر اور صدیق بمشکل ان کے لئے قدم رکھنے کی جگہ بنا کر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے یاسمین جلدی سے دروازہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔

"راستہ چھوڑو یاسمین"۔ اظہر بولے۔

"یوں نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

"اور" اظہر تعجب سے بولے۔

"بہن کوئی یونہی راستہ چھوڑے گی۔" فاضلہ بیگم بولیں۔

"کچھ رشوت دو منصور۔" چچی بانو بولیں "رستہ یونہی نہیں ملے گا"۔

کچھ دیر ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں۔

صالح بیگم نے سچے موتیوں کی دوہری مالا منصور کے ہاتھ میں تھما دی جو اسی مقصد کے لئے کھڑی تھیں منصور نے مالا یاسمین کے گلے میں ڈال دی۔ یاسمین نے راستہ چھوڑ دیا۔

"بس اتنی سی مالا کے لئے راستہ روکے کھڑی تھیں باجی"۔ منصور ہنستے ہوئے بولے۔

"یہ تو ابتداء ہے منصور۔" چچی بانو مسکرائیں۔ "بہن کا حق بہت ہے ابھی۔ واپسی پر دینا۔"

منصور مسکراتے ہوئے قدرے جھکے۔ یاسمین نے ان کے بالوں پر بڑی شفقت سے بوسہ دیا۔ منصور باہر آ گئے۔

بینڈ نے اک لطیف سا نغمہ چھیڑا۔ مختلف زاویوں سے کیمرے کی آنکھ ان مسرت افزا لمحوں کو سلولائڈ پر منتقل کر رہی تھی۔ بینڈ نے دھن بدلی اور رنگ برنگی موٹریں قطار در قطار قصر رعنا سے نکل کر دولت آباد جانے والی سڑک پر جا رہی تھیں موٹروں کا یہ سلسلہ لامتناہی دکھائی دے رہا تھا۔

ایک مدت کے بعد قصر فردوس میں اتنی چہل پہل دیکھنے میں آئی تھی چمنوں بر آمدوں اور کمروں میں مہمان ہی مہمان بھرے تھے قیمتی ملبوسات کی نمائش تھی۔ عورتوں کے جگمگاتے زیورات اور رنگین آنچلوں سے فضا بڑی رومانوی ہو گئی تھی بچے بوڑھے جوان سبھی مسرور تھے۔ دو دن تک یہی ہنگامہ رہا۔ شان دار ضیافتیں دی گئیں۔ تفریح کے سامان بہم پہنچائے گئے۔ رقص و سرود کی جان دار محفلیں گرم ہوئیں۔

تیسرے دن ناہید کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔ اسے گلاب کے عرق سے غسل کروایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر خوشبوئیں ملی گئی تھیں مانگ میں افشاں بھری گئی تھی؟ سرخ قیمتی کمخواب کے بھاری غرارے اور آڑے فراک پر زر تار دوپٹہ اوڑھے وہ جھکی بیٹھی تھی تنگ چولی سے اس کا شباب چھلک رہا تھا قیمتی طلائی زیورات اور ہیروں کے کئی سیٹ اسے پہنائے گئے تھے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ نگاہوں کو خیرہ کرنے والے زیورات بھڑکیلے لباس عروسی اور انوکھے سنگار سے ناہید کا ملائک فریب حسن اور اجاگر ہو گیا تھا دیکھنے والوں کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں قدرت کی صناعی کے اس بہترین شاہکار کو دیکھ کر سبھی عش عش کر رہے تھے ایک بیگم وقار تھی جس کے سینے پر اسے دیکھ کر سانپ لوٹ رہے تھے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اس کی جگہ آج صبیحہ دلہن بنتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

وہ جان بوجھ کر ناہید کے کمرے میں گئی۔

"آیئے"۔ صابرہ بیگم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ "بیٹھیے۔"

"نہیں مجھے بیٹھنا نہیں۔" وہ بڑے غرور سے بولی۔ "میں تو گھوم پھر کر اپنے منصور کا سسرال دیکھ رہی ہوں۔" وہ طنزیہ بڑے زور سے ہنسی۔ اور اس کے طنز کو سب نے بری طرح محسوس کیا۔ یاسمین نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا شیریں نے بھی اک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر دل ہی دل میں کوسا۔ خاندان کی دوسری نو عمر لڑکیاں بھی اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ بیگم وقار کچھ نادم سی کھسیانی ہو کر جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ ناہید کا گھائل دل طنز کا یہ چرکا بھی چپ چاپ سہار گیا۔ وہ تو بے جان مورتی کی طرح بیٹھی تھی۔ جسے آراستہ کیا گیا تھا ...... اسے نہ تو اپنی دوشیزگی کے ناقابل فراموش دنوں کے وداع کا غم تھا نہ ازدواجگی کے پر بہار لمحوں کی آمد کی خوشی۔ اسے تو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی زندہ نعش کی بڑے ارمانوں سے تجہیز و تکفین کی جا رہی ہو۔ بیگم وقار کے طنز کو محسوس کرنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

رخصتی کے وقت منصور اندر آئے ایک وسیع ہال کے درمیان ایک تخت نما مسند بچھی ہوئی تھی منصور کے پہلو میں ناہید لپٹی لپٹائی بیٹھی تھی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا دم گھٹ رہا تھا خاندانی ہجوم ایک بار پھر ان پر ٹوٹ پڑا تھا یاسمین کو مبارکیں دی جا رہی تھیں اور وہ ہنس ہنس کر مبارک بادی کا جواب دے رہی تھیں۔

"کاش آج ماہ لقا زندہ ہوتیں۔" مجمعے سے کسی معمر خاتون نے کہا۔ "کتنا ارمان تھا یہ دن دیکھنے کا۔"

ماں کا نام سن کر یاسمین کے دل کو ٹھیس لگی۔ اور منصور کی آنکھوں میں بھی نمی سی آ گئی۔

"نہ ماں نہ باپ"۔ کوئی اور بولا۔

"اور بے چاری دلہن کا تو کوئی بھی نہیں۔" تیسری آواز آئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کیا وقت ہوتا ہے یہ بھی۔" کوئی اور بے وقوف ہمدرد بولا۔ "کوئی عزیز بھی نہیں لڑکی کا۔ جو اس کا ہاتھ ہی دلہا کے ہاتھ میں دے دیتا۔"

جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں ناہید کی آنکھیں آنسوؤں کے انمول خزانے لٹانے لگیں۔ یاسمین بھی بار بار آنسو پونچھ رہی تھیں۔ مجمعے پر اک خاموشی چھا گئی۔ کئی آنکھیں اظہار ہمدردی کے طور پر دھندلا گئیں۔ کئی کمزور دل خواتین تو سسکیاں بھرنے لگیں۔ مردوں کے دل بھی اس رقت آمیز ماحول میں افسردہ ہوگئے۔ چہروں کے زاویے بدلنے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔۔" زلفی آگے بڑھے۔ "یاسمین یہ کیا حماقت ہے آخر ما بدولت کس لئے ہیں لاؤ بیٹا ہاتھ نکالو"۔ وہ ناہید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنسے۔ ناہید اور جھک گئی۔

"کنوارا باپ۔" کسی نے بلند آواز سے کہا۔ لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"یونہی سہی۔" زلفی بولے۔ "لاؤ بھی ہاتھ۔ بڑی ضدی بیٹی ہیں ہماری۔"

یاسمین بھی ہنسنے لگیں آگے بڑھ کر ناہید کا ہاتھ زلفی کے ہاتھ میں دے دیا (کتنا خوب صورت ہاتھ تھا زلفی ششدر سے دیکھنے لگے۔ آہستگی سے انہوں نے یہ ہاتھ منصور کے ہاتھ میں دے دیا۔

"بیٹا منصور۔" زلفی جان بوجھ کر رونی آواز نکال کر بولے۔ "یہ ہماری ایک ہی ایک بیٹی ہیں ان کا دل نہ دکھانا کبھی۔"

ان کے اس مذاق پر قہقہے لگ رہے تھے دم بھر میں محفل کا رنگ بدل گیا اور ناہید قہقہوں اور ہنسیوں کے شور میں قصرِ رعنا پہنچ گئی۔

حجلۂ عروسی کی زیبائش کچھ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی تھی کمرہ بڑی نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا دروازوں اور کھڑکیوں پر جھلملاتے ہوئے ریشمی پردے لٹک رہے تھے دبیز چمکیلے قالین پڑے تھے اور سنہری مہین پردوں والی چھپر کھٹ امیدوں کی طرح چمک رہی تھی فضا معطر تھی۔ خوش نما پھول بڑے بڑے گلدانوں میں عجب بہار دکھا رہے تھے۔ ایک طرف مخملیں صوفہ تھا جس پر نرم نرم کشن پڑے تھے۔ کمرے میں خواب ناک سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

منصور اندر داخل ہوئے ان کی چال میں مستی تھی ان کی نگاہوں میں سرور تھا۔ وہ شوق کا اک جہاں لئے چھپر کھٹ کے قریب آئے قدموں کی آہٹ پر ناہید اور سمٹ گئی۔ اپنے گھٹنوں پر دونوں بازوؤں کے حلقے میں سر رکھے وہ شرمائی لجائی کچھ خوف زدہ سی بیٹھی تھی۔

"ناہید۔" منصور نے اسے پکارا۔ شدت جذبات سے ان کی آواز کانپ گئی۔

وہ خاموش رہی۔ اس کا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ ناہید گھبرا گئی۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔" وہ مسہری کے مہین پردوں کو ہٹا کر اندر آگئے ناہید کسمسائی کچھ اور سکڑ

گئی۔ منصور کچھ دیر کھڑے رہے پھر اس کے قریب بیٹھ گئے۔

عشق کی جبینِ شوق حسن کے مقدس دامنوں پر سجدہ ریز ہونے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ تھوڑی سی کش مکش کے بعد منصور نے ناہید کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ ناہید کی حیا آلود نظریں منصور کی خمار آلود نگاہوں سے لمحہ بھر کے لئے ملیں۔ بجلیاں کوندیں اور منصور کی نگاہوں کو خیرہ کر گئیں وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا زاہد فریب چہرہ تھامے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی مقدس کتاب ہو۔ وہ ششدر سے اسے دیکھتے رہے پھر آگے کو جھک گئے.......... اور ان کے تشنہ لب ناہید کے رسیلے ہونٹوں سے مل گئے۔

حوروں کے پاکیزہ آنچل لہرائے۔ فرشتوں کے مقدس دامن پھیلے اور ان لہراتے ہوئے آنچلوں اور پھیلے ہوئے دامنوں کے سائے تلے دو دل مل رہے تھے ایک دوسرے کی دھڑکنیں گن رہے تھے۔

بوڑھی رات مسکرا رہی تھی

اور............ رات گزر گئی۔

صبح ہی صبح اخباری نمائندوں اور کیمرہ مینوں نے قصرِ رعنا کا رخ کیا اور دیر تک اس حسین جوڑے کی مختلف زاویوں سے تصاویر لیتے رہے۔

..............○..............

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

۱۸

محل کے دل فریب ڈرائنگ روم میں سب قریبی عزیز جمع تھے ہنسی مذاق ہو رہا تھا تیز برقی روشنی میں چہرے چمک رہے تھے۔ چیزیں جگمگا رہی تھیں۔ منصور کشادہ کھڑکی کے قریبی کھڑے تھے آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا خاندان کی دوشیزائیں ناہید کو گھیرے بیٹھی تھیں وہ مخملیں صوفے پر نرم نرم کشتوں کے سہارے بیٹھی تھی۔ نیلے ستاروں والا جھلملاتا لباس اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے آب شار پر چاندنی کا عکس تھرتھرا رہا ہو۔ اس کے کانوں میں کندنی گوشوارے لرز رہے تھے گلے میں جڑا کندنی گلوبند تھا اور کلائیاں خوب صورت کنگنوں اور مرصع کلائی بندوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مخروطی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں پلاٹینم کی انگوٹھی ایک ہاتھ میں تھی اور ماں کی یادگار ہیرے کی انگشتری دوسرے ہاتھ کی انگلی میں دونوں ہاتھوں میں دو یادگار انگوٹھیاں پہنے تھی ایک اپنی محبت کی یادگار اور دوسری ماں کی مرحوم محبت کی یادگار۔ ماں کی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے وہ جانے کن خیالوں میں بھٹک رہی تھی رات منصور کے پہلو میں گزارنے کے بعد ضمیر کی چبھن وحشت ناک حد تک بڑھ گئی تھی جذبات کی کش مکش نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ اور منصور اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی دنیائے حسن و عشق کا زندہ چاند آسمان کے اس بے جان اور پتھرائے ہوئے چاند سے کہیں زیادہ منور اور تابناک ہے۔ ان کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمک رہی تھیں ان کا دل خوشیوں سے بھرپور تھا۔

"زلفی آگئے۔" کسی نے بلند آواز سے کہا۔

یاسمین تقریباً بھاگتی ہوئی ناہید کے پاس آئیں اور تاروں بھری اوڑھنی کھینچ کر اس کا گھونگھٹ نکال دیا زلفی کمرے میں داخل ہوئے۔

"یاسمین سمدھی آئے ہیں۔ استقبال تو کرو"۔ فہمیدہ بانو نے یاسمین کا کندھا ہلایا۔

"نہیں بھئی۔" زلفی دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے بولے۔ "وہ سب کل تک تھا آج ہم لڑکے

والے کی طرف سے آئے ہیں۔ باپ بننا بڑا مشکل ہے۔ توبہ ہی بھلی۔"

سب ہنس دیئے۔

"تو آیئے زلفی چچا۔" یاسمین نے پیار سے زلفی چچا کو دیکھا۔ کتنی محبت تھی انہیں اپنے اس چچا سے ہی کچھ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ زلفی یاسمین کے قریب آگئے منصور بھی انہیں محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "ذرا بھئی جگہ تو دو....."

یاسمین نے نو عمر لڑکیوں سے کہا۔ وہ ادب سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ زلفی ناہید کے عین مقابل ایک گدے دار کرسی پر بیٹھ گئے اور یاسمین ناہید کے پہلو میں۔

"زلفی چچا منصور کی دلہن نہیں دیکھئے گا۔" یاسمین ہنستے ہوئے بولیں۔

"ضرور دیکھیں گے۔" وہ بولے "اتنی مدت بٹیا کو پالا پوسا۔ لیکن شکل دیکھی نہیں یہ بات بھی کسی نے سنی کبھی" وہ ہنس رہے تھے عورتیں مردان کے گرد جمع ہو گئے۔ سبھی مسکرا رہے تھے۔

"چلو دکھاؤ بھی یاسمین۔" زلفی نے بڑے شوق سے کہا۔

"ایسے ہی ؟" یاسمین ان کے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر ہوا میں ہلاتے ہوئے بولیں۔

"اور کیسے۔" زلفی نے ان کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

سب بے ساختہ ہنس دیئے۔

"کل تک تو باپ تھے۔ آج سسر ہیں زلفی بھائی رونمائی نکالئے۔ بہو کو دیکھئے جب۔" مسز صادقہ حسین نے زلفی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ غلط بات ہے۔" زلفی نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔ "ہم تو مفت میں دیکھیں گے۔"

وہ کرسی کی پشت سے کمر لگا کر پیچھے کو ہٹ گئے فان کلر گرم سوٹ میں وہ اس وقت ایک حسین نوجوان دکھائی دے رہے تھے۔

"پھر بیٹھے رہئے۔" یاسمین نے ہنس کر کہا۔

"آج نہ سہی کل دیکھ لیں گے۔" وہ بولے۔

"بڑے کنجوس ہیں آپ زلفی۔" کسی نے کہا۔

"جو کام مفت میں ہو سکتا ہو وہاں کچھ دینا دلانا فضول ہی ہے ما بدولت فضول خرچ نہیں ہیں۔"

"کیا کہنے۔" کوئی اور بولا۔

بڑی دیر تک چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی منصور بھی اس حسین چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"لو بھئی منصور دلہن بھی کیا یاد کریں گی۔" کہتے ہوئے زلفی نے جیب سے ایک گراں مایہ لاکٹ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نکالا۔ پتلی سی سفید زنجیر میں بیش قیمت ہیرا چمک رہا تھا لاکٹ انتہائی نفیس تھا اور ہیرا چمک چمک کر اپنی قدر وقیمت آپ بتا رہا تھا۔ زلفی لاکٹ ہاتھ میں لئے زنجیر کھول رہے تھے وہ آگے جھک گئے۔

"لو دکھاؤ اب تو۔" وہ بولے۔

یاسمین نے گھونگھٹ الٹ دیا۔

زلفی کی نظریں ناہید کے چہرے پر پڑیں۔

"زرینہ" بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہار چھوٹ کر ناہید کے ہاتھوں پر گر گیا۔ ہاتھ جس میں ماں کی یادگار انگوٹھی چمک رہی تھی زلفی کی نگاہیں کبھی انگوٹھی پر اور کبھی ناہید کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

"زرینہ نہیں زلفی چچا۔" یاسمین بولیں۔ "ان کا نام ناہید ہے۔"

ناہید کے کانوں میں زرینہ کا لفظ کھولتی ہوئی آگ کی طرح ٹپکا۔ اس نے نظر اٹھا کر زلفی کو دیکھا جن کے چہرے پر ویرانی سی دکھائی دے رہی تھی وہ اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں یاسمین نے کچھ محسوس کیا لیکن اتنا نہیں جسے کوئی اہمیت دی جا سکتی۔ زلفی نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا...... وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھئے نا زلفی چچا۔" یاسمین نے ان کا ہاتھ پکڑا۔ "لاکٹ تو پہنا دیا ہوتا۔"

"تم پہنا دینا۔" وہ مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں بسمل کی تڑپ تھی۔

"دلہن سلام تو کرو"۔ کوئی خاتون بولی۔

"ذرا دکھانا تو لاکٹ۔" کوئی اور بولا۔ "یاسمین نے لاکٹ ان کے ہاتھ میں دے دیا ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا لاکٹ سارے کمرے میں گھوم رہا تھا تعریفیں ہو رہی تھیں۔ قیمت سے اندازے لگائے جا رہے تھے اور زلفی کمرے سے نکل گئے۔

ناہید کی حالت ناگفتہ بہ تھی "تمہاری ماں کا کوئی پرستار۔" ضمیر کی آواز اٹھ رہی تھی۔ جس پر اس کا دماغ بھی ایمان لا رہا تھا بڑے بڑے رئیس بڑے بڑے نواب اس کی ماں کے گاہک تھے زلفی کے منہ سے زرینہ کا لفظ سننے کے بعد اس بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ رہی تھی کہ زلفی بھی ان گاہکوں میں سے ایک تھے ناہید کی شکل وصورت اپنی ماں ہی کی طرح تھی اس لئے زلفی کے منہ سے بے ساختہ زرینہ نکل گیا تھا۔

اپنی جنت کے اجڑنے کا ناہید کو یقین تو تھا ضمیر کی پکار اس تباہی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔ لیکن اتنی جلدی یہ ہولناک تباہی آئے گی اس کا اسے وہم وگمان بھی نہ تھا ناہید کو زلفی نے پہچان لیا تھا۔ اور اب اس کا راز طشت ازبام ہو جائے گا۔ ناہید کا دل قدرت کے اس بے رحم مذاق پر آج رونے کو نہیں بے اختیار قہقہے لگانے کو

چاہا۔ دیوانہ وار اس ستم ظریفی کی داد دینے کو چاہا۔

اس وقت اسے آنے والی رسوائیوں کا خیال تھا نہ منصور کے ٹھکرانے کا احساس اسے صرف یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے جنت سے اٹھا کر دوزخ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی آتشیں زد میں پھینک دیا ہو۔

"لو پہن لو ناہید۔" یاسمین لاکٹ پہنانے لگیں۔ ناہید کے چہرے کا رنگ متغیر تھا آنکھوں میں ہولناک ویرانی تھی۔ اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کا سر یاسمین کے کندھے سے لگ گیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے ناہید۔" یاسمین نے گھبرا کر اس کا ماتھا چھوا۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے باجی۔" وہ بمشکل کہہ سکی۔

"شور سے گھبرا گئی ہیں شاید۔" کئی عورتیں اس پر جھک گئیں۔

"تھکان ہے صبح سے آرام تو کرنے نہیں دیا کسی نے۔" ایک خاتون بولیں۔

"یہاں سے لے چلو انہیں۔ شور سے تو ہمارا دل گھبرا رہا ہے۔" دوسری عورت بولی۔

دوسرے لمحے وہ منصور کی مضبوط بانہوں کے سہارے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

کنیزوں نے جلدی جلدی اس کا لباس تبدیل کروایا۔ بھاری زیورات اتارے اور شب خوابی کا نائیلان کا خوب صورت مہین لباس پہنا دیا صوفے پر بٹھا کر کنیزیں باہر نکل گئیں۔ اسے دیکھ کر منصور کو ننھے فریدوں کی بات یاد آگئی۔

"پریوں کی شہزادی"۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے ناہید نے جانے کیوں آنکھیں بند کر لیں۔ ذلت ورسوائی کا خوف اور نمایاں ہو گیا۔ اور اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ منصور اس پر جھکے ہوئے اس کا حال پوچھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہوں اب۔" وہ جبراً مسکرائی۔

"اتنی جلدی ٹھیک بھی ہو گئیں۔" منصور نے ہنستے ہوئے اس کی حسین ٹھوڑی کو چھوا "اچھا بہانہ تھا یہاں آنے کا۔" ناہید ہنس دی لیکن اس ساختہ ہنسی کے جلو میں قیامتیں مچل رہی تھیں۔

گھڑی بھر کے لئے ناہید کا دل تمام کلفتوں سے آزاد ہونے کے لئے تڑپا۔ اس نے شدت سے تمنا محسوس کی کہ وہ ماضی کو بھول جائے حال سے بے خبر ہو جائے۔ اور مستقبل سے بے نیاز ہو جائے۔ منصور کے عشق کے دامن وسیع سے وسیع تر ہو جائیں اور ان دامنوں کی ٹھنڈی اور سہانی چھاؤں تلے اس کی جوان محبت دم لیتی رہے۔

ان ہونی بات ہو جائے تمنا اسی کا نام ہے۔

ناہید موت وحیات کی کش مکش سے گزر رہی تھی زلفی کا دھڑکا جان لیوا تھا اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عنقریب ہی کوئی بم پھٹنے والا ہے کوئی تباہ کن زلزلہ آنے والا ہے اس بم کا دھماکہ وہ ابھی سے محسوس کر رہی تھی اس زلزلے سے پھیلی ہوئی تباہی سے وہ پیشگی ہول کھا رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے سینے سے اٹھنے والے دھوئیں کو منصور سے چھپائے ہوئے تھی اس کی مسکراہٹوں سے منصور کی خلوتیں آباد تھیں۔

منصور سے اس نے اپنا راز چھپایا تھا پہلے اس کی خود دار طبیعت نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کے اخفاء کی وجہ بدل گئی۔ منصور کی بیماری کے بعد وہ یہ راز کوشش کے باوجود افشانہ کر سکی۔ اس وقت خود داری کا سوال نہ تھا۔ بلکہ منصور کی بقا کا سوال تھا اور پھر یہ راز گہرے سے گہرا ہوتا گیا معمولی خطا بہت بڑا جرم بن گئی چھوٹا سا زخم گھناؤنا ناسور بن گیا۔

وہ شاید اس جرم کو بھی اپنی سرکش محبت کی یادگار سمجھ کر سینے سے لگائے رکھتی اس ناسور کو بھی ضمیر کے جلے ہوئے دل کا آبلہ سمجھ کر پوری احتیاط سے سنبھالے رہتی۔ لیکن رونمائی کے وقت زلفی کے منہ سے زرینہ کا لفظ نکل جانا کانپتے ہاتھوں سے بے اختیار لاکٹ کا گر جانا اس امر کا بین ثبوت تھا کہ وہ اسے نہیں تو اس کی ماں کو اچھی طرح سے جانتے ہیں اس کی ماں.......... جو انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ تھی۔ جو شرافت کے منہ پر کالک کا داغ تھی۔

اس نے سوچا کہ زلفی کے کچھ بتانے سے پہلے ہی خودکشی کر لے لیکن منصور کی زندگی کی جھومتی ہوئی بہاروں کے مسکراتے ہوئے چہروں سے تبسم نوچ لینا ظلم ہی نہیں بہت بڑا گناہ بھی تھا۔ اس نے ایک بار پھر حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ دیا اور منصور کی آغوش عشق میں اس کے تبسم کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ یہ بجلیاں اسے اندر ہی اندر بھسم کرنے لگیں۔

دو دن گزر گئے کوئی بم نہ پھٹا نہ کوئی زلزلہ آیا۔ ناہید منصور کے سامنے ہنستی تھی مسکراتی بھی تھی۔ لیکن اس کا دل ابھی تک خائف تھا۔ زلفی کی طرف سے دھڑکا ابھی تک جان لیوا تھا۔

ان دو دنوں میں زلفی بمشکل دو دفعہ اس کے سامنے آئے ان کے چہرے پر الجھے الجھے تاثرات تھے اور ان کی حرکات کسی اندرونی خلفشار کی مظہر تھیں۔ وہ ناہید کو عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے کے سوا منہ سے ایک لفظ نہ بولے۔ ناہید کا دل کانپتا رہا اور وہ ان کی طرف نظریں اٹھانے کی ایک دفعہ بھی جرأت نہ کر سکی۔ کاش کوئی اونچے اونچے پہاڑوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے اور اس کے ماضی کے منہ پر دے مارے کتنی عبث خواہش تھی۔

کیسی ناممکن آرزو تھی۔

لیکن ناہید کا معصوم دل اس کی تمنا بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

..............○..............

۱۹

اخبار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

فیروز کرسی سے اس طرح اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو..... ہوا کے جھونکے سے کاغذ پھڑپھڑاتے ہوئے بکھر گئے۔ فیروز کچھ لمحے ساکت وصامت ان اڑتے ہوئے کاغذوں کو دیکھتا رہا۔ پھر جلدی سے اٹھا اور تیزی سے اخبار کے کاغذوں کو سمیٹ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کی نظریں پھر اسی تصویر کو گھور رہی تھیں۔ جس کے نیچے لکھا تھا۔

آنریبل نواب منصور علی خان والئی سلطان پور اور ان کی بیگم ناہید بانو

"وہی ہے"۔ فیروز تصویر کو آڑھے ترچھے زاویوں سے دیکھ رہا تھا "نام بھی وہی ہے لیکن"۔

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اتنے بڑے خاندانی نواب سے ناہید کی شادی کیسے ہو گئی۔ اخبار بغل میں دبائے وہ برآمدے سے اٹھ کر سیدھا باورچی خانے کی طرف گیا......

ملازمہ ناشتے کے برتن مانجھ رہی تھی۔

"ذرا باہر تو آنا" فیروز اخبار پھیلاتے ہوئے بولا۔

نوکرانی ڈرتی ڈرتی باہر آئی۔ وہ جب سے فیروز کے پاس ملازم ہوئی تھی اس کی شکل سے اسے خوف آتا تھا۔ ایک مجبوری دوسرا معقول تنخواہ وہ اس کے پاس کام کئے جا رہی تھی۔ لیکن اس کا ڈر دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ خاص کر جب سے ناہید اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ وہ تو چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح کچھ اور ہی خطرناک ہو گیا تھا۔

"کیا ہے" وہ باورچی خانے کے دروازے کے پاس ہی رک گئی۔

"ہاتھ دھو کر جلدی سے آؤ"۔

ملازمہ اندر گئی۔ ہاتھ دھوئے۔ اور اپنے دوپٹے کے آنچل سے پونچھتی ہوئی باہر آ گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ادھر آؤ" فیروز نے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے میز پر اخبار پھیلا دیا۔

وہ قریب آ گئی۔

"یہ دیکھو" فیروز تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کس کی تصویر ہے یہ"۔

ملازمہ تصویر پر جھک گئی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے تصویر کو دیکھا کچھ چونکی جلدی سے دوپٹے سے آنکھوں کو پونچھا۔ اور پھر جھک گئی۔

"اب دیکھے ہی جاؤ گی" فیروز بولا "پتہ چلا کچھ"۔

"یہ تو بٹیا کی تصویر معلوم ہوتی ہے"۔

ملازمہ نے پھر غور سے دیکھا "لو بھلا میں پہچانتی نہیں جیسے۔ ان کی شکل و صورت چھپ سکتی ہے بھلا"۔

فیروز اخبار لپیٹ کر نیچے اتر آیا۔

ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے میں فخرو اپنی جھولا نما چارپائی پر پڑا اونگھ رہا تھا۔

"او فخرو" فیروز نے اسے آواز دی۔

وہ چپکا پڑا رہا۔

"ابھی تیری آنکھ نہیں کھلی دس بج رہے ہیں"۔ فیروز نے چارپائی کے پائے کو ٹھوکر ماری فخرو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"ادھر آؤ" فیروز صحن کی طرف جاتے ہوئے بولا...... فخرو اپنی لال لال آنکھیں پونچھتا ہوا اس کے پیچھے آ گیا۔

"یہ دیکھو" فیروز نے اخبار اس کے سامنے کر دیا۔

"کیا دیکھوں" وہ ابھی تک نیند کے نشے میں تھا۔

"یہ تصویر دیکھو"۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں مالک"۔ وہ ابھی تک شاید اونگھ رہا تھا "کیا دیکھوں"۔

فیروز نے اس کا کان پکڑ کر سر اخبار کی طرف جھکا دیا۔ فخرو اپنے میلے میلے دانت نکال کر ہنس دیا۔

"کس کی تصو ہے یہ"۔ فیروز نے پوچھا فخرو نے تصویر کو دیکھا اور بولا۔

"ایک مرد کی ہے دوسری عورت کی دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہیں"۔

فیروز نے اس کے گنجے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا "آنکھیں کھول کر دیکھ ذرا......

فخرو نے واقعی آنکھیں کھول کر دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"یہ تو" وہ ہکلاتے ہوئے بولا "یہ تو بٹیا نہیں ہیں مالک؟"

"وہی ہے" فیروز کسی خوش کن تصور سے مسکرایا فخرو ابھی تک آنکھیں جھپک جھپک کر ناہید کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

فیروز نے ناہید کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیئے تھے۔ جہاں جہاں اس کے ہونے کا امکان تھا گیا...... شہر شہر کی خاک چھانی لیکن اسے تو جیسے زمین نگل گئی تھی۔ فیروز کی ساری کوششیں ناکام رہ گئی تھیں۔ اپنی ناکامی پر دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ اب وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے فرار ہوئے ایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس گوہر گراں مایہ کو کھونے کا صدمہ وہ ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اس ضوفشاں ہیرے کو وہ ضوفروش بنانے کا عرصے سے خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔

ناہید کے چلے جانے سے اسے مالی طور پر بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا سیٹھ ہاشم جیسی مالدار آسامی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس نے ثمینہ کو ناہید کے نعم البدل کے طور پر پیش کرنا چاہا تھا۔ لیکن ثمینہ لاکھ حسین سہی۔ ناہید کے ہوشربا حسن کے طلسم سے مسحور سیٹھ اسے کب خاطر میں لاتا تھا۔

"جہاں سے ہو سکتا ہے اسے ڈھونڈ کر لاؤ" سیٹھ ہاشم غرایا تھا "میں پانچ ہزار کی جگہ دس ہزار دوں گا"۔

اس کی آتشِ شوق ناکامی کی پھونک سے اور بھڑک اٹھی تھی۔

اور یہ دس ہزار کا لالچ کچھ کم نہ تھا۔ فیروز اور فخرو نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ جگہ جگہ مارے مارے پھرے تھے۔ لیکن وہ نہ ملی تھی۔ قدرت نے جیسے اسے اپنی امان میں لے لیا تھا۔ جہاں شیطانی قوتوں کی پہنچ نہ تھی۔ اس بات پر اس کا سیٹھ ہاشم سے تنازعہ ہو گیا تھا۔

اور آج اخبار میں اس کی تصویر دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔

فخرو ابھی تک میلی میلی لال آنکھوں سے اس حسین جوڑے کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

"بہت بڑا آدمی ہے یہ"۔ فیروز بولا۔

"بڑا کہاں بالکل جوان ہے" فخرو نے جواب دیا۔

"ارے بے وقوف بہت بڑا نواب ہے۔ سلطان پور کا مالک ہے۔ ناہید کے ساتھ شادی ہوئی ہے اس کی"۔

فخرو واقعی بے وقوفوں کی طرح اس کا منہ تک رہا تھا۔

"شادی" وہ جیسے خواب میں بول رہا تھا۔

"اور اتنی دیر سے کیا دیکھ رہے ہو"۔ فیروز نے اسے جھڑکا۔

"بٹیا کی نواب سے شادی ہوئی ہے"۔ اس نے کہا "بڑی خوش قسمت ہیں بٹیا تھیں بھی تو اسی قابل زرینہ بی بی جانے کیسے یہاں آ پھنسی تھیں"۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

فخرو کے سادہ اور بے لاگ تبصرے پر فیروز جل کر رہ گیا۔ بڑبڑاتا ہوا اخبار سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ جتنے اخبار جمع کر سکتا تھا۔ دن بھر پھر کر جمع کئے۔ سلطان پور کا ایک اخبار ہاتھ لگ گیا۔ جس کے سرورق پر منصور و ناہید کی ایک بڑی اور رنگین تصویر تھی۔ اب کسی شبے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ ناہید وہی تھی جسے آیا جُل دے کر بھگا لے گئی تھی۔

شام ہو رہی تھی۔ فیروز اس شادی کے متعلق ابھی تک سوچ رہا تھا۔ ناہید کیسے نواب تک پہنچی۔ کیسے یہ شادی طے پائی۔ کیا نواب نے اس کی اصلیت جانتے ہوئے بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یا ناہید نے اسے کچھ بتایا ہی نہیں۔

"عشق لڑ گیا ہو گا"۔ اس کے دماغ نے سوچا "ناہید نے اپنے حسب نسب سے ہو سکتا ہے اسے آگاہ ہی نہ کیا ہو۔ بہر حال میں تہہ تک پہنچوں گا۔"

فیروز کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ جلدی جلدی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھ رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کالا بٹوہ نکال کر وہ جلدی جلدی نوٹ گننے لگا۔ ضرورت کیلئے کافی روپیہ تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے بٹوہ جیب میں ڈالا۔ سگریٹ سلگایا اور اٹیچی کیس ہاتھ میں لئے باورچی خانے کی طرف چل دیا۔

"مائی" اس نے پکارا۔

دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باورچی خانے کی کھڑکی سے ملازمہ نے جھانکا۔ "کیا بات ہے"۔

"میں چند دنوں کیلئے جا رہا ہوں"۔ وہ بولا۔

"کہاں" ملازمہ نے دل ہی دل میں خوش ہو کر پوچھا۔

"کہیں بھی تمہیں پوچھنے سے کیا"۔ وہ تیزی سے بولا "شاید میرے لوٹنے میں کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔ گھر کا خیال رکھنا۔ فخرو کو بھی کہتا جاؤں گا۔ پر وہ ذرا ہوش میں کم ہی رہتا ہے۔"

"بہت اچھا" ملازمہ نے جواب دیا۔ چولہے پر چاول ابل رہے تھے۔ وہ جلدی سے پلٹی اور دیگچی میں چمچ ہلانے لگی۔

فیروز سیڑھیاں اتر کر فخرو کے پاس چند منٹ ٹھہرا۔ اور گلی میں نکل گیا۔ بازار میں تانگہ پکڑا اور سٹیشن کی طرف چل دیا۔

صبح اس کی آنکھ سلطان پور کے ایک ہوٹل میں کھلی۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ سلطان پور کی زندگی بیدار ہو گئی تھی۔ فیروز صبح جلدی اٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ اور آج تو رات بھر کے سفر کی تھکان بھی تھی۔ دیر تک سویا رہا جب آنکھ کھلی تو جلدی سے اٹھا غسل سے فارغ ہو کر ناشتہ منگوایا۔ اطمینان سے ناشتہ کیا۔ کچھ دیر رات کے خریدے

ہوئے اخبار دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔

ہوٹل کے باہر چند بے فکرے نواب منصور اور ناہید کی عظیم الشان شادی پر تبصرے کر رہے تھے۔

"اتنی شاندار شادی بڑی مدت کے بعد دیکھنے میں آئی۔ میں تو گول چوک کے قریب کھڑا موٹریں ہی گنتا رہا۔ کوئی شمار ہی نہیں تھا" ایک بولا۔

"تم خالی موٹریں ہی گنتے رہے اور ہم نے تو ضیافت بھی اڑائی۔ کوئی حساب تھوڑا ہی تھا وہاں۔ ارے کیا بتاؤں عمر میں پہلی اور شاید آخری دفعہ اتنی پر تکلف دعوت کھائی"۔

دوسرے نے فخر سے سینہ پھلایا۔

"تم کیسے پہنچ گئے وہاں یونہی جا گھسے ہو گے" پہلا بولا۔

"تو اور کیا بلاوا آیا ہو گا" تیسرے نے طنز کی۔

"ارے نہیں بھئی۔ وہ اپنے محلے کے حسین خان ہیں نا؟ ان کے ہمراہ ہی جانا ہو گیا"۔

دوسرے ساتھی ہنس دیئے۔

"جب تو دولت آباد بھی گئے ہو گے"۔

"نہیں وہاں تو نہیں گیا تھا۔ حسین خان صاحب نے کہا تو تھا چلنے کو"۔

"سنا ہے وہاں بھی پر تکلف دعوتیں ہوئیں۔ مرغن کھانے سالم بھنے ہوئے مرغے تیتر اور بٹیروں کے کباب' ہرن کا گوشت ارے بھائی ہمیں تو نام بھی نہیں آتے ان کھانوں کے وہاں تو مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے کھانے دیئے گئے تھے۔

"لڑکی والے زیادہ عرصہ ولایت ہی رہے ہیں نا؟"

"کون" پہلا حیرت سے بولا۔ فیروز بظاہر اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ لیکن اس کے کان کچھ ضرورت سے زیادہ تیز تھے۔ وہ پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"کیا حسین جوڑا ہے"۔ تیسرے نے ایک کارڈ سائز فوٹو نکالی۔ فیروز نے نظر چرا کر دیکھا اب تو قطعی شبہ نہ رہا تھا۔ وہ ناہید ہی تھی "کوئی نواب صاحب کی دور کی رشتہ دار ہیں ان کے والدین نہیں تھے اس لئے شادی ان کے چچا نے کی ہے"۔

"کیا کہہ رہے ہو"۔ پہلا حیرت سے بولا "کیسی رشتہ داری"۔

"کیا نواب صاحب اور ان کی بیگم آپس میں رشتہ دار نہیں ہیں"۔

"بالکل بھی نہیں" پہلا بولا۔

"ہم نے تو یہی سنا تھا۔ کہ دور کی رشتہ داری ہے"۔ دوسرے ساتھی نے تیسرے کے کہنے کی تائید کی۔

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں سب اچھی طرح جانتا ہوں۔ میری ہمشیرہ ہائی سکول میں پڑھتی ہیں۔ وہ انہیں اچھی طرح جانتی ہیں۔ شادی سے پہلے لڑکیوں کے ہوسٹل ہی میں تو رہتی تھیں"۔

دونوں ساتھی شوق سے سننے لگے۔اور فیروز کے کان کھڑے ہو گئے۔

"پچھلے سال ٹرین کا جو حادثہ ہوا تھا بھول گئے کیا" پہلا بولا۔

"لو بھلا ایسا جانکاہ حادثہ بھی بھلایا جا سکتا ہے" تیسرا بولا۔

"بڑا خونیں واقعہ تھا" دوسرے نے کہا۔

"اسی حادثے میں یہ بیگم صاحبہ بھی زخمی ہو کر سلطان پور پہنچی تھیں۔ دنیا میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ نواب صاحب کے دفتر میں نوکری کر لی اور پھر سمجھ لو.......... یہ شادی ہو گئی"۔

تینوں ساتھی ہنسنے لگے۔ فیروز کو یاد آ گیا جس رات ناہید فرار ہوئی تھی اسی رات سلطان پور کے قریب ٹرین کا حادثہ ہوا تھا۔ اس رات وہ اسے دوسری لائن پر ہی تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اس طرف اس کے ذہن نے رسائی ہی نہ کی تھی۔

فیروز ساری بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ابلیسانہ قوتیں جاگ اٹھیں شیطانی ارادہ مضبوط ہو گیا۔ وہ کچھ سوچ کر پلٹا۔ اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

○

۲۰

آج ان کی شادی کو چوتھا دن تھا۔

محل کے عقبی باغ کے خوبصورت لان میں چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک طرف خوبصورت صوفوں کی دائرہ نما قطاریں تھیں۔ خوبصورتی سے ترشی ہوئی گھاس پر چھوٹے چھوٹے قالین بڑی بہار دکھا رہے تھے آبنوسی میزوں پر گلدانوں میں موسم بہار کے حسین پھول مسکرا رہے تھے.......... دوسری طرف بڑی بڑی میزوں پر چاندی کے جگمگاتے برتنوں میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی تھیں نفیس چینی کے ٹی سٹ پڑے تھے۔ مہمانوں کا ایک جم غفیر چائے پینے میں معروف تھا۔ جو پی چکے تھے۔ صوفوں پر بیٹھے گپیں لگا رہے تھے۔

آج یاسمین اور منصور کے قریبی دوستوں کو شادی کی خوشی میں چائے پر مدعو کیا گیا تھا متمول اور پڑھا لکھا طبقہ تھا۔ لطیف مذاق ہو رہے تھے۔ بلند پایہ ادبی مسائل زیر بحث لائے جا رہے تھے۔ کچھ باذوق حضرات شعر و شاعری کر رہے تھے۔ منصور گہرے گرے سوٹ میں ملبوس مہمانوں کی خاطر مدارات میں مشغول تھے۔ یاسمین ہلکے گلابی ریشمی شوٹ میں بہار کا کوئی شگفتہ پھول دکھائی دے رہی تھیں۔ سوٹ پر بڑا ہی نفیس اور دیدہ زیب کام کیا ہوا تھا۔

ناہید سرخ زرتار ساڑھی کا بھاری پلو سنبھالے ایک مخملیں صوفے پر کچھ بجھی بجھی سی بیٹھی تھی۔ یاقوتی طلائی زیورات سرخ ساڑھی کی مناسبت سے بڑی بہار دکھا رہے تھے اس کے ماتھے پر پڑی ہوئی بالوں کی لٹیں کچھ اور گھونگریالی ہو گئیں تھیں۔ اس کا صبیح حسن نکھرا ہوا تھا۔ شمسہ اس کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ اور شیریں بائیں طرف۔ دونوں اس کے ساتھ لطیف چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ لیکن وہ ان کی پر لطف باتوں میں پوری دلچسپی سے حصہ نہ لے رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے جب وہ چمن میں آئی تھی۔ تو بر آمدے میں زلفی کھڑے تھے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ یاسمین آ گئیں۔ زلفی کے الفاظ ہونٹوں پر ہی ختم ہو گئے تھے۔ اور یاسمین اسے باہر لے آئی تھیں۔ اس نے ایک بار

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پلٹ کر دیکھا تھا۔ زلفی پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے ناہید کا مجرم دل کوئی اہمیت نہ دیتا۔ وہ جب سے بیٹھی اسی واقعے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ مہیب تباہی اسے اپنے چاروں طرف پھیلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ شور و غوغا سے اس کی طبیعت پریشان ہو رہی تھی اور جب برابر کے صوفے پر زلفی آبیٹھے تو ان سے اس کا سامنا کرنا دشوار ہو گیا۔ اسے زلفی کی آنکھوں میں اک خوفناک ٹھہراؤ نظر آرہا تھا۔ اور وہ برابر اسے گھور رہے تھے۔

"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے شیریں" اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کمرے میں جائیں گی"۔ شمسہ نے پوچھا۔

"ہاں" مختصر جواب دے کر وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

شمسہ اٹھ کر یاسمین کے پاس گئی۔ وہ اپنی کسی پرانی سہیلی سے بڑی مدت کے بعد ملی تھیں اسی کے ہمراہ باتیں کرتی ہوئی چائے پینے میں مصروف تھیں۔

"چائے پی لی ناہید نے" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں" شمسہ نے جواب دیا۔

"آپ انہیں کمرے میں لے جایئے میں چائے بجھواتی ہوں۔ شور و غل سے بڑی گھبرا جاتی ہیں۔"

"اب تو انہیں مانوس ہو جانا چاہئے" ان کی سہیلی بولیں۔

"آہستہ آہستہ ہو جائیں گی" یاسمین نے ہنس کر کہا شمسہ چلی گئی۔

کچھ لحوں بعد وہ شیریں اور شمسہ کے درمیان ایک مدہوش کن چال چلتی ہوئی لان عبور کر رہی تھی۔ منصور دوستوں کے ساتھ مصروف تکلم تھے۔ ناہید کو جاتے دیکھا۔ لپک کر اس کے پاس پہنچے۔

"خیریت" انہوں نے ناہید کے گھبرائے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی۔

" طبیعت ٹھیک نہیں ان کی" شمسہ نے جواب دیا "گھبرا گئی ہیں شاید"۔

"بہانہ بنا رہی ہیں" منصور ناہید کی طرف ذو معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائے ناہید نے محجوب نظروں سے انہیں دیکھا مسکرا کر سر جھکایا۔

لیکن طبیعت کا بار بار یک لخت خراب ہو جانا منصور کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا۔ بجلی کی تیزی کے ساتھ ان کے دماغ میں کئی خیال آرہے تھے۔ کہیں یہ شادی کسی جبر کا نتیجہ تو نہیں" یہ خیال اتنا روح فرسا تھا کہ منصور کا دماغ چکرا گیا۔ وہ دور جاتی ہوئی ناہید کو کھڑے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ وہ کچھ بے چین ہو رہے تھے۔

"بس بھئی بہت ہو گیا" ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے غزالی مسکرا رہے تھے۔

منصور نے پلٹ کر انہیں دیکھا غزالی ہنسنے لگے۔ وہ منصور کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے۔

"یہ بھابی تمہیں لے بیٹھیں گی"۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا "ہوش و حواس کا دامن تو ابھی سے چھوٹ گیا۔ میں تو حیران ہوں۔ اس شعلۂ جوالا کی قربت میں آگے کیا ہو گا"۔

"تپش سے سونا کندن بن جاتا ہے غزالی" منصور جبری مسکرائے۔

"بہت خوب" شبیر بھی قریب آتے ہوئے بولے۔

"اکیلے ہی اکیلے کیا راز کی باتیں ہو رہی ہیں"۔ فصیح قریب ہی کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

"یہ رو رہے تھے" غزالی منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "بمشکل چپ کرایا ہے"۔

"کیوں.......... کیا ہو گیا" شبیر مسکراتے ہوئے منصور کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن ان کی آنکھیں اداس تھیں۔

"بھابی کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے جھڑک دیا۔ بے چارے رونے لگے"۔

"ابھی سے یہ حال ہے" فصیح نے لقمہ دیا۔

"بڑا افسوس ہے منصور" شبیر نے چھیڑا۔

"مجھے تو رحم آتا ہے ان پر" غزالی بولا "جھڑکی کھانے کے بعد بھی حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔ خیال ہو گا پلٹ کر بلالیں گی۔ پر کہاں"۔

"اپنی خیر مناؤ غزالی" منصور اس کے مذاق کے جواب میں بولے "دن رات روتے نظر آؤ گے"۔

"یہ تو ٹھیک کہا" شبیر نے ہنستے ہوئے منصور کی پیٹھ ٹھونکی "ناک میں دم کر دیں گی شمسہ ان کا بڑی تیز و طرار ہیں"۔

قہقہوں کی آواز سن کر دو چار اور دوست بھی ان کے قریب آگئے۔ دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ منصور اور غزالی کی نوک جھونک سے سبھی محظوظ ہو رہے تھے منصور غزالی کی باتوں کا جواب بڑی برجستگی سے دے رہے تھے لیکن ان کا خیال دماغ میں آنے والے انوکھے خیال کی طرف ہی مائل تھا۔ اور اس عجیب و غریب خیال سے انہیں بڑی اذیت ہو رہی تھی۔

"یہ میرا وہم ہے" وہ جب ان ہنستے کھیلتے دوستوں سے گھڑی بھر کے لئے دامن چھڑا کر صوفے پر بیٹھے تو سوچنے لگے "ناہید کی محبت سورج کی طرح روشن ہے وہ بڑی حساس ہیں۔ وہ بڑی غیور ہیں۔ اور یہ طبیعت کا بار بار خراب ہو جانا شور و غل سے گھبرانا اسی بات کی دلیل ہے۔"

ان خیالوں سے وہ بظاہر مطمئن ہو گئے۔ اور پھر انہیں اس رات والا واقعہ یاد آگیا جب شب تنہائی میں ناہید کے ہونٹوں نے ان کی یادگار انگشتری کو بوسہ دیا تھا کیا یہ اس کی خاموش محبت کی دلیل نہ تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ناہید نے کمرے میں آکر اطمینان کا سانس لیا۔ شیریں اور شمسہ کو واپس بھیج کر وہ کھڑکی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وہ منصور کے ذاتی ڈرائنگ روم میں تھی۔ کمرہ جس نفاست سے آراستہ تھا اس سے منصور کے بلند ذوق کا نشان ملتا تھا۔ کچھ لمحے ناہید کھڑکی سے نیچے لان کو دیکھتی رہی۔ جہاں مہمانوں کا ہجوم چائے پینے میں مصروف تھا۔ سفید وردی اور سنہری پیٹیوں والے بیرے چائے کی کشتیاں اٹھائے آجا رہے تھے۔ اس کی نظریں منصور پر جمی ہوئی تھیں۔ جو اک نمایاں شان سے چائے پیتے ہوئے دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ملازم کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"آجاؤ"۔

"چائے لایا ہوں سرکار" وہ احترام سے کھڑا تھا چائے کی طشتری دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔

"رکھ دو"۔

نوکر قرینے سے چائے کے برتن میز پر لگانے لگا۔

"میری چائے بھی یہیں لے آؤ" زلفی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

ناہید انہیں دیکھ کر دم بخود سی رہ گئی۔ کھڑکی کے قریب پڑے ہوئے صوفے پر یوں گر گئی جیسے مٹی کا ڈھیر ہو۔

نوکر چلا گیا۔ اور زلفی کمرے میں بے تابی سے ٹہلنے لگے۔ نوکر پھر چائے لے کر آگیا میزوں پر چائے کا سامان لگا کر وہ مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"تم جاؤ" زلفی بولے۔ نوکر چلا گیا ناہید کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔

چائے جوں کی توں پڑی رہی کسی نے پہل نہ کی ناہید نے آنکھ کے گوشوں سے زلفی کی طرف دیکھا وہ مینٹل پیس پر کہنی ٹکائے کچھ کہنے کے انداز میں کھڑے تھے۔ ناہید کانپ گئی۔

ملازم اجازت لے کر اندر آیا۔ ناہید کو جیسے اس کے آنے سے تقویت مل گئی۔

"کیا بات ہے" زلفی نے سختی سے پوچھا۔

"سرکار" وہ ادب سے سر جھکا کر بولا "حضور بیگم صاحبہ کے خاندانی ملازم فیروز آئے ہیں۔ وہ ملنا چاہتے ہیں"۔

ناہید کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی وزنی پتھر سے اس کا دماغ کچل گیا ہو.....فیروز..........وہ خبیث انسان..........وہ درندہ یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ ناہید کے دماغ کی رگیں سنسنا رہی

تھیں۔ اس کا رنگ فق تھا۔ اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ زلفی بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی یہ حالت کسی خاص بات کی غماز تھی۔ معاملے کی نوعیت کو سمجھنا زلفی کے لئے کچھ مشکل نہ رہا تھا۔ در پردہ بھید صاف نظر آرہا تھا۔ وہ یہ تو نہ جان سکے کہ بھید کیا ہے لیکن اتنا جان گئے۔ کہ بات کچھ ہے ضرور۔

"یہیں لے آؤ اسے" زلفی نے نوکر سے کہا۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔

ناہید نے گھبرا کر پہلے زلفی کو اور پھر دروازے کی طرف دیکھا اپنی بے بسی پر اس کا دل پھٹنے لگا۔ سینے سے اٹھتی ہوئی آہ کو روکنا ناممکن ہو گیا۔ اس کی حالت سے جانے کیوں زلفی بے چین ہو گئے۔

دروازے کا بھاری پردہ اٹھا کر فیروز اندر آگیا۔ وہ اس وقت معمولی قسم کے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور اس قسم کا عجز تھا اس کے چہرے پر کہ وہ واقعی کسی اچھے خاندان کا معتمد نوکر معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جھک کر بڑی تعظیم سے دونوں کو سلام کیا۔ ناہید پھٹی پھٹی نظروں سے اسے یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے جاگتے میں بھوت نظر آگیا ہو۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

زلفی نے غور سے فیروز کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اک شیطانی چمک تھی۔ اس کے بشرے پر خباثت تھی۔ زلفی کی نظریں فیروز اور ناہید کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ کھڑے رہے فیروز خاص نوکروں کی طرح بٹیا بٹیا کہہ کر ناہید کو دعائیں دیتا رہا۔ اور ناہید نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

زلفی اپنی جگہ چھوڑ کر بڑھے۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے ناہید کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ ان سے باتیں کیجئے میں جاتا ہوں"۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ناہید کے مختل حواس کو جیسے کچھ سکون ملا۔ اور وہ اس سے مقابلہ کرنے کی ہمت مجتمع کرنے لگی۔ وہ صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اجی میں نے کہا پہچانا نہیں خاکسار کو"۔ فیروز بھنوئیں کھینچ کر طنزیہ ہنستے ہوئے بولا۔

ناہید خاموش رہی۔

"بندے کا نام فیروز ہے"۔ وہ دائیں آنکھ بند کرتے ہوئے بولا "کیا ٹھاٹھ ہیں ناہید بانو کے یہ شان دار محل یہ عیش و عشرت کے سامان..........یہ ہیرے موتی.....یہ جھلملاتے لباس بھئی میں تو قائل ہو گیا تقدیر کے چکروں کا ایک رنڈی کی بیٹی کے یہ بھاگ آج زرینہ زندہ ہوتی۔ تو دیکھتی۔ بیٹی کی شادی پر مجرا تو کرتی"۔

فیروز نے جیسے بارود کو آگ دکھادی۔ ناہید چیخ اٹھی۔

"بکواس بند کرو۔ تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کر لی"۔

ہاہاہا فیروز نے اک بھدا سا قہقہہ لگایا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں کیسے آیا یہ بھی تمہیں پتہ چل جائے گا۔ سال بھر پہلے تو بچ کر بھاگ نکلی تھیں۔ اب دیکھوں گا کہاں جاتی ہو۔ میرے شکنجے سے چھٹ کر"۔

"تم............ تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے" ناہید شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

"یہ تو اس وقت پتہ چلے گا جب تمہارے شوہر نامدار کے سامنے تمہاری اصلیت کا پول کھولوں گا۔ تمہارا حسب نسب انہیں بتاؤں گا"۔

ناہید کے دماغ کو پیہم جھٹکے لگ رہے تھے۔ لیکن بمشکل آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"میں............ میں نے" اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا "میں انہیں سب کچھ بتا چکی ہوں"۔

فیروز نے پھر ایک بار پھر بھدا سا قہقہہ لگایا۔ جو فضا پر ناگوار سے اثرات چھوڑتا ہوا تحلیل ہو گا۔

"مجھ سے شاطرانہ چالیں چلتی ہو۔ ایک دفعہ دھوکا کھا گیا۔ تو یہ مت سمجھو کہ ہر دفعہ دھوکا کھاؤں گا۔ نواب صاحب کو سب کچھ بتا دیا ہوتا تو آج یوں میرا سامنا کرتے ہوئے گھبرا نہ جاتیں۔ چہرہ فق نہ ہو جاتا۔ اور جنابہ نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام نہ لیا ہوتا"۔

ناہید نے بے بسی سے فیروز کو دیکھا۔ وہ بڑے خوفناک طریقے سے مسکرا رہا تھا ناہید کی حالت اس پرندے کی سی تھی۔ جو دام صیاد میں آکر پھڑپھڑا رہا ہو۔ اس نے نڈھال ہو کر صوفے کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہ آرہا تھا۔ وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ اور اس کے خوبصورت کومل نتھنے پھڑک رہے تھے۔

فیروز اپنی کامیابی پر مسکرایا۔ ناہید جیسی بھولی بھالی لڑکی کو باتوں کا چکر دے کر پھنسا لیا تھا۔ اور وہ اصل بات بتا دینے پر مجبور ہو گئی۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے"۔ وہ جیسے اپنے آپ سے بول رہی تھی "کہ میں نے اپنا حسب نسب ان سے چھپائے رکھا۔ اپنے ماضی کو ان سے مستور رکھا۔ بتانا چاہا بھی تو بتا نہ سکی"۔

فیروز کی گھنی مونچھیں کچھ پھیل گئیں۔ اور اس کے ہونٹوں پر اک بے رحم تبسم آگیا۔

"جو کام تم سے نہ ہو سکا۔ وہ یہ خاکسار کر دے گا" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا............

ناہید نے مرغ بسمل کی طرح تڑپ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گر گر کر اس کی زرتار ساڑھی کو تر کرنے لگے۔

"ان سے کچھ نہ کہنا فیروز میں مر سکتی ہوں۔ لیکن ان کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو............" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"ابھی کچھ بگاڑا ہی نہیں" فیروز دانت پیس کر بولا "سیٹھ ہاشم جیسی موٹی آسامی تمہارے بھاگ نکلنے سے ہمیشہ کے لئے میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ پانچ ہزار پر تمہارا سودا طے کیا تھا میں نے"۔

"اوہ بند کرو یہ باتیں" ناہید نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

"نازک طبع تو تھیں ہی۔ ایک نواب کی بیگم بن کر نازک دماغ بھی ہو گئیں"............ اور پھر جیسے اپنے آپ سے بول رہا ہو "ہاں بھئی تمہاری رگوں میں بھی تو آخر نوابی خون ہی دوڑ رہا ہے جائز باپ نہ سہی۔ تھا تو نواب آخر کو"۔

"مجھے کیوں ستاتے ہو فیروز۔ اس مرد کا میرے سامنے نام نہ لو۔ جس نے میری شریف ماں کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔ اور جو میری تباہی کا موجب بن رہا ہے"۔ وہ انتہائی بے چارگی سے بولی "میری زندگی شروع ہی سے آلام میں گھری رہی ہے۔ میں نے کوئی لمحہ چین کا نہیں گزارا تم سمجھ رہے ہو۔ میں عیش و عشرت کی زندگی کی ابتداء کر رہی ہوں۔ یقین مانو مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے جیسے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ منصور سے اپنی نسبی پستی چھپا کر میں نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ پہلے میں نے شادی سے انکار محض اسی بنا پر کیا تھا لیکن وہ بیمار ہو گئے۔ اور حالات کچھ اس طرح بدلے کہ میں انہیں کچھ بھی نہ بتا سکی میرا ضمیر میرے پہلو میں نشتر چبھو رہا ہے۔ ان کی نظروں میں میں جو مقام پا چکی ہوں۔ اس سے گرنا بھی نہیں چاہتی۔ اسے میری اخلاقی کمزوری سمجھ لو یا کچھ اور............ میں جانتی ہوں یہ راز افشا ہو کر رہے گا۔ میری یہ جنت اجڑ ہی جائے گی۔ اس جنت میں کچھ دیر تو اطمینان کا سانس لینے دو کچھ دیر تو سکون پانے دو"۔

لیکن اس کی بے چارگی پر فیروز کا دل نہ پسیجا۔ وہ اس کے رونے پر بے اختیار ہنس دیا۔

"تم ازلی بے رحم ہو۔ میں جانتی ہوں" آنسو اب بھی اس کی حسین آنکھوں سے بہہ رہے تھے "میرا قصور کیا ہے فیروز ذرا انسانیت کے جامے میں آکر سوچو۔ کس قصور کی پاداش میں مجھے سزا دینا چاہتے ہو۔ یہی نا کہ میں تمہارے مکروہ ارادے سے باخبر ہو کر تمہارے چنگل سے بھاگ نکلی۔ میرے دامن کی طہارت کو تمہارے سیٹھ کے وحشی ہاتھ چھو نہ سکے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ تمہاری چال میرا دامن ملوث نہ کر سکی"۔

"اب کہاں بچ کے جاؤ گی"۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا...... ناہید کانپ گئی۔ فیروز سے کسی ہمدردی یا رحم کی توقع فضول تھی۔ وہ انسان کے روپ میں شیطان تھا۔ وہ عصمتوں کا قاتل تھا۔ وہ پاک جوانیوں کا دشمن تھا۔

"دیکھو ناہید میں تمہیں مخلص مشورہ دیتا ہوں" وہ صوفے کے قریب آکر بولا۔

"نواب کو اگر پتہ چل گیا۔ کہ تم طوائف کی بیٹی ہو۔ اور تم نے دھوکہ دے کر اس سے شادی کر لی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ تمہیں ذلیل کر کے نکال دے گا اس کا بلند مرتبہ اس کا جاہ و جلال اک طوائف زادی کو کبھی قبول نہ کرے گا۔ اس سے پیشتر ہی میرے ہمراہ بھاگ چلو۔ یہ زیورات لے کر............" لیکن اس کی بات ختم کرنے سے پہلے ہی ناہید تڑپ کر بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تم اپنی حیثیت سے بہت بڑھ رہے ہو"۔

"اپنی حیثیت بھی نہ بھولو ناہید۔ تم رنڈی زادی ہو۔ رنڈی کا دلال ہونا اتنا برا نہیں جتنا رنڈی کی اولاد ہونا" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

"تم مجسم شیطان ہو" وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ اس کا پاکیزہ خون کھول رہا تھا۔ فیروز کے ذلیل مشورے نے اس کی نیک سیرت پر کند چھری چلائی تھی۔ "دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم انسان نہیں حیوان ہو شیطان ہو"۔

"تمہاری تقدیر اسی شیطان کی مٹھی میں ہے۔ میں چاہوں تو ابھی تمہارا یہ طلسمی خواب ٹوٹ جائے عشق کا سارا نشہ ہرن ہو جائے وقت ہے چاہتی ہو تو تقدیر بنا لو۔ اپنی ماں کی زندگی کی مثال لو۔ اس کی تقدیر کو بھی اسی خاکسار نے سنوارا تھا"۔

"سنوارا تھا یا ایک شریف اور مظلوم عورت کو خباثت کے ڈھیر تلے دفن کر دیا تھا"۔

"شریف عورت" فیروز تلخی سے ہنسا "تمہارا خیال ابھی تک نہیں بدلا"۔

"خیال ہوتا تو بدل بھی جاتا۔ یہ اک حقیقت تھی کہ میری ماں کو تم نے طوائف بنایا اس نے تم سے پناہ مانگی۔ رو رو کر تمہیں یقین دلانا چاہا کہ وہ ایک شوہر کی بیاہتا بیوی ہے لیکن تم............"

فیروز نے اک خوف ناک قہقہہ لگایا۔

"یہ کہانی زرینہ نے تمہاری ذہنی تسکین کے لئے گھڑی تھی۔ ورنہ نہ اس کی کوئی شادی ہوئی تھی۔ نہ تم کسی باپ کی جائز اولاد ہو۔ وہ مجھے اکثر رو رو کر یہ کہانی سنایا کرتی تھی...... کہا کرتی تھی۔ وہ بہت بڑا نواب زادہ تھا۔ فیروز ہم نے چپکے چپکے شادی کر لی تھی۔ لیکن وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میری ماں کو پتہ چلا کہ میرے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ تو اس نے طوفان مچا دیا میں نے لاکھ یقین دلایا کہ میں نے شادی کی ہے لیکن کون سنتا تھا۔ مجھے ایک بدمعاش کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا............" فیروز اس کی ماں کی سرگذشت بڑے طنزیہ انداز میں کہے جا رہا تھا۔ اور ناہید سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"میری ماں نے مرتے وقت بھی یہی بات کہی تھی۔ مجھے اس کے الفاظ کی صداقت پر یقین ہے" ناہید بڑے جوش سے بولی ۔ "میرا باپ"۔

فیروز اک مکروہ ہنسی ہنسا۔

"باپ............ نہ تمہاری ماں ثابت کر سکی نہ تم" ....

"یہ انگوٹھی میرے باپ نے میری ماں کو دی تھی۔ ماں نے مرنے سے پہلے قسم کھا کر کہا تھا" لیکن اپنی دلیل کی کمزوری پر وہ خود ہی سر جھکا کر رہ گئی۔ انگوٹھی کوئی نکاح نامہ تو تھا نہیں۔ یہ ماں کی عصمت کی قیمت بھی تو ہو

سکتی تھی۔ ایک بار پھر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ماں کی باتیں جن کی وہ بڑے عزم سے مثال دے رہی تھی۔ بے حقیقت معلوم ہونے لگیں۔ ماں نے اپنی اخلاقی لغزش کو چھپانے کیلئے یہ قصہ تراشا ہو گا ناہید کا دل اس امر کو کوس رہا تھا جو اسے جنم دینے کا موجب بنا تھا۔ اس کا دل اس عورت کو لعن طعن کر رہا تھا جس نے اک ناجائز بچی کو پالنے میں اتنی محنت کی تھی۔ کاش ناجائز بچی کو موت آ گئی ہوتی۔ وہ روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"پھر کیا سوچا ہے افشاء کر دوں سارا راز نواب صاحب کے سامنے۔" فیروز اس کی بے چینی سے لطف لے رہا تھا۔ "ان کو بھی انگوٹھی دکھا کر ثابت کر دینا۔ کہ تمہاری ماں کی شادی ہوئی تھی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "پگلی۔ یہ ہیرے کی انگوٹھی دے کر اس نواب زادے نے جال پھینکا تھا۔ تمہاری ماں پھنس گئی اس جال میں۔ چھوڑو یہ باتیں ہاں تو ناہید اگر تم اس راز کا اخفا چاہتی ہو۔ تو تمہیں اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔" فیروز اب معاملے کی بات کر رہا تھا۔ ناہید عالم خیال سے حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔ فیروز اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وہ سرخ زرتار ساڑھی اور یاقوتی سٹ پہنے نرم نرم صوفے پر منصور کے ذاتی ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اور سامنے میزوں پر چائے کا سامان پڑا تھا۔ اس کے دل سے اک ہوک اٹھی۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"منظور ہے۔ ادا کرو گی قیمت۔" فیروز اپنی کامیابی پر پھولا نہ سما رہا تھا۔ "جلدی کرو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ جواب دو..... منظور ہے۔"

"منظور ہے۔" وہ جیسے خواب میں بول رہی تھی۔ ہولناک تباہی اتنی قریب تھی کہ ڈر کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ آبلے پڑ رہے تھے۔ اور وہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

"پہلی قسط کل لینے آؤں گا زیور چیک یا نقد جیسے مناسب سمجھو۔ کم از کم پانچ ہزار ابھی لوں گا۔ جب جب ضرورت پڑے گی وصول کرتا رہوں گا۔"

فیروز جانے کیا بک رہا تھا۔ ناہید کا دماغ بڑی تیزی سے منصوبے بنانے میں مصروف تھا۔ "خودکشی۔" یہ آخری حیلہ تھا۔ درد کا آخری مداوا تھا۔

ناہید نے فیصلہ کر لیا۔

"کل اسی وقت اسی حلیے میں آؤں گا۔ اگر وعدہ خلافی کی تو یاد رکھنا خطرناک انجام ہو گا۔ وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ ناہید اٹھ کر کمرے میں پاگلوں کی طرح ٹہلنے لگی۔ نیچے لان میں چائے پی جا چکی تھی۔ ایک درخت کے نیچے سبز رنگ کے صوفے پر منصور اک تمکنت سے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کے دوست انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ ناہید کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

"منصور میں تمہارے بغیر مر بھی نہیں سکتی۔ میں کیا کروں منصور۔"

وہ بے دم سی کرسی پر گر گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خودکشی...... اس کے دماغ سے یہی لفظ ٹکرا رہا تھا۔

فیروز پردہ اٹھا کر باہر نکلا تو زلفی دروازے پر کھڑے تھے۔ اس نے جھک کر انہیں سلام کیا۔ اور جانے کے لئے قدم اٹھائے۔

"ٹھہرو۔" زلفی نے تحکمانہ کہا۔ فیروز پلٹ کر رک گیا۔ زلفی بڑی متانت سے قدم اٹھا کر اس کے قریب آئے۔ ان کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اور آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔

"میرا نام ذوالفقار علی خاں ہے۔" وہ بڑے اطمینان سے بولے۔ "شاید یہ نام تم نے کبھی پہلے بھی سنا ہو۔"

فیروز کا کالا رنگ ایک دم گہرا ہو گیا۔ اور اس نے سہم کر زلفی کو دیکھا۔

"ادھر آؤ۔"

زلفی پلٹے۔ فیروز گھبرایا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ طویل برآمدے طے کرتے ہوئے کئی گیلریوں سے گزر کر زلفی اپنی خواب گاہ میں پہنچے۔ فیروز نے ڈر کر انہیں دیکھا۔

"ہچکچا کیوں رہے ہو۔ اندر آؤ۔" ان کے لبوں میں خوف ناک کڑک تھی۔

زلفی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اور جب کوئی گھنٹہ بھر بعد فیروز نے دروازہ کھولا۔ تو زلفی پستول کی نالی اس کی چھاتی پر رکھ کر کہہ رہے تھے۔

"کبھی ادھر کا رخ کیا۔ تو یہ پستول دیکھ لو۔"

فیروز گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے کمرے سے نکلا اور جدھر سے آیا تھا۔ ادھر ہی چلا گیا!

............O............

۲۱

آسمان پر پورا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

ہلکی ہلکی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ اونچے اونچے درخت اور نازک نازک پودے خوشگوار سی سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ چاندنی میں چمن کی سوئی ہوئی فضا بڑی رومان پرور تھی۔ خوبصورت پھول بوٹوں سے آراستہ چمن میں ایک مرمریں چبوترے پر چمکیلا سفید قالین پڑا تھا۔ نرم نرم گاؤ تکئے رکھے تھے۔ اور ان تکیوں کے سہارے سنہری حاشئے والا سفید ریشمی گاؤن پہنے منصور بیٹھے تھے۔ ان کے زانو پر سر رکھے ناہید لیٹی تھی۔ اس کی عنبریں زلفیں فضا کو معطر کر رہی تھیں۔ ملن رات تھی۔ اور دلوں کی طویل حکایتیں سنائی جا رہی تھیں۔

منصور ناہید کو کوئی پرانا قصہ سنا رہے تھے۔ اور ناہید کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

وقت گزر رہا تھا۔ چاند چمک رہا تھا۔ اور چاندنی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ منصور کو اپنے فضول سے خیال پر پشیمانی ہو رہی تھی۔ فضول سا خیال جو ان کے دماغ میں ناہید کی یک لخت طبیعت خراب ہو جانے کے بارے میں آیا تھا۔

اور ناہید بظاہر تبسم کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ لیکن اس کا دماغ الجھا ہوا تھا۔ رات کھانے پر زلفی چچا نے کچھ عجیب طرح اس کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے یقین دلایا تھا۔

"فیروز اب کبھی ادھر نہیں آئے گا۔" اور پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "میں نے اسے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دے دیا ہے۔"

بات دراصل یوں ہوئی تھی۔ یاسمین کو پتہ چلا کہ ناہید کا کوئی خاندانی ملازم آیا تھا۔ تو انہوں نے اس سے کہا۔ "کچھ دے دلا دیا ہوتا اسے' بے چارہ آس لے کر آیا ہو گا۔ مجھے تو پتہ ہی نہ چلا۔" ناہید کی تو روح تک لرز اٹھی تھی۔ ہاں زلفی نے کچھ عجیب طرح اس کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے یقین دلایا تھا۔ "فیروز اب کبھی ادھر نہیں آئے گا۔ میں نے اسے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دے دیا ہے۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سب زلفی کی بات پر ہنس دیئے تھے۔

اور اب بھی وہ اسی بات پر غور کر رہی تھی۔ منصور کے زانو پر سر رکھے زلفی کی بات سے کوئی واضح مفہوم نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ناہید" منصور اس کے بالوں کی لٹ سلجھاتے ہوئے بولے۔

"جی۔" اس نے شیریں لہجہ میں جواب دیا۔

"وعدہ یاد ہے۔" وہ اب بھی اس کے گھونگھریالے بالوں میں بڑی محبت سے انگلیاں پھیر رہے تھے......

وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی "یاد ہے......"

"تو سناؤ پھر۔" منصور اس پر جھکے ہوئے تھے۔ "کوئی ایسا نغمہ کہ جھوم جائے شباب تیرا......"

ناہید نے اک توبہ شکن انگڑائی لی۔ اس کا قیامت خیز بدن اک قہرمانی تناؤ کے بعد ڈھیلا پڑ گیا۔ منصور کے بازوؤں کے سہارے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آج اس نے بڑا ہی جذبات انگیز لباس پہنا تھا۔ سفید چمکیلے لمبے گاؤن کی باریک ریشمی ڈوریاں اس کے برہنہ مرمریں شانوں پر بڑی خوبصورتی سے بندھی تھیں۔ اس کا مہین جالی کا دوپٹہ سائے کی طرح اس کے بالوں اور پشت پر پڑا تھا۔ ہیروں کا ایک بیش قیمت سیٹ پہن رکھا تھا۔ سڈول کلائیوں پر خوبصورت جڑاؤ چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ گلے میں نفیس لاکٹ تھا۔ اور کانوں میں ہیرے کی سفید بالیاں آج اس نے جی بھر کر سنگار کیا تھا۔ بالوں کو کسی انوکھی وضع سے سنوارا تھا۔ اور اس انوکھے سنگار اور اچھوتے لباس میں وہ نظر فریب تخلیق معلوم ہو رہی تھی۔ جس کی شرابِ جوانی کا ساغر چھلک رہا تھا۔

یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔

آج فیروز کے چلے جانے کے بعد وہ خودکشی کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ منصور کی قربت میں یہ آخری رات وہ جی بھر کے منانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس رات کے ایک ایک لمحے سے وہ دادِ عشرت وصول کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی۔ اور منصور کی آغوش میں سپردگی کے انداز میں سمائی ہوئی تھی۔ یہ ملن کی آخری اور مختصر رات تھی۔ اور دل کی حکایتیں بڑی طویل تھیں۔

ناہید اک ادائے دلربانہ سے اٹھی۔ منصور نے پیچھے پڑی ہوئی ستار لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ستار پر جھکی ہوئی وہ کسی شاعر کا رومانی تخیل معلوم ہو رہی تھی۔ منصور مسحور سے اس کے جمال کی تجلیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کا رواں رواں اک کیف زا مسرت سے سرشار تھا۔ گاؤ تکیئے پر دونوں کہنیاں ٹکائے اپنے ہاتھوں پر چہرہ تھامے وہ اسے بڑی محویت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر اس کے رخِ روشن پر تھی۔ اور روح سمٹ کر سماعت بن گئی تھی۔

ناہید گا رہی تھی۔ نغمہ ہوا کی لہروں پر تھرتھرا رہا تھا۔ اس کی سوز بھری آواز ساکن رات کے سینے میں

ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ ستار کے تاروں سے درد بھرے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ گانا کیا تھا۔ اک فریاد تھی۔ اس کی دکھی روح کی پکار تھی۔ اس کے ارمانوں کی چیخ تھی۔ وہ گا رہی تھی۔ گا رہی تھی۔ نغمہ نوحہ بنتا جا رہا تھا۔ ناہید حسرت و آلام کا مرقعہ بنی ستار پر جھکی ہوئی تھی۔ دلسوز نغمہ اس کے لبوں پر پھڑپھڑا رہا تھا۔

اس نے عشق کے داؤ پر جان کی بازی لگائی تھی۔ اور آج وہ جیتی ہوئی بازی ہار دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ زلفی سے رونمائی کے بعد وہ خائف تھی ضرور۔ زلفی سے پھر رحم کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن آج فیروز نے آ کر تو اسے جہنمی آگ کی لپیٹ میں دے دیا تھا۔ مصلحت چپ چاپ مر جانے ہی میں تھی۔ اور اسی کا وہ عزم کر چکی تھی۔

مجسم فریاد بنی وہ ستار بجاتے ہوئے دلدوز گیت گا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بجھتی جا رہی تھی۔ زندگی کی جوت آخری لمحوں پر تھی۔ اس کے دل کا درد بڑھتا جا رہا تھا سینے میں مد و جذر کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ ذہن جل رہا تھا۔ آبلے پڑ رہے تھے۔ چھالے پھوٹ رہے تھے۔

یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی......اور

رات گزر رہی تھی۔

اس کی گھنی پلکوں کو اک قیامت خیز جنبش ہوئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر منصور کو دیکھا۔ وہ تکیئے پر بازوؤں کے حلقے میں سر رکھے آنکھیں بند کئے نیم دراز تھے۔ وقت گزر رہا تھا اور منصور کی صحبت کی گھڑیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وقت کے قدموں میں لپٹ جائے۔ اس کی رفتار کو روک لے۔ ان حسین لمحات کو ابدی بنا دے۔ اس صبح کو جو ان کی ابدی جدائی کی پیامبر ہو گی کبھی طلوع نہ ہونے دے۔ لیکن وقت کو روک لینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تقدیر کی گرہیں کچھ اس قدر پیچیدہ تھیں کہ اس کے کمزور ہاتھوں میں انہیں کھولنے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔

ناہید کا دل اس بری طرح اچھلا کہ تاروں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی مخروطی انگلیاں رک گئیں۔ ساز اک جھناکے سے خاموش ہو گیا۔ منصور نے سر اٹھایا اسے خمار آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس؟"

ناہید نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اپنی تڑپ کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے بولی۔

"میں سمجھی آپ سو گئے۔"

"سو تو نہیں کھو ضرور گیا تھا۔" یہ اس کے نغمے کی کھلی داد تھی۔ منصور واقعی کھو گئے تھے۔ مایوس موسیقی اور مغموم ترنم نے انہیں مضمحل سا کر دیا تھا۔ ناہید کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے جلو میں آنسوؤں کی دھندلاہٹیں تھیں۔

"کیسا رہا نغمہ۔" وہ ستار کے تاروں کو یونہی چھیڑتے ہوئے بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"مان گئے سرکار مان گئے۔" منصور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھے۔ ان کا دل ابھی تک متاثر تھا۔

"ٹھنڈ کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔ چلئے اندر چلیں۔" انہوں نے تکیے پر پڑا ہوا شنیل کا سفید خوبصورت سا شال اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اک ہلکے سے جھٹکے سے بالوں کی بیقرار لٹوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے وہ اٹھی تھوڑی دیر بعد وہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔

زینے کے قریب پہنچ کر منصور رک گئے۔ زینے کا بالائی حصہ روشن تھا۔ آخری چکر پر ایک عورت کا خوبصورت مجسمہ ایستادہ تھا۔ جس کی آنکھوں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر زینے کے سرخ قالینوں پر پڑ رہی تھی۔ سنہری ریلنگ چمک رہی تھی۔

"ناہید یاد ہے یہ جگہ۔" منصور بڑی عقیدت سے زینے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

ناہید کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ مایوس حسرتوں کا مقابلہ کرتے کرتے وہ ہار گئی تھی۔

"اس جگہ......اس جگہ......" وہ ہکلائی۔

"ہماری محبت نے جنم لیا تھا۔" منصور نے اس کی ہنستے ہوئے بات پوری کر دی۔ "میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں۔ وہ عجیب و غریب ملاقات یاد آ جاتی ہے۔ وہ چند لمحے غیر فانی نقش چھوڑ گئے۔"

"میں مر جاؤں تو مجھے یہیں دفن کر دیجئے گا۔" وہ بڑی سوگوار آواز میں بولی۔

منصور کو وہ رات یاد آ گئی۔ جب یاسمین نے اسے ان سے متعارف کرانے کے لئے روک لیا تھا۔ اس دن بھی اس نے اک مایوس سا نغمہ سنایا تھا۔ اور رات تک اتنی بے چین رہی تھی کہ بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ منصور نے اسے ہنسانے کے لئے کہا۔

"کوئی ایسی وصیت کیجئے ملکۂ عالم جو بندہ پوری کر سکے۔"

منصور زینے پر تھے۔ اور ناہید ریلنگ کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"یہی ہے میری وصیت۔" اس نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"میں کوئی آپ کی لاش دفن تھوڑا ہی کروں گا۔ حنوط کروا کے اپنے کمرے میں رکھوں گا۔ سمجھیں۔" انہوں نے پیار سے اسے گھورا۔

معاً ناہید کو یاد آ گیا۔ کہ وہ آج رات جی بھر کے ہنس ہنس کے منانے کا تہیہ کر چکی ہے۔ زندگی کی آخری رات۔ گھٹی ہوئی آرزوؤں اور دم توڑتے ہوئے ارمانوں کی آخری رات۔ منصور کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے خوبصورت دانت چمک اٹھے۔

"اگر میں واقعی مر گئی...... تو" اس نے ہنس کر منصور سے پوچھا۔

"بندہ رو دھو کر اپنی بدقسمتی پر شاکر ہو رہے گا۔" منصور نے شوخی سے کہا۔

"بس۔" وہ ہنسی۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"اچھا ابھی پاگل ہو جاؤں گا۔ اس سے بھی زیادہ چاہتی ہیں۔ تو اسی زینے سے کود کر ہلاک ہو جاؤں گا۔" انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا۔ کہ ناہید کو ہنسنا ہی پڑا۔

منصور اس کی طرف بڑھے اس کے گلابی گال پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے بولے۔

"آئندہ ایسی باتیں منہ سے نکالیں تو بس یاد رکھیئے گا۔"

دونوں ہنس دیئے۔

خواب گاہ کے باہر ان کی طرف منہ پھیرے خاندانی معزز نوکر محی الدین کھڑا تھا۔ ناہید منصور کی گرفت سے نکل کر اندر چلی گئی۔

"کون ہے۔" منصور نے پوچھا۔

"میں ہوں سرکار۔" محی الدین نے ان کی طرف منہ کر لیا۔

"تم یہاں۔ اس طرف۔" منصور حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"سرکار۔" منصور نے حیرت سے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ کے نام خط ہے۔ بڑے سرکار دے گئے ہیں۔"

"کون۔ زلفی چچا۔"

"جی سرکار۔"

منصور نے حیرانگی سے لفافہ دیکھا۔ بھاری نیلے لفافے پر صرف ناہید لکھا تھا۔

"کب دیا تھا۔" منصور نے پوچھا۔

"کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہو گا سرکار۔" وہ بولا۔ "جانے سے پہلے دے گئے تھے۔"

"جانے سے پہلے۔" منصور کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ "جی سرکار۔"

"کہاں گئے۔"

"کچھ بتایا نہیں تھا۔ بار بار یہی تاکید کرتے تھے کہ خط صبح بیگم صاحبہ کو دے دینا۔"

"تم نے ان کے حکم کی تعمیل کی ہے۔" منصور مسکرا کر بولے۔ وہ کچھ گھبرا گیا۔

"نہیں سرکار۔" وہ ادب سے بولا۔ "بات یہ ہے سرکار کہ وہ کچھ پریشان سے تھے۔ بڑے پریشان تھے۔ ان کی آنکھیں پتہ نہیں کیسے نظر آ رہی تھیں سرکار۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو محی الدین۔" منصور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے آج تک انہیں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا۔ بار بار یہی کہتے تھے۔ صبح خط دینا۔ کوئی بات ضرور ہے سرکار۔ غلام نے انہیں اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا آخر میری بھی اتنی عمریں گذری ہے۔ کوئی بات ہے۔" وہ بار بار ہاتھوں کو مل رہا تھا۔ "جاتے وقت مجھ سے ہاتھ ملا کر گئے ہیں۔ یہ ساری عمر میں پہلا اتفاق ہے حضور۔" محی الدین کی بوڑھی آنکھوں میں جانے کیوں آنسو آ گئے۔

"جاؤ۔" منصور بولے۔ اور لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اندر چلے گئے۔

ناہید چاندنی کی زد میں کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ بتی جانے خود نہ جلائی تھی...... یا جلانے کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ شاندار چھپر کھٹ کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ جو دھیمے دھیمے اندھیرے میں اسے مدفن کی طرح نظر آ رہی تھی۔ "کل کیا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ "اس چھپر کھٹ پر میری لاش ہوگی۔ اور منصور۔" وہ ان کی حالت کا تصور بھی کرتے ہوئے گھبرائی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ منصور نے دور سے اسے دیکھا۔

تیزی سے اس کے قریب آتے ہوئے بولے۔

"پھر خراب ہو گئی طبیعت۔"

ناہید نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ "نہیں تو۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"آپ کے نام خط ہے۔" منصور نے ناہید کے ہاتھ میں لفافہ دے دیا۔

"میرے نام۔" وہ تعجب سے لفافے کو دیکھنے لگی۔

"زلفی چچا آپ کے نام خط دے گئے ہیں۔" کہتے ہوئے منصور نے بٹن دبایا۔ کمرہ تیز برقی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے منصور نے خط نہیں اس کے ہاتھ میں بم پکڑا دیا ہو۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ منصور اسے سہارا دے کر روشنی کی طرف لے آئے۔

"یہاں بیٹھ کر پڑھیے۔" انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ ناہید کا دماغ سن ہوتا رہا تھا۔ اس کی رگوں میں جیسے چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ لفافہ منصور کے سامنے کھولتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

منصور نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔

"پڑھئے نا۔" وہ لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے بولے۔

ناہید نے اک گھبرائی ہوئی نگاہ منصور پر ڈالی۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑے باغ کی اونگھتی ہوئی فضا کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس نے اپنے منتشر حواس کو بڑی مشکل سے یکجا کیا۔ اور بڑی ہمت کر کے لفافہ چاک کیا۔

نیلے رنگ کے کاغذ پر اس کی نظریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ شدید طور پر کانپ رہے تھے۔ اور اس کے چہرے کا رنگ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ گلے میں پڑا

ہوا لاکٹ دل کے تیز دھڑکنے پر بری طرح لرز رہا تھا۔

چیخ کی آواز پر منصور نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ ناہید صوفے کے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔ منصور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹے۔

"ناہید۔" انہوں نے گھبرا کر اس کے ننگے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔

وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ نیلے رنگ کا لفافہ قریب میز پر پڑا تھا۔ اور خط اس کی مٹھی میں بھنچا تھا۔

منصور بے حد گھبرا گئے۔

ناہید کو بڑی آہستگی سے ہاتھوں پر اٹھایا۔ اور چھپر کھٹ پر لٹا دیا۔ بلوریں صراحی سے اس میں پانی ڈال کر وہ اس کے منہ پر چھینٹے دینے لگے۔ نیلے رنگ کا خط ابھی تک اس کی مٹھی میں تھا۔ منصور کی سمجھ سے معاملہ بالاتر تھا۔ وہ جلدی سے جلدی ناہید کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں جھپکائیں۔ اور پھر کھول دیں۔

"ناہید۔" منصور کی آواز میں محبت کی لرزش تھی۔

وہ کچھ دیر یونہی پڑی رہی۔ منصور رومال سے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو پونچھتے رہے۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ دبائے۔ دوسرے لمحے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"کچھ تو کہئے ناہید......" منصور نے گھبرائی ہوئی بے چین آواز میں کہا۔ وہ اس کے پہلو میں چھپر کھٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور لمبے سفید سنہری حاشئے والے گاؤن میں کوئی یونانی دیوتا دکھائی دے رہے تھے۔

ناہید نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذوں پر نظر ڈالی۔ وہ اٹھی۔ کاغذ منصور کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ اس کی ہچکیاں بلند ہونے لگیں۔ اس نے بے تاب ہو کر منصور کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

جوں جوں منصور خط پڑھ رہے تھے۔ ان کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ چہرے کا رنگ پہلے فق ہوا اور اس کے بعد ضرورت سے زیادہ سرخ ہو گیا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور بڑے بے تاب نظر آ رہے تھے۔ خط ختم کر کے انہوں نے ناہید کو دیکھا۔ جو سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پھر انہوں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے والے تھے۔

"روتی کیوں ہیں ناہید۔" انہوں نے اسے تھپتھپایا۔ لیکن ان کی آواز بھرا گئی۔ اور ان کی آنکھوں کے گلابی ڈورے سرخ ہو گئے۔ وہ اٹھ کر بے تابانہ ٹہلنے لگے۔

"اسی وقت جانا چاہیے۔ کہیں زلفی چچا......" وہ جانے کیوں رک گئے۔ شاید وہ کوئی منحوس بات منہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے نکالنا نہ چاہتے تھے۔
"اٹھئے۔ جلدی سے لباس تبدیل کیجئے۔" وہ اس کے سڈول بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے الجھے الجھے
سے بولے۔ "میں بھی تیار ہوتا ہوں۔ دیر نہیں کرنی چاہئے۔"
ناہید نے آنکھیں پونچھ لیں۔ لیکن آنسو اب بھی اسی طرح بہہ رہے تھے۔ منصور کے سہارے وہ چھپر
کھٹ سے اتری۔ اور اپنے ڈریسنگ روم کی طرف چل دی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی خاص ملازمہ اس کا لباس تبدیل
کروا رہی تھی۔

منصور کپڑے بدل کر آ گئے تھے۔ وہ نیوی بلو سوٹ میں ملبوس تھے۔ ناہید ابھی تک ڈریسنگ روم سے باہر
نہ آئی تھی۔ وہ چھپر کھٹ پر پڑے ہوئے خط کو اٹھا کر پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

عزیز روح

میرے طرز تخاطب پر شاید تمہیں حیرت ہو۔ لیکن جس بڑی حقیقت کا میں انکشاف کرنے والا ہوں۔ وہ
جان لینے کے بعد تمہیں تمہاری حیرت کا جواب مل جائے گا۔
کچھ اور لکھنے سے پہلے فیروز کے بارے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ اب کبھی تمہاری متاہل زندگی میں
خار بن کر نہ کھٹکے گا۔ وہ وسوسہ بن کر تمہاری حیات کا خون چوس لینے کے لئے آیا تھا۔ یہ وسوسہ ہمیشہ کے لئے
دل سے نکال دو۔ وہ اب کبھی بھی نہیں آئے گا۔ رات میں نے تمہیں کھانے پر یہی یقین دلایا تھا۔ لیکن تمہاری
آنکھوں سے عدم اعتمادی چھلک رہی تھی۔ اور تم ضرورت سے کچھ زیادہ گھبرا رہی تھیں۔
ناہید۔ آج وہ بدبخت انسان تم سے مخاطب ہے۔ جس نے شادی کی۔ اور ایک بچی کا باپ بھی بنا۔ لیکن
جسے ازدواجی زندگی کی تین راتوں کے معاوضے میں زندگی بھر کی جلن دے دی گئی۔ اور جو اتنا بھی نہ جانتا تھا۔ کہ
اس کے ہوتے ہوئے بھی ایک بچی لاوارث اور ناجائز قرار دی جا رہی ہے۔
اس دن رونمائی کے وقت جب یاسمین نے تمہارا گھونگھٹ الٹا تو جیسے میری گذشتہ زندگی کے چہرے سے
نقاب ہٹا دیا۔ یک لخت میرا ذہن آج سے بیس برس پہلے کی دیکھی ہوئی دھندلی دھندلی تصویر کی جانب گھوم گیا۔
ہار میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر تمہارے ہاتھوں پر گر گیا۔ تمہاری انگلی میں وہی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ جو میں
نے شبِ زفاف زرینہ کی انگلی میں اپنی محبت کی یادگار کے طور پر پہنائی تھی۔ لیکن حالات نے اس طرح پلٹے
کھائے کہ محبت کی معصوم یادگار کو عصمت کی قیمت سے تعبیر کیا جانے لگا۔
بیس برس پہلے میں برکلے ہوسٹل کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ بی اے کا آخری سال تھا۔ موٹی سی فلسفہ کی
کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ یہ کھڑکی عمارت کے پچھلی طرف ایک چوڑی گلی میں کھلتی تھی۔ ٹھوکر لگنے سے ایک
پندرہ سالہ حسین لڑکی گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے گر کر ریشمی کپڑے پھیل گئے۔ جانے کیوں میں کود کر گلی میں

اتر آیا۔ اور کپڑے سمیٹنے لگا۔ یوں میری ملاقات زرینہ سے ہوئی۔ پہلی نظر میں محبت کا قائل نہیں تھا۔ لیکن
زرینہ کو دیکھ کر میرا برسوں کا نظریہ باطل ہو گیا۔

زرینہ ایک متوسط الحال خاندان کی لڑکی تھی۔ لیکن سوتیلی ماں کے ناجائز دباؤ اور اس کے ناروا سلوک سے
وہ اپنی گھریلو زندگی سے مطمئن نہ تھی۔ وہ اپنے ماحول سے باغی نظر آتی تھی۔ تم اپنے سارے زیورات اتار دو۔
ان جھلملاتے ہوئے ملبوسات کی جگہ سادہ سے کپڑے پہن کر آئینے میں جھانکو۔ تمہیں آج سے بیس برس پہلے کی
زرینہ نظر آئے گی۔ تمہاری شکل و شباہت کس قدر اپنی ماں سے مشابہت رکھتی ہے۔ تمہیں دیکھنے کے بعد دو دن
تک میں انہیں خیالات میں الجھا رہا۔ میری پریشانی کا اندازہ شاید تم کبھی بھی نہ کر سکو۔

زرینہ کے والدین کسی تقریب کے سلسلہ میں دوسرے شہر گئے زرینہ دو تین چھوٹے بہن بھائیوں کے
ساتھ اکیلی تھی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر ہم نے اپنی محبت کی بقا کے لئے چپکے چپکے شادی کر لی۔

نکاح کے وقت میرے تین دوست اور ایک مولوی صاحب تھے۔ جنہیں میرے ایک دوست جانے
کہاں سے لائے تھے۔ منصور کے دوست غزالی کے والد میرے عزیز دوست اور میری اس شادی کے عینی شاہد
تھے۔

تین دن کے بعد اس کے والدین آ گئے۔ اور میں زرینہ کو اک سہانے اور خوش گوار مستقبل کی امید دلا
کر اس سے جدا ہو گیا۔ کالج بند ہوا۔ تو میں گھر آیا۔ زرینہ مسرور تھی کہ شادی ہو جانے سے وہ سوتیلی ماں کی
دست برد سے باہر ہو گئی ہے۔ اور میں خوش تھا کہ شادی کر کے ہم دینی اور دنیاوی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک
دوسرے کے ہو گئے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی یہ بندھن نہ توڑ سکے گی۔

میں شاداں و خرماں گھر آیا۔ والدین کے سامنے اپنی شادی کا ذکر کیا گیا' والدین کا وقار اور نسلی تفاخر
سبھی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں رویا۔ چیخا۔ چلایا لیکن میرے منہ میں ظاہری آن اور جھوٹی عزت ٹھونس دی
گئی۔ یہ بات اندر ہی اندر دبائی گئی کیوں کہ اس سے ایک بہت بڑے خاندان کی عزت کو بٹہ لگنے کا امکان تھا۔
میرے احتجاج کے باوجود میرا بڑا خاندان اک عام خاندان کی معمولی لڑکی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ جاہ و
جلال کی ہتک تھی۔ یہ آن بان کی توہین تھی۔

میری فریاد پر کسی کا دل نہ پسیجا۔ میری اس قدر کڑی نگرانی کی گئی کہ میں بے بال و پر پرندے کی طرح
تڑپ کر رہ گیا۔ مجھے تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ اور اتنی مہلت بھی نہ دی گئی کہ میں زرینہ کو لمحہ بھر کے
لئے دیکھ بھی سکتا۔

دل کی آگ سلگتی رہی۔ اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اگلے سال واپس آ کر زرینہ کو ساتھ لے جاؤں گا۔
ماں باپ سر پٹکتے رہیں۔ خاندان تلملاتا رہے۔ ہم دونوں جائز طور پر میاں بیوی تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر سکتی تھی۔

سال بھر بعد میں واپس آیا۔ تو ہنگامہ سو چکا تھا۔ مجھ پر عائد کی ہوئی تمام پابندیاں ہٹالی گئی تھیں۔ دوسرے ہی دن میں دل میں تمناؤں کا ہجوم لئے زرینہ کے پاس گیا۔ لیکن...... وہاں زرینہ کہاں تھی۔ میری حسرتوں کے جنازے اٹھ چکے تھے۔ میری امیدوں کے مزاروں پر جلنے والے چراغ تک بجھ چکے تھے۔ زرینہ چیخ و پکار کے باوجود کسی کو اپنی شادی کا یقین نہ دلا سکی تھی۔ اسے اس کی سوتیلی ماں نے ایک بد معاش کے ہاتھ سونپ دیا۔ اسے بیچ ڈالا۔ اس کی فریاد پر اس پر پھٹکار برسی۔ اس کے آنسوؤں کو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ لعن طعن کرنے والے سبھی تھے۔ زرینہ میرے لئے گیا وقت تھی جو ہاتھ نہ آسکے۔

وہ دنیا کی نظروں میں کنواری تھی۔ اور ایک کنواری لڑکی کا حاملہ ہونا نا قابل معافی جرم تھا۔ کسی نے اس کے بیان کی تصدیق نہ کی۔ اسے جہنم میں دھکیل دیا گیا۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اسے ایک بد معاش کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ چند دن مجھ پر مجنونانہ سی کیفیت طاری رہی۔ مجھے کھوکھلی تسلیاں دی گئیں۔ میرے زخموں کا علاج ایک حسین صورت اور عالی خاندان کی لڑکی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میں سب کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر انگلینڈ چلا گیا۔ مجھے اس سرزمین سے نفرت ہو گئی...... جہاں دو معصوم دلوں کو خاندانی آن پر قربان کیا گیا تھا۔ جہاں نا کردہ گناہوں کی کردہ گناہوں سے زیادہ سزا دی جاتی تھی۔ اور اگر منصور اور یاسمین کی کشش میرا دامن نہ کھینچتی تو شاید میں اس جگہ ایک بار بھی لوٹ کر نہ آتا۔

وقت گذرتا گیا۔ اور میں نے اپنے زخموں کے منہ پر پھاہا رکھ دیا۔ زندگی کی تمام تلخیوں کو قہقہوں میں ڈبو دیا۔ لیکن دن کو ہنسنے ہنسانے والا زلفی رات کی تاریکیوں میں تکیوں میں منہ چھپا چھپا کر روتا رہا۔

بیس برس گذر گئے۔ مجھے زرینہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس دن رونمائی کے وقت تمہیں دیکھ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ تمہارے ہاتھ میں میری انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اور تمہارے چہرے پر زرینہ کا پرتو۔ دو دن میں نے جس اضطراب میں کاٹے وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ ذہنی الجھاؤ نے مجھے خوف ناک حد تک پریشان رکھا۔ کبھی سوچتا تھا۔ کہ تم میری ہی اولاد ہو۔ اور کبھی خیال آتا۔ زرینہ کی شادی کر دی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے تمہارا باپ کوئی اور ہی ہو۔ یہ کوئی معمولی چرکا نہ تھا۔ میرے دل کے گھاؤ گہرے ہو گئے۔ زخموں کے منہ پھر سے کھل گئے۔ اور ان سے جو لہو ٹپکا وہ میری زندگی کا نچوڑ تھا۔

آج چائے پر میں تم سے سارے حالات تفصیل سے پوچھنے کا تہیہ کر کے تمہارے پیچھے ہی چمن سے اٹھ کر آ گیا۔ تم مجھے دیکھ کر اس قدر گھبرا گئیں کہ میں پریشان ہو گیا۔ اس وقت تمہاری گھبراہٹ میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ لیکن اب میں تمہارے احساسات کو جانتا ہوں۔

الفاظ میرے منہ ہی میں تھے کہ ملازم نے تمہارے خاندانی نوکر کے آنے کی اطلاع دی۔ فیروز کے

نام پر تمہاری حالت اس قدر غیر ہو گئی کہ میں معاملے کی عجیب و غریب نوعیت سے پوری طرح نہ سہی کسی حد تک سہی، آگاہ ضرور ہو گیا۔ اور جب فیروز کمرے میں آیا تو تم اس قدر سہم گئیں کہ مجھے خدشہ پیدا ہو گیا۔ تم کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤ۔ تمہیں باتیں کرنے کا موقعہ دے کر میں باہر نکل گیا۔

میں نے اس دن دانستہ طور پر اخلاقی جرم کیا۔ اور تم دونوں کی باتیں دروازے کے قریب کھڑے ہو کر سنیں۔

یقین مانو ناہید۔ اگر زرینہ میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیتی تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا فیروز کی زبانی یہ سن کر ہوا کہ زرینہ طوائف بن گئی تھی۔ حالات نے اسے یہ ذلیل پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک مرد کے وعدۂ فردا پر نسوانیت کا پیرہن جھیر جھیر کر دیا گیا تھا۔ اک معصوم اور بھولی بھالی لڑکی میری کوتاہی سے جہنمی شعلوں کی لپیٹ میں آکر جھلس گئی۔ کاش میں اس وقت ماں باپ کے دباؤ میں آکر انگلینڈ نہ جاتا۔ زرینہ ایک عورت تھی۔ حالات کی چکی میں پس کر رہ گئی۔ لیکن آفرین ہے اس کی ہمت پر۔ اتنے مخدوش حالات میں بھی اس نے میری دی ہوئی امانت کو جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اسے اس آگ کی تپش نہ لگنے دی جس آگ میں وہ دن رات جل رہی تھی۔

فیروز سے میں نے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ زرینہ نے تمہیں اپنے ماحول سے الگ رکھ کر پالا پوسا۔ تمہاری تربیت تمہارے شان شایاں کی۔ اور جب فیروز جیسے خونی بھیڑیئے نے تمہاری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ تو وہ سینہ سپر ہو کر سامنے آ گئی۔ تمہیں بچانے کے لئے اس نے جان کی بازی لگا دی۔ خود مر گئی۔ لیکن اپنی نظروں کے سامنے تمہیں اس رسوا اور ذلیل ماحول میں آنے نہ دیا۔ اس کے مرنے کے بعد معتمد آیا تمہاری پاکیزگی کو محفوظ نہ دیکھ کر تمہیں لے کر بھاگ نکلی۔

ٹرین کے حادثہ میں زخمی ہو کر تم سلطان پور پہنچیں۔ منصور کے پاس ملازمت کر لی۔ یہ سارے حالات مجھے یاسمین نے سنائے تھے۔ اس وقت میں نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن آج...... کاش میں اپنا سینہ چیر کر تمہیں بتلا سکتا۔

تمہاری باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے اپنے حالات سے منصور کو باخبر نہیں کیا۔ اپنی ماں کی طوائفیت کو ان کے سامنے عریاں کرتے ہوئے تمہارے بلند کردار اور غیور طبیعت کو ٹھیس لگتی تھی۔ اسی لئے تم نے شادی سے انکار بھی کر دیا تھا۔ لیکن منصور کی بیماری کے بعد تم مجبور ہو گئیں۔ کہنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکیں۔ جہاں تک میرا اپنا خیال ہے۔ تمہارا ڈر بے بنیاد تھا۔ منصور جیسے عالی حوصلہ انسان تمہیں قبول کر چکے تھے۔ یہ بات ان کی بے مثال محبت پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھی۔

فیروز نے باتوں ہی باتوں میں تمہاری معصومیت سے فائدہ اٹھا کر معلوم کر لیا کہ تم نے منصور کو اپنے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

حالات سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ بڑا بدطینت انسان ہے۔ تمہارے اس کے ہاتھوں بچ نکلنے سے جو اسے نقصان پہنچ چکا تھا' اب وہ اس کی تلافی کروانا چاہتا تھا۔ وہ تم سے اس راز کے اخفاء کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کرنے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن اب اس کی طرف سے تم مطمئن رہو۔ وہ کبھی نہیں آسکتا۔ تمہارے کمرے سے باہر آنے کے بعد میں نے گھنٹہ بھر اسے اپنے کمرے میں رکھا۔ اور پھر وہ ڈرتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ تمہاری ماں کے الفاظ کو وہ ہمیشہ جھوٹ سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ لیکن میرا نام سننے کے بعد اور میرے اعتراف حقیقت پر وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ کبھی اب تمہارے پاس آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

فیروز کے جانے کے بعد جانتی ہو۔ میرے دل میں کیا خواہش مچلی تھی۔ جی چاہا تھا کہ دوڑ کر تمہیں سینے سے چمٹا لوں۔ اتنا روؤں اتنا روؤں کہ برسوں کی سینے میں جلتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ غائبانہ نفرت...... تم نے فیروز کو کہا تھا۔ "اس مرد کا میرے سامنے نام نہ لو جس نے میری شریف ماں کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا اور جو میری تباہی کا موجب بن رہا ہے۔"

تم مجھے خطاوار سمجھنے میں حق بجانب ہو۔ میری ہی وجہ سے تمہاری ماں نے قعر ذلت میں سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ میری ہی وجہ سے تم نے ایک لمحہ چین کا نہ گذارا۔ میری ہی وجہ سے تم تمام عمر اک تذبذب میں گرفتار رہیں۔ اف...... میں تمہارا اور تمہاری ماں دونوں کا گناہ گار ہوں۔ شکر ہے۔ کہ تم اپنے صحیح مقام پر پہنچ گئی ہو۔ ایک بدنصیب باپ کے لئے یہی بات باعث تسکین ہے۔ خدا کرے۔ تم منصور کے ساتھ زندگی کی بہاریں لوٹو...... رحمت کے سائے ہمیشہ تمہیں اپنے دامنوں میں پناہ دیں۔

میں عجلت میں سب کچھ لکھ رہا ہوں۔ میرے سینے میں مدوجزر کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ میرے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے ہیں۔ میں نے زرینہ کے بعد کسی عورت کی طرف ایک مرد کی طرح نگاہ تک نہ اٹھائی تھی۔ یہ میں نے اپنی دانست میں اپنے آپ کو سزا دی تھی۔ لیکن شاید یہ سزا کافی نہ تھی۔ اس سے بھیانک سزا قدرت نے میرے لئے تجویز کر رکھی تھی۔ یہ سزا مجھے آج ملی ہے۔ ایک باپ کے لئے اس کی اپنی اولاد کا تنفر...... یہ کتنی بڑی سزا ہے۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔

میں دولت آباد جا رہا ہوں۔ چند ضروری امور کے سلسلہ میں سیکرٹری کو ملنا نہ ہوتا تو یہ کھیل آج یہیں ختم ہو جاتا۔ میں اپنی ساری جاگیر' محل اور دیگر اشیاء تمہارے نام پر چھوڑ رہا ہوں۔ گو یہ دولت ان مصائب اور تکالیف کا ازالہ تو نہیں کر سکتی جو میری ذات کی وجہ سے تمہیں پہنچے۔ پھر بھی اس سے مجھے تسکین ہو گی۔ صبح جب تمہیں یہ خط ملے گا۔ ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ آ چکا ہو گا...... مجھے اس بات کا دکھ نہیں......

ناہید اس بدقسمت انسان کو کبھی کبھی دعائے خیر سے یاد کر لیا کرنا۔ جو باپ ہوتے ہوئے بھی تمہیں بیٹی نہ کہہ سکا۔ جو تمہاری پیشانی پر ایک بار بھی شفقت آمیز بوسہ نہ دے سکا۔ جو تمہیں سینے سے لگا کر اپنے دکھوں کا

مداوا نہ کر سکا۔ اور جس سے تم نے شاید ہمیشہ نفرت کی......

تمہارا گناہ گار باپ

ذوالفقار علی خان

منصور نے خط تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اور بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ملازمہ کے سہارے ناہید آ گئی۔ منصور چہرے پر بشاشت پیدا کرتے ہوئے اس کی طرف آئے۔ ملازمہ ادب سے سمٹ کر باہر جانے لگی۔

"شگوفہ" منصور نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جی سرکار۔" وہ کچھ جھک کر بولی۔

"باجی سے صبح کہہ دینا۔ ہم دولت آباد جا رہے ہیں۔ ان سے کہنا گھبرائیں نہیں فرصت میں دولت آباد پہنچ جائیں۔"

"بہت بہتر۔" کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ منصور نے بازو بڑھایا۔ ناہید ان کے سہارے باہر آ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ کچھ آنسوؤں سے اور کچھ اندرونی کیفیت سے گلابی ہو رہا تھا۔ گہرے سبز شنیل کے خوب صورت لباس میں اس کا پیارا سا چہرہ بڑا پر کشش نظر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شاندار رولس رائس دولت آباد جانے والی سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ چاند مسکرا رہا تھا۔ رات بے حد حسین تھی۔ منصور کا بازو ناہید کی کمر کے گرد حائل تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ سٹیرنگ تھامے تھے۔ وہ اس وقت آج کے عجیب و غریب انکشاف کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ناہید سے ملاقات۔ اپنی لازوال محبت۔ ناہید کا انکار۔ اور پھر خود ہی چلے آنا۔ شادی۔ اس کے بعد ضمیر کی چبھن۔ ناہید کی طبیعت کا بار بار خراب ہونا۔ سب ان کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

اور

ناہید ان کے شانے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے خیالات ابھی تک الجھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اب کی حالت اس کھلاڑی کی سی تھی۔ جسے زندگی کی دوڑ میں اس مشکل سے جیت نصیب ہوئی ہو کہ اسے اپنی فتح کی خوشی منانے کا بھی ہوش نہ رہا ہو۔

"ناہید" منصور نے اپنے گال اس کی عنبریں زلفوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"جی" وہ بڑی آہستگی سے بولی

"آپ نے سب کچھ پہلے کیوں نہ بتا دیا۔ کیا مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔" انہوں نے محبت آمیز گلہ کیا۔

"اعتماد" ناہید کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے نم آلود آنکھوں سے منصور کو دیکھ کر کہا "اس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وقت تو اعتماد مجھے اپنے آپ پر بھی نہیں تھا“

”اور اب؟“ منصور نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اب؟“ اس نے سر اٹھایا۔ اور منصور کو دیکھ کر اس ظالم ادا سے مسکرائی کہ منصور کو سٹیرنگ پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا ناہید کا سر زندگی میں پہلی بار اک شان تفاخر سے اٹھا ہوا تھا۔ منصور کے بازو کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ اور ناہید کی روح کیف مسرت سے جھوم اٹھی۔

”آج اگر وہ خود کشی کر لیتی تو۔ اس خیال سے ہی اسے خوف آ گیا۔

منصور تیزی سے کار چلا رہے تھے۔ ناہید ان کے پہلو میں مسکرا رہی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی محبت ادھوری تھی۔ عشق خام تھا۔ اور آج کے انکشاف سے یہ ادھوری محبت مکمل ہو گئی ہے۔ ان کے عشق میں پختگی آ گئی ہے۔

موٹر تیزی گھر کی طرف بھاگ رہی تھی۔

دو رویہ اونچے اونچے درختوں سے گھری قصر فردوس کی چوڑی سڑک طے کر کے گاڑی پورٹیکو میں رکی۔ بر آمدے کی سیڑھیوں پر ارغوانی قالین تیز برقی روشنی میں چمک رہا تھا۔ منصور اترے ناہید کے جذبات میں ایک طوفانی ہلچل تھی۔ وہ منصور کے بازو کے سہارے جیسے خواب میں چل رہی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

دونوں خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ زولفی روشن تھی۔ ان کے کمرے میں سے ان سیکرٹری نکل کر دوسری طرف جا رہا تھا پردہ ابھی تک لرز رہا تھا۔ ناہید کے دل کی تیز دھڑکن منصور محسوس کر رہے تھے۔

ہاتھ بڑھا کر منصور نے پردہ ہٹایا۔ زلفی کی شاندار خواب گاہ کی ہر چیز تیز روشنی میں چمک رہی تھی میز کے اوپر جھکے وہ تیزی سے کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے پریشان بال پیشانی پر پڑے تھے۔ اور ان کے چہرے پر اک وحشت ناک ویرانی تھی۔

آہٹ پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ناہید اور منصور دروازے سے اندر آ رہے تھے۔ زلفی کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ حیرت سے یا مسرت سے۔ یہ وہی سمجھتے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ناہید منصور کے بازوؤں سے اس طرح نکلی جس طرح تیر کمان سے۔

”ابا۔“ زندگی میں پہلی بار اس نے اس لفظ کی چاشنی کو محسوس کیا۔ وہ زلفی کی چھاتی لگ کر بار بار یہی پیارا اور میٹھا لفظ دہرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے اور زلفی کے آنسو اس کے آنسوؤں میں مدغم ہو رہے تھے۔

اور بیس برس کی جلتی ہوئی آگ ان آنسوؤں سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ منصور قریب کھڑے اس حسین ملاپ کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے تھے۔ ...... ○

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر